TEXT PROBLEM WITHIN THE BOOK ONLY



جو(۱۹۱۰ء)
اکتوبر سنہ ۵ء

تمدن

عاشرتی تمدنی ادبی فلسفی اخلا ... نی اور علمی مضامین کا

مخزن
ایڈیٹر ایم اے قاری (علیگ) ، خلف اکبر جناب قاری
محمد سرفراز حسین صاحب علیگ عزمی دہلوی ... استان

فہرست مضامین

پبلشر محمد عارف حسن قاری مطبع قیصریہ پریس دہلی میں چھپا پرنٹر سید علی قادری
مقام اشاعت دہلی

تمدن

میرے بعد

دنیا کی خوشی میں، سعادت و رفا[illegible] نہیں ہوگا، مگر اندوہ و غم میں کمی ہوگی۔ ایک غم آگین دل، ایک مخ[illegible] اُٹھ جائے گا، مغالت و رذالت[illegible] تنعم و تعیش کی جنگ و[illegible] سفیل کے لیے کڑھنے والا ایک دل غائب ہو جائے گا۔

میرے دوست احمد جو میرے پسینہ کی جگہ اپنا خون بہانے کے لیے طیار ہیں، جنکے ادعائے دوستی کی کوئی انتہا نہیں، جنکے اظہار لطف کے احسان سے میری گردن دبی جاتی ہے، جنکے تبسم مدام، جنکے تلطیف ناقابل التیام سے میری زندگی تلخ ہو رہی ہے، یہ میرے دوست احمد باہر رو دیں گے اور گھر میں جا کر قہقہہ ماریں گے۔

میرا دشمن محمود، میرا کھرا دشمن محمود جسنے کبھی میرے پیچھے سے آکر مجھپر

ختم نہیں ہوتا بلکہ دہن مبارک داڑھی کی بندش سے تکلم میں آہستگی اور نادر آہنگی اختیار کرتا ہے۔ یہ سب بیچاری بیوی برداشت کرتی ہے اور سب سے بڑا ظلم یہ سہتی ہے کہ ہنسی کو ضبط کرتی ہے۔ ابھی تک اسکی عمر ایسی عجیب اور بے جوڑ باتوں پر ہنسنے کی باقی ہے! مگر شوہر کا بڑھاپا اسے نیست و نابود کرنے کے لیے کمربستہ ہے اگرچہ تسلیم بھی کیا جائے کہ ایسے خاوند سے ایسی بیوی کو محبت ہونی ممکن ہے تو سوال یہ ہے کہ خضاب کے دن اسے اُن کی کیا ادا بھائے۔ حقہ کی مُہنال خضاب بستہ لبوں میں خوبصورت معلوم ہو؟ اے بدنصیب عورت تو رو اور اپنی قسمت کو پتھر سے پھوڑ۔ ٹھہر جا ابھی تو چند گھنٹہ بعد خضاب کی تمہیں امر مد بالوں کے بالکل سیاہ ہو جانے کی داد بھی دینی پڑے گی۔ اگر داد نہ دی تو "بڑے میاں" کی بہت دلشکنی ہوگی اور وہ سمجھ لینگے کہ بیوی کو مجھ سے محبت نہیں ہے۔ اُن کے نزدیک محبت کا معیار اوّلین اُنکی مقدس ڈاڑھی ہی ہے!)

(۲) ایک نہ ایک چھوٹا موٹا مرض دامنگیر رہتا ہے۔ (دور نہ جایئے۔ صرف اسیقدر تصور کیجیے کہ ایک شب کو آدھی رات کے بعد ایک پنشن آلود پچپن سالہ کریہہ آواز برابر کے پلنگ سے ایک مطیع شباب اور متوالی نیند میں سوتی ہوئی بیوی کے کان میں پہنچتی ہے۔ اور وہ آواز یہ ہے "بیگم - میری ڈاڑھ میں درد ہو۔ ہائے!" جن مقدس ہاتھوں نے اس دلکش آواز کے ساتھ اس سوتی ہوئی جوانی کو جھنجھوڑا ہے اُسکی رگوں میں کچھ برف کا اثر ہے اور سونے والی کو گرمی محسوس نہیں ہوتی۔

ہرحال کئی آوازوں اور کئی جھنجھوڑوں (کئی دفعہ جھنجھوڑنے کے بدلے یہ لفظ تصنیف کیا گیا ہے۔ معاف فرمایئے) کے بعد وہ بیچاری آنکھیں ملتی ہوئی انگڑائیاں لیتی ہوئی اُٹھی۔ ہائے یہ دونوں ادائیں بہت کچھ مستحق قدر اور

مستحق استقبال خاص تھیں مگر شوہر کو اُنکے دیکھنے کی نہ اہلیت نہ فرصت۔ انھوں نے فرمایا بھی تو یہ فرمایا "ہیں۔ اُٹھتی نہیں")

(۳) ایک آدھ عادت نہایت دلچسپ پڑی ہوی ہوتی ہے (مثلاً ہمارے معزز "بڑے میاں" ہیں سوتے میں چوکیداروں کو مات کرنے والے خراٹے لینے۔ اور جاگتے میں اکثر ٹھوڑی کے نیچے کھجاتے رہنے کے علاوہ۔ قبض کی وجہ سے یہ عادت پڑ گئی ہے کہ بیچارے صبح کو پاخانہ جانے سے پہلے کوئی دس منٹ تک اُکڑوں بیٹھ کر حقہ پیتے ہیں۔ اگر بیوی کو ہینڈ کیمرا رکھنے اور اُسکے استعمال کرنے کی اجازت ہوتی تو مع خضاب کی تصویروں کے "بڑے میاں" کا ایک باتصویر ایڈیشن شائع ہو سکتا۔ "بڑے میاں" کا دل ضرور چاہتا ہوگا کہ میری یہ ادا بھی بیوی کو پسند آئے اور اُسکی محبت میں اضافہ ہو مگر ع

ایں خیالست و محالست و جنوں۔

(۴) دل مردہ ہونے کے بعد متانت کا زور ہو جاتا ہے نشست برخاست بات چیت اور میل جول میں جوانی کی سادی اور دلکش لچک کے بدلے سختی اور لوہا پن آجاتا ہے جو ریاضی یا سائنس کے طالبعلم کو تو غالباً فائدہ پہنچا سکے مگر جو ایک پُر از شباب بیوی کے دل کو گرویدہ کرنے میں کماحقہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔

(۵) کفایت کا خیال بڑھ جاتا ہے۔ (فی نفسہ یہ کوئی بُرا خیال نہیں ہے) مگر بڑھاپے میں جو کفایت سوجھتی ہے وہ زیادہ تر جوانی کی فضول خرچیوں کی ندامت اور نقصانات کی وجہ سے سوجھتی ہے۔ اگر یہ صاحب تنہا ہوتے۔ یا کسی بڑھیا کا ساتھ ہوتا تو یہ کفایت شعاری کچھ بُری نہ معلوم ہوتی۔ مگر اسکا مقابلہ کیا جاتا ہے جوان بیوی کی (بزعم خود) فضول خرچیوں سے اور یہ

بات بالکل نظرانداز کردیجاتی ہے کہ ہم بھی نوجوانی میں زیادہ اُٹھاتے تھے۔ یہ نہیں ہے کہ "بڑے میاں" کو بڑے خرچ اب بھی نہ سوجھتے ہوں۔ مگر اب اُنکے اخراجات کا رخ بدلگیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے کہ کئی دن سے مستری کا ناطقہ بند کر رکھا ہے اور پکا سرداوا نہوں نے اور قبر کے ارد گرد تھوڑی بہت پھول پھلواری لگانے کے تخمینے اور نقشے تیار ہورہے ہیں۔ بیوی کا دل ضرور چاہتا ہوگا کہ یہ روپیہ بہرے کسی زیور میں خرچ ہوتا۔ مگر اُسکو یاد رکھنا چاہیے کہ اُسکی شادی ایک ضعیف العمر شخص سے کیا ہوی ہے کہ ملک الموت سے رشتۂ قریبہ قائم ہوگیا ہے اور قبرستان بھی سسرال ہی کے ایک حصّے کا نام ہے۔

(۶) اور لیجیے وصیت نامہ لکھا جارہا ہے۔ اسقدر رحم مین شریفیں بھیجا جائیگا فلاں مکان یا دوکان کے کرایہ میں سے جاڑے میں محلہ کی مسجد میں اِیندھن بھروا جائیگا۔ وغیرہ وغیرہ۔ وصیت نامہ بہت اچھی چیز ہے۔ مگر دن رات یہ باتیں ایک جوان بیوی کے سامنے ہوتی ہیں اور وہ خاموشی اور صبر کے ساتھ سُنتی ہے۔ اُسکے حصّے میں کسیقدر رکم آتا ہے جسکی وجہ غالبًا یہ ہے کہ "بڑے میاں" کے دل کی تہ میں یہ بات چھپی ہوی ہے کہ میرے بعد اسکے میکے والے ضرور اسکی شادی کرادیں گے۔

(۷) اب بیوی کے لیے ایک آخری مرحلہ رہگیا ہے اور وہ مرحلہ وہ ہے جس کی بسم اللہ "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن" سے ہوتی ہے۔ اب یہ رنگین کپڑوں کے بدلے رنڈسالہ پہنے گی اور چوڑی مہندی مسی سرمہ سب کو سلام کرے گی۔ کیونکہ اُس کی شادی ایک بڈھے سے ہوی تھی۔

افسوس۔ صدافسوس۔

"نسائی"

حُسن

دنیا کے وسیع گلشن میں یوں تو ہزاروں رنگ کے پھول کھلے ہوئے ہیں مگر حسن مثل ایک ایسے گلاب کے پھول کے ہے جسکی خوشبو سے تمام گلشن مہک رہا ہے اسکے رنگ میں کچھ ایسی دلاویزی ہے کہ دیکھنے والوں کی نگاہوں پر محویت کا عالم طاری ہوجاتا ہے اسکی خداداد کشش سر جھکا کر چلنے والوں کے دلوں میں بھی ایسی چٹکی لے لیتی ہے کہ وہ بھی نگاہ اُٹھانے پر مجبور ہوجاتے ہیں اور اگر وہ اپنی پوری قوت سے کام لیتے ہیں تو آنکھ کے کسی گوشہ میں نگاہیں خود اسکی طرف لپک جاتی ہیں اور اس سے ہم آغوشی کا لطف حاصل کیے بغیر قرار نہیں لیتیں۔

اسکی پنکھڑیاں بہت ہی نرم و نازک اور لطافت میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ اسکے دیکھنے سے کبھی سیری ممکن نہیں اسکی بہاریں ایسی دلفریب ادائیں مضمر ہیں جن کے اثر سے انسان کا دل بے قابو اور دماغ متحیر ہوجاتا ہے۔ اسکی نزاکت اور نرمی ہر سنگ دل کو موم بنا دیتی ہے۔ زاہد صد سالہ کے تجربے خاک میں ملادیتی ہے۔ دم گلگشت جب نگاہ اُٹھتی ہے تو اسی کی طرف جب آنکھ پھرتی ہے تو اسی کی جانب حسن ایک ایسا پوڈر ہے جسے ہزاروں عیب پوشیدہ رہتے ہیں کوئی کیسا ہی بُرا چہرہ یا باطن ہو لیکن اُسکی سفید نقاب آنکھوں پر پردے ڈالدیتی ہے۔ حُسن ایسا نفیس لباس ہے جسکی زیبائش نگاہوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔

حُسن میں یہ بھی ایک خداداد اثر کہنا چاہیے کہ اسکے اظہار کے الفاظ بھی ثقل سے دور اور لطافت سے بھرے ہوئے ہیں مثلاً انگلش میں۔ (بیوٹی) جو حُسن کے مترادف ہے کتنا خوبصورت لفظ ہے اگر اسکے اقسام پر نظر کیجائے تو بہت ہوں لیکن ان سب

اقسام میں سے دو صورتیں ضرور قابل نوٹ ہیں جنمیں سے ایک کو حُسن ظاہری اور دوسرے کو حُسن باطنی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اور ان دونوں قسموں کا وجود ہر ایسی خوبصورت شے میں ضرور پایا جائے گا جسکو دیکھکر ہم خوبصورت یا حسین کہہ سکتے ہیں۔

پہلے تو بحالت مجموعی تمام دنیا کی خوبصورتی[1] لیجیے کہ اسمیں زیادہ تر حصے بہت حسین اور منیو سواد واقع ہوئے ہیں اسلیے ہم اسکو بھی حسین ہی کہیں گے گو صرف ایک غم کے اعتبار سے تو یہ نہایت کریہ منظر کہی جا سکتی ہے مگر پھر بھی اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اسمیں حسن باطنی نہیں ہے لیکن حُسن ظاہر سے شاید کسی کو بھی اختلاف ہو۔ کیونکہ خود حُسن بھی اس دنیا کے اچھے اشیاء میں سے ایک شے ہے۔ جسکے وجود کا اظہار مختلف شکلوں طرح طرح کی صورتوں سے ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اسمیں کوئی شک نہیں کہ جس چیز میں اسکا کم و بیش حصہ شامل نہیں ہوتا وہ دنیا کے خاص اسٹیج پر کوئی اچھا پارٹ حاصل نہیں کر سکتی۔ اور جس چیز میں اسکا زیادہ حصّہ شامل ہوتا ہے وہ مقبول عام اور ہر دلعزیز ہی ہو کر رہتی ہے۔ (دنیا) ظرفیت کے اعتبار سے بھی خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ زمین گو بظاہر کوئی بہت خوبصورت نہیں مگر اپنے فوائد اور زرخیزی کے اعتبار سے بہت حسین کہے جانے کی مستحق ہے آسمان اتنی بزرگی رکھنے پر بھی تمام دنیا کے پورے سطح پر کتنا مزیب اور پیمائش نظر سے کسقدر ٹھیک دکھائی دیتا ہے۔ اسکے ماورا۔ چاند۔ سورج۔ ستارے کہکشاں برق و سحاب اور الوان مختلفہ کے اعتبار سے تو حُسن کا ایک بڑا موقع کہا جا سکتا ہے

دنیا کے بحری حصّے کے حُسن تمام برّی حصّوں کی خوبصورتیوں سے بالکل یک جداگانہ انداز رکھتے ہیں۔

بحری حصّوں کے حُسن کی دلفریبیاں اور اسکے تمام تر انداز واقعی برّی حصّوںکے

[1] خوبصورتی سے میری مراد حُسن اور حُسن سے مراد خوبصورتی ہوگی۔

حُسن سے بالکل ہی علیحدہ اور متغائر صورتیں رکھتے ہیں۔

گویا یہاں بھی حسن کی دو علیحدہ شکلیں پیدا ہوتی ہیں جنمیں سے ایک بحری حصص کے لیے خاص ہے اور دوسرے بڑی حصّوں کے واسطے۔ جب ہمارا بندرگاہوں یا جزیروں میں گزر ہوتا ہے تو سمندر کے کنارے اور دریاؤں کے دھارے ہمکو اپنے حُسن سے ایسا محو کرلیتے ہیں۔ کہ ہم خشکی کے حصّوں کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ اور جب پُر بہار میدانوں اور دلفریب صحراؤں کے سبزہ زاروں میں ہمارا گذر ہوتا ہے تو ہمکو بحری حصوں کا خیال باقی نہیں رہتا۔

خشکی کے حصے میں جو اقلیمیں واقع ہیں ان میں سے ہر اقلیم کا ایک انداز جدا گانہ ہے ہر ہر اقلیم کی خوبصورتی علیحدہ ہر حصّے کا حُسن ایک خاص ادا رکھتا ہے۔ اب ہم کو یہ دکھانا رہا کہ اقلیموں کی خوبصورتی کیا ہے۔ ہر اقلیم کے واسطے شہروں کی وسعت سرحدوں کا ٹھیک موقع پر وارد ہونا ہر سرحد پر مضبوط قلعوں مستحکم فصیلوں کا پایا جانا حدود اربعہ پر رسدوں اور جنگیوں کا انتظام راستوں کا خطروں اور رہزنوں سے پاک ہونا اسکا حُسن خاص ہے۔

منزلوں اور بندرگاہوں کا پاک وصاف اور ان میں ہر شئے کا مہیا ہونا پانی اور غلے وغیرہ کا اہتمام اسٹیشنوں اور کارواں سراؤں کی سجاوٹ حسب محل و موقع کارگزاروں کا متدین اور خلیق ہونا۔ زمین کا زرخیز اور رعایا کا مطیع و فرمانبردار ہونا باعث امن و آسایش ہوتا ہے اور بڑے بڑے شہروں میں درحقیقت ان ہی باتوں سے خوبصورتی پیدا ہوتی ہے اسکے علاوہ سڑکوں کا مضبوط و صاف بازاروں کا وسیع و آراستہ ہونا نفیس اور راحت رساں سواریوں کا ہر وقت موجود رہنا انکا حُسن ہے۔ عمارت کا بلند اور اسٹیشنوں اور بندرگاہوں کا بڑا ہونا شہروں کی زیبائش کا سبب ہوتا ہے۔ بڑے بڑے ملکوں وسیع شہروں میں بحالت مجموعی ان ہی چیزوں سے

دلآویزی پیدا ہوتی ہے اور ان کا عین حسن یہی ہے۔

بادشاہوں اور فرمانرواؤں کا حُسن ظاہری چہرے پر وجاہت اور جبروت کے آثار ہوں آنکھیں بڑی اور رعب دار ہوں رخساروں میں جلالت نگاہوں میں مروت و اخلاق کے ساتھ ایک خاص قسم کی قوت اور کشش ہو۔جس سے دوسرے شخص کو آنکھ ملانے کی تاب نہو سکے۔خوبصورتی کے ساتھ تن و مند ہو۔ اور حسن باطنی یا حسن ذاتی میں ان اوصاف کی ضرورت ہے۔

عادل ہو شجاع ہو۔رعایا پروری اور سیاست مدنی بدرجہ اتم ہو۔سخی ہو۔ بلا تعصب ہو اور کسی ایک مذہب کا پابند ہو۔رحیم اور بردبار ہو۔صاحب اقبال ہو۔ وزرا کا حُسن دانائی اور زود فہمی ہے۔مشورے میں کبھی عقل خطا نہ کرے۔ اُنسے زیادہ بادشاہوں کا کوئی مطیع ہو سجائے خود بادشاہوں اور جب بادشاہوں کے سامنے جائیں۔تو اُنسے زیادہ مطیع اور فرمانبردار کوئی نہو۔رعایا کے راج سے ہمہ وقت باخبر ہوں۔روے زمین کے نقشے پیش نظر ہوں۔فرمانرواؤں کے حالات سے کسی وقت غافل نہ رہیں۔

سپہ سالار اور فوجی افسروں کے حُسن ظاہری کے لیے قوا کا قوی ہونا قدو قامت کا بلند ہونا آنکھوں کا بڑا اور پُر رعب ہونا سینہ کا چوڑا اور بازوؤں میں بلندی کے ساتھ خوبصورتی بہت ضروری چیز ہے۔چہرے پر شجاعت کے آثار اور ہیبت و اجلال کا پایا جانا بھی نہایت ضروری ہے۔اور حُسن باطنی میں نیک دلی رحم و مروت نازک مزاج۔حیادار۔اور نیک نفس کا ہونا واجبات سے ہے ایک بہادر سپاہی کا حُسن۔جہالت۔تنک مزاجی اور صاف دروئی ہے حسن ظاہری میں قد بالا۔مونچھیں بڑی ہاتھ معمول سے لانبے ہونا چاہئیں۔اور تلوار کا دھنی بلی ہونا۔

دیگر حکام اور پیشہ وروں کا حُسن ظاہری تو خیر کیسا ہی ہو لیکن حسن باطنی میں جفاکشی - بردباری - قناعت - مستقل مزاجی - خوش گفتاری شیریں زبانی - خوش اخلاقی - لاپروائی ضروری اوصاف ہیں -

علماء و فضلاء میں حُسن سیرت کا ہونا واجبات سے ہے - اور حُسن سیرت کے اوصاف زہد و تقوی - پرہیزگاری - قناعت - بے لوس و ریا - عبادت شب بیداری - خاکساری - طرز معاشرت اور تمدّن و اخلاق سے باخبری اور علاوہ وعظ و پند مذہبی کے ان باتوں کی اصلاح کا بھی شوق اور ان ضروری امور پر بھی بنظر اصلاح وعظ کرتے رہنا - اور کسی نئی بات کا بخوف ضرر اپنی معقول دلیلوں سے روکتے رہنا - اور بشرط استطاعت غرباء و مساکین سے بہ سلوک خود پیش آنا اور سعی و کوشش سے اُنکی حاجت براری کرتے رہنا بہت ضروری ہے - جیسا کہ عراق عرب و عجم کے اکثر شہروں میں پایا جاتا ہے -

حُسن ظاہری - بروت میں شارب کا لحاظ - ریش بقدر یکمشت و دو انگشت چہرے پر سباحت پیشانی پر گھٹا - آنکھوں میں حیا اور خوف خدا رخساروں پر ایک قسم کا نور جسم کی نقاہت سے اظہار اشتیاقِ وصلِ خدا -

طبقۂ شعرا حُسن ظاہری سے تو بالکل عاری ہوتا ہے کیا بہ لحاظ لباس اور کیا بہ لحاظ صورت - بہ لحاظ لباس تو اس وجہ سے کہ شاعری کی بالکل قدر نہیں اور قدر اس وجہ سے نہیں کہ دنیا کے کاروبار میں اسکو بالکل دخل نہیں - شاعر اپنی شاعری سے نہ کوئی پل بنا سکتا ہے نہ کوئی عمارت اُٹھا سکتا ہے - نہ ہوائی جہاز اور موٹر و سائکل کا جواب دے سکتا ہے - نہ انجن تیار کر سکتا ہے - نہ کوئی باجا ایجاد کر سکتا ہے - نہ کسی اخبار کے کالم بھر سکتا ہے - ہاں جھوٹ کے پُل جسقدر جی چاہے بنائے - ناوں کی ہوا جی کھول کر باندھے - اور اُن میں

خیالات کے ہوائی جہاز ہروقت اُڑایا کرے - اپنی فکر کی مشین کے زور سے ہر روز نئے نئے ایجاد اور اختراعات کیا کرے - تو پھر اس سے کیا - سوائے دماغ کو راحت دینے یا بےچین ہو جانے کے کسی کے جسم کو تو راحت نہیں پہنچا سکتا - اور اب دماغی راحت رساں بھی پیدا ہو گیا - جسکا نام - گراموفون ہے - شاعر اپنی شاعری سے کوئی سواری تو ایسی ایجاد نہیں کرتا جس پر بیٹھ کر لوگ ہوا کھائیں اپنی قدر و منزلت دکھائیں - سواری تو درکنار کسی کو اپنی پیٹھ پر لاد کر اگر تھوڑی دور پہنچا دے تب شاید کچھ مزدوری پا جائے -

اس شاعری میں عمر سادات بھی گئی (باقی آئندہ)

ششر مشہدی لکھنوی

بیگم

اس نام کا ایک ماہواری رسالہ حقوق نسواں کی حمایت لڑکیوں اور بچیوں کی تعلیم امورات خانہ داری کی وضاحت کے اغراض کو مدنظر رکھکر انشاء اللہ جنوری ۱۹۱۲ء سے انہیہ جناب قاری سرفراز حسین صاحب دہلوی (علیگ) سیاح جاپان و انگلستان کی ایڈیٹری میں لکھنؤ پل جھاؤ لال سے جاری کیا جائے گا حجم رسالہ - ۴۸ - صفحہ کاغذ و کتابت چھپائی مثل رسالہ "تمدن" کے ہو گی -

قیمت سالانہ عہ/ ۳۱ دسمبر تک جن صاحبان کے نام درج رجسٹر ہونگے اُن سے عمار اور "تمدن" کے خریداروں سے ہمیشہ کے لیے - عمار جملہ خط و کتابت و ترسیل مضامین بنام ایڈیٹرس صاحبہ رسالہ "بیگم" پل جھاؤ لال لکھنؤ ہونا چاہیے -

نازک امتحان

میرا خیال ہے کہ اللہ پاک نے مرد کو اس لیے بنایا ہے کہ وہ دنیا میں پیدا ہوکر اور بڑھ کر اپنی علمی زندگی اخلاقی طرز عمل علم مجلس واصول انسانیت میں کامل طور سے ترقی حاصل کرے اپنے قول فعل چال چلن ٹھیک رکھے اپنی حیثیت سے زیادہ اپنے آپ کو مشیخت میں نہ ڈالے کیونکہ مشیخت ہی انسان کو تباہ اور برباد کردیتی ہے آیندہ کے واسطے کچھ پس انداز ضرور کرے۔

(۱) کیونکہ اب جو اُسکے واسطے نئی زندگی شروع ہونے والی ہے اُس میں اُسکو کوئی دقت اور پریشانی نہ پیدا ہو۔

(۲) اگر وہ اپنے تئیں فضول خرچ بنائے گا تو بیوی بچوں کو تکلیف اُٹھانی پڑے گی۔

(۳) اگر وہ بدمزاج ہوگا تو بیوی آتے ہی اُسکے مزاج کی یہ حالت دیکھ کر بددل ہوجائے گی اور شروع شروع میں ڈرے گی بھی مگر جب یہ نئے دن نکلجائینگے اور دنیا کے آگے کے واقعات پیش آئیں گے تو اور دقتیں بڑھتی جائیں گی۔ اور یہانتک نوبت پہنچ جائے گی کہ بیوی بجائے رازدار ہونے کے ضروری واقعات بھی چھپانے لگے گی اور دلوں میں فرق پڑتے پڑتے بالکل دہراؤ کے خیالات رہنے لگیں گے۔ جو آیندہ اس گھر کو بجائے راحت وعیش کے نمونہ کے وبال بنادیں گے۔

(۴) اگر علم مجلس نہوا تو یار دوستوں میں قدر منزلت نہوگی اعلےٰ جلسوں سے چھپتے پھرینگے گھر میں کچھ روشنی تمیز وتہذیب کی نہوگی بال بچے بھی اُسی رنگ

ڈھنگ کے اُٹھیں گے بیوی بھی مردہ دل اور جیسی طبیعت کی ہو بالکل ویسی ہو جائیگی نہ اُسکا حوصلہ بڑھے گا نہ ہمت سو پھر یہ گھر کچھ روشن گھروں میں سے نہ ہوگا اسواسطے مرد کو زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے کہ وہ گھر کا سردار بیوی بچوں کا مددگار رہے اگر اسی میں کوئی کثر رہ گئی تو پھر یہ گھر جو ایک نعمت غیر مترقبہ اللہ پاک اسکو عطا کرنے والا ہے اُسکی صحیح بنیاد کیونکر پڑے گی اور وہ ٹھیک ٹھیک کیونکر چلیگا۔ عورت کو کیا کیا شکلیں پیش آنے والی ہیں:۔

عورت کو اللہ پاک نے تو اسلیے بنایا تھا کہ وہ مرد کے دل کا پھول آنکھوں کا سرور چین اور تفریح کا باعث ہو اگر اُسکو یہ منظور نہ ہوتا تو حضرت آدم کے پہلو میں سے حضرت حوا کو پیدا نہ کرتا کیا اُسکی قدرت میں اور طرح سے ہویدا کرنا کچھ مشکل نہیں تھا وہ جسطرح چاہتا پیدا کر سکتا تھا مگر اُس نے اس رحم دل پھول کو اسلیے اسطرح نہیں پیدا کیا کہ وہ دنیا میں جا کر گلِ خاردار ہو جائے گی اور اُسکے لیے دنیا میں ایسی ایسی تکلیفوں کا سامنا ہوگا جس سے مرد بالکل مبرا ہیں۔

جو لڑکی ہونے کے وقت کیسے کیسے نازوں سے پالی جائے کیا کیا ماں باپ اُسکے چاؤ چونچلے اُٹھائیں آج ہنڈکلیا پک رہی ہے کل گڑیا کا بیاہ ہے پرسوں چوتھی کا انتظام ہے ماں باپ ہیں کہ نہال ہیں کہ اتو ماشاء اللہ ہماری بچی قرآن شریف ختم کر چکی جہلم رسالہ پڑھ رہی ہے میٹھے چاول پکا لیتی ہے گڑیا کے کپڑے خاصے سینے لگی ہے اب چند روز میں گھر کا۔ تھوڑا بہت کام بھی سنبھال لے گی ماں کا ہاتھ بٹائے گی باپ کو پنکھا جھل کر کھانا کھلائے گی باپ کے آنے کے وقت جو کچھ تھوڑا بہت کام ہوگا وہ کرے گی جانے کے وقت چھتری لکڑی دیدیا کرے گی۔

اب گڑیوں کے کپڑے سیتے سیتے اپنے پاجامے سلنے لگے اور کرتے اماں کتر دیتی ہیں

بیٹی سی لیتی ہے انہوں نے کرتے میں بوٹیاں ڈالدیں اور بیٹی کو دیدیں کہ اس طرح تم بھی کاڑھو اب کڑھائی سلائی پڑھائی سب کو ترقی ہو رہی ہے اور خیر سے عمر بھی تیرہ چودہ برس کی ہو گئی ہے اب کہنے والوں نے جان کھانی شروع کردی ہے کہ لڑکی جوان ہو گئی شادی کرو ۔ باوا کے دل میں بھی اُلجھن سی ہونے لگی کہ لڑکی جوان ہو گئی شادی کردینی چاہیے ماں پر بھی گھر والوں اور دنیا کے تقاضے شروع ہو گئے اور اُنکو مجبور ہو کر شادی کی فکر پڑی رقعہ پرچے آنے شروع ہو گئے کپڑے لتے سلنے لگے ۔

اتفاق سے جس سے نصیب لڑا تھا وہ سب کی پسند آ گیا اور منہ میٹھا یا منگنی کی رسم ہو گئی بات پکی ہو جانے کے بعد حسب حیثیت تیاری شادی کی مستقل طور پر شروع ہو گئی اور ماں باپ بہت خوشی خوشی جو کچھ بڑی محنت اور مصیبت سے جمع کیا تھا اُس پیاری بیٹی کے دینے کے لیے تیار کر رہے ہیں اور اسی خیال میں لگے ہوے کہ خدا ہماری عزت آبرو رکھے اس نازوں کی پالی ہوئی بچی کے ہاتھ پیلے کرادے ۔ مگر اب تک یہ نہیں معلوم کہ یہ جو انجاں آدمیوں اور غیر گھر میں جا رہی ہے اسپر کیا گزرے گی اور وہ اس نئے گھر میں جسکو اُس کے لیے نئی دنیا کہنا ناموزوں نہوگا کیا کرے گی اور کیونکر اُن نئے آدمیوں میں رہے گی نہیں اسکی تو ابھی اُنکو پروا بھی نہیں ہے ابھی تو شادی ہونے کی خوشی اور دولھن بنا ہوا دیکھنے اور داماد آنے کا شوق دل میں بسا ہوا ہے نہ یہ خیال کہ داماد صاحب کا مزاج کیسا ہوگا نہ یہ معلوم کہ سمدھیانے والوں کا طرز عمل کیا ہوگا اور ہماری بچی کے کیسا برتاؤ کریں گے ۔ (باقی آیندہ)

ح ۔ ج ۔ بیگم

ضروری اعلان

اس رسالہ کے متعلق یہ ارادہ کیا گیا ہے کہ انشاء اللہ اسے مستقل محنت اور کوشش کے ساتھ بتدریج ترقی دی جاے۔ شروع کے پرچوں میں آب و تاب اور غیر معمولی دلکشی کے سامانوں سے ارادۃً پرہیز کیا گیا ہے۔ ورنہ بہت کچھ ممکن تھا۔ بتدریج انشاء اللہ تعالےٰ اسے نہ صرف ایک اعلےٰ درجہ کا علمی اور ادبی رسالہ بنانا مقصود ہے بلکہ اس سے چند اور ضروری علمی کام لینے ہیں مثلاً (۱) اُن حضرات کی قابل قدر تصنیف و تالیف کو اپنے خرچ سے چھپوانا اور شایع کرنا جو بعض مجبوریوں سے خود ایسا نہیں کرسکتے جن صاحبوں کو ہمسے یہ خدمت لینی منظور ہو وہ براہ نوازش ہم سے خط و کتابت کریں جو بصیغہ راز رکھی جائیگی

(۲) وقتاً فوقتاً انعامی مضامین لکھوانا اور ہونہار طالب علموں کو خاص طور پر اس علمی خدمت کیطرف متوجہ کرنا اور اُنسے مضمون لکھوا کر اُنکی مالی خدمت کرنا بعض اوقات انعامی مضامین ہم خود تجویز کرینگے مگر جو صاحب کسی خاص مفید مضمون پر قلم اُٹھانا چاہیں اور ہم سے [illegible] کے متوقع ہوں وہ براہ نوازش ہم سے خط کتابت کریں جو بصیغہ راز [illegible]

(۳) خریداران "تمدّن" کے لیے ایک سرکولیٹنگ لائبریری قائم کرنا [illegible] خرچ میں عمدہ عمدہ کتابیں اُن کی نظر سے گزر سکیں۔ السعی منی و الاتمام من اللہ

ایڈیٹر

تبادلہ

اسوقت تک ہم کو تبادلہ میں بہت کم رسالہ جات اور اخبارات وصول ہوے ہیں جسکے یہ معنی ہیں کہ ابھی تک ایڈیٹر صاحبان نے پرانے پتہ کی بجگہ نیا پتہ [illegible] پل جھاؤ لال لکھنؤ" اپنے تبادلہ کے رجسٹروں میں تحریر نہیں فرمایا۔ [illegible] تمام رسائل و اخبارات کو بھیج چکے ہیں جو ہمارے رجسٹر تبادلہ میں درج ہیں [illegible] بھیج رہے ہیں امید ہے کہ اس پرچے کے بعد تبادلہ کے پرچہ ہمارے دفتر میں پہنچینگے [illegible] آیندہ کا پرچہ اُن رسالجات اور اخبارات کو نہیں بھیجینگے جو ہمارے دفتر میں وصول نہیں ہونگے۔ منیجر

شاعری

شاعری پر اسوقت تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر آخر اس بحث کا فیصلہ نہ ہوتا تھا اور نہ ہوا کہ شاعری سوسائٹی کے لیے فائدہ مند چیز ہے یا نقصان دہ ۔ اسوقت کسی خاص زبان کی شاعری زیر بحث نہیں ہے بلکہ عام طور پر شاعری کا ذکر کرنا مقصود ہے شاعری کی سطحی تعریف تو یہ ہوسکتی ہے کہ کسی خاص مضمون کو صاف اور سیدھی عبارت میں لکھ دینے کے بجاے اسکے تک بندی کے اصول کے مطابق اس قسم کے ٹکڑے کرکے قلمبند کیے جائیں کہ طبیعت کو نثر سے زیادہ بھلے معلوم ہوتے ہوں ۔ مگر تھوڑے سے غور و خوض کے بعد شاعری کی نسبتاً بہتر تعریف نکل آتی ہے ۔ اور وہ یہ کہ مضامین نثر کو پر اثر طریقہ پر منضبط کرکے اس تقسیم کے ساتھ پیش کرنا جو دلکش معلوم ہونے کے علاوہ طبیعت میں ایک خاص جذبہ اور جوش یا اثر پیدا کرے ۔ شاعری کی ایک تعریف یہ بھی ہوسکتی ہے کہ دریا کو کوزہ میں بند کردینے کو شاعری کہتے ہیں ۔ اصل میں یہ کوئی جداگانہ تعریف نہیں ہوی ۔ اگر مذکورۂ بالا دونوں تعریفوں کو یکجا کردیا جاے تو بھی شاعری کی مکمل تعریف نہیں ہوتی ۔

شاعری کی سینکڑوں تعریفیں ہیں ان میں ایک تعریف یہ بھی ہے کہ اسکے ایک [illegible] ایک شعر کے ایک مصرع میں اسقدر مضمون آجاے جو اگر نثر میں لکھا جاے تو اسکے لیے کئی صفحہ درکار ہوں ۔ مگر ان کئی صفحوں کی جگہ صرف چند لفظ جو طبیعت کو متوجہ کرنے والے ایک قاعدہ کے

مطابق ملا کر رکھدیے گئے ہیں بالکل کفایت کرتے ہیں۔

ایک شاعر اپنے ایک شعر میں موجودات عالم اور اسکے عجائبات کا ذکر کرتا ہے جس سے اُن تمام چیزوں کی ایک جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے۔ اور اسکے ساتھ دلی جذبات کا ایک خاکہ بھی پیش نظر ہو جاتا ہے۔ گو یہ بھی شاعری کا ایک ہی رخ ہے مگر اسکے کارآمد ہونے کی اسکے علاوہ اور کوئی دلیل نہیں دی جا سکتی کہ بہت سی باتیں تھوڑی سی عبارت میں بیان کی جا سکتی ہیں جو اگر نثر میں لکھی جائیں تو بہت طویل ہوں۔ شاعری کی اصل صفت یہ ہے کہ شعر آدمی کے جذبات پر اتنا گہرا اور فوری اثر کرے کہ سننے والا تھوڑی دیر کے لیے تو اسکے اثر سے اسقدر مغلوب ہو جائے کہ جو کچھ مطالبہ اس شعر میں کیا جائے اسکے پورا کرنے کے سوا اسے کچھ بن نہ پڑے۔ عرب میں شعرا نے قبیلوں کو بنانے۔ بگاڑنے۔ لڑانے۔ ملانے کے لیے جو کچھ بھی کام کیے ہیں وہ کچھ کم نہیں ہیں۔

ایک عرب ہی پر کیا منحصر ہے تمام دنیا کے شعرا کے متعلق اس قسم کے کارنامے علم میں آتے ہیں۔ "ایران کے ایک شاعر رودکی کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ جس وقت امیر نصیر ابن احمد نے خراسان فتح کر لیا اور ہرات میں رہ پڑا اسوقت امرا وزرا نے رودکی سے لکھواکر ایک قصیدہ بادشاہ کی خدمت میں گذرانا اس قصیدہ نے امیر پر اسقدر اثر کیا کہ اُسی وقت ہرات سے بخارا کی طرف روانہ ہو گیا" اسی طرح انگلستان اور فرانس کے بعض شعرا کے متعلق بھی یہ ہی بیان کیا جاتا ہے۔ انگلستان کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جسوقت ایڈورڈ شاہ انگلستان نے

ویلز پر فوج کشی کی تو اسوقت ویلز کے شاعروں نے نظمیں لکھکر اپنی قوم کو برانگیختہ کیا جس سے شاہ ایڈورڈ کو ویلز فتح کرنے میں بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا حالانکہ ویلز کی فوج مدمقابل کی فوج سے بہت کم تھی اسی طرح دو فرانسیسی قصائد کے متعلق بیان کیا جاتا ہے جو "مارسیلز" اور "پیرس" کے نام سے مشہور ہیں اور جو چارلس دہم کے مقابلہ میں قوم کی آزادی کی حمایت کرنے کی ترغیب دینے کے لیے لکھے گئے تھے۔" ان مثالوں کے بعد یہ تو کہا ہی نہیں جا سکتا کہ شعر بیکار چیز ہے۔ بعض لوگ شاعری کو نشکار کیطرح کار بیکاران کہتے ہیں مگر کیا ایسی شاعری بیکار ہو سکتی ہے جس سے اس قسم کے نتائج مترتب ہوں اگر بیکاری کے یہ ہی معنی ہیں اور بیکاری کے یہی نتائج ہیں جو اوپر بیان کیے گئے ہیں تو کوئی ذی عقل اسکے ماننے میں حبہ بھر بھی تامل نہیں کرے گا کہ "ایسی بیکاری پر کار آمد ہونا قربان ہے۔ شاعری یا شعر نے لوگوں سے بہت کچھ لکھوایا ہے کسی نے اسکے موافق قلم فرسائی کی ہے کسی نے مخالف، مخالفت میں منجملہ اور باتوں کے ایک یہ بھی دلیل پیش کی جاتی ہے کہ شعر میں بے انتہا مبالغہ ہوتا اور شعر سُنتے سُنتے لوگوں کی طبیعت مبالغہ آمیز ہو جاتی ہے جس سے وہ عملی کاموں کے قابل نہیں رہتے۔ جہاں تک واقعات کو غلط بیان کرنا شعر سے تعلق رکھتا ہے وہاں تک شعر کوئی عمدہ چیز نہیں ہے مگر معترض صاحب اگر تشبیہات یا باریک تمثیلات کو بھی مبالغہ میں شامل کرتے ہیں وہ ایک حد تک غلطی پر ہیں شعر پر اعتراض کرنے سے قبل اگر یہ غور کر لیا جاے کہ شاعر جو صرف ایک کام نہیں کرتا جسکے متعلق دریا کو کوزہ میں بند کرنا ہے جسکو اسی شعر میں

کچھ مصوری کے کرشمہ دکھانے ہیں کچھ موجودات قدرت مستقل کرشموں مثلاً جنگل پہاڑ وغیرہ کا ایک نظارہ پیش کرتا ہے اور اسکے جلو میں قدرت کے وہ جلوہ بھی دکھانے ہیں جو مستقل نہیں ہے یعنی برسات - بجلی - گرج پہاڑ - خزاں - گرمی - سردی وغیرہ وغیرہ اور ان چیزوں کی ہی ایک جھلک وہ نہیں دکھاتا بلکہ وہ ان مختلف سینریوں میں سے بیشتر کو اکٹھا کرتا ہے اور اگر صرف حسن اور عشق ہی کو لے لیجیے تو اس سب کے درمیان ایک ہیروئن کو اپنی کسی خاص ادا سے بیٹھا ہوا دکھاتا ہے -

شاعر جسکو یہ سب باتیں دکھانی ہیں وہ آخر کیا کرے کہ ان سب باتوں کو بھی دکھائے اور اس میں سائنس یا ریاضی کی طرح روکھا پن موجود ہو - اگر شعرا ریاضی دان بھی ہوا کرتے تو غالباً ریاضی وہ ریاضی نہوتی جو آج ہے اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شعر ظاہرا حالت میں یا یا الفاظ کے لحاظ سے کسی خاص واقعہ سے متعلق نہیں معلوم ہوتا مگر جو کچھ اثر مضمر ہوتا ہے وہ انسان کو اس واقعہ کے سب پہلو دکھاتا ہوا اُس سے کچھ آگے لیجاتا ہے - مثلاً کسی کے حُسن کی تعریف میں ایک شاعر پری کا لفظ استعمال کرتا ہے یا پری سے تشبیہ دیتا ہے - گو یہ مبالغہ اور سخت مبالغہ کہا جا سکتا ہے مگر کیا سُننے والے کی آنکھوں کے سامنے بہترین حُسن انسانی کا نقشہ نہیں کھنچ جاتا ؟ یہ ممکن کہ انتہائی حُسن انسانی کے ساتھ اسکی نظر کے سامنے بھونڈا سا پری کا خاکہ بھی کھنچ جاتا ہو مگر اس پری کے خاکہ سے شاعر کا مقصد فوت نہیں ہوتا اور وہ سُننے والے کو بہترین حُسن انسانی کا ایک نقشہ دکھا دیتا ہے - بڑے بڑے مصوّروں نقاشوں - واعظوں - ایکٹروں - اور خداداد حسینوں پر جدا جدا ہر شخص

کچھ نہ کچھ اعتراض کر سکتا ہے۔ مگر ایک وہ شخص جو ان سب چیزوں کو چند لفظوں میں مکمل کرکے آپ کے سامنے رکھ دیتا ہے اسپر تو جتنے بھی اعتراض ہوں کم ہیں۔

بعض لوگ شاعری کو میجک لنٹرن سے تشبیہ دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ شاعری بھی جتنی در پردہ (دو تاریکی) کی حالت میں ہوتی ہے اسی قدر زیادہ اچھی اور پسندیدہ معلوم ہوتی ہے اور کہتے ہیں کہ جوں جوں حقیقت کھلتی جاتی ہے اُسی قدر شعر کا لطف کم ہوتا جاتا ہے مثلاً فردوسی نے رستم کی بابت جو کچھ لکھا اب اُسے بہت کم لوگ سچ سمجھتے ہیں۔ ظاہرا یہ بات جی کو لگتی ہوی معلوم ہوتی ہے مگر اسکے ساتھ اگر زمانے کی ترقیوں اور لوگوں کے خیالات پر غور کیا جاے تو کون یہ کہہ سکتا ہے کہ اس زمانے کا کوئی شاعر بھی اس طرح کے مبالغہ سے کام لے گا جس سے فردوسی نے کام لیا آج اگر کسی شخص کی بہادری کی تعریف کرنی ہوگی تو وہ آج کے مذاق کے مطابق ہوگی۔ کون یہ کہہ سکتا ہے کہ فردوسی اگر آج ہوتا تو وہ ہی کہتا جو اُس نے شاہنامہ میں کہا۔

دوسرے یہ کہا جاتا ہے کہ جوں جوں حقیقت کھلتی گئی طلسم ٹوٹتا گیا۔ انسان کے متعلق ایسی کونسی جدید تحقیقات ہوی ہے بلکہ جدید تحقیقات سے تو یہ ہی معلوم ہوا کہ انسان (رستم) کی قوت کے متعلق فردوسی جو کچھ لکھ گیا وہ در اصل واقعیت سے کم ہے کیونکہ اب انسان خود اگر سو اسو من کا گرز نہیں اُٹھا سکتا تو وہ سب کام کر گذرتا ہے کہ جو فردوسی بچارے کے انتہائی جدت طراز اور دوربین تخیل والے دماغ میں نہیں آسکتے تھے یہ سارا کھیل مذاق طبیعت کا ہے اب لوگوں کا مذاق مبالغہ سے واقعیت کی

طرف زیادہ رجوع ہوتا ہے۔

شاعری کے خلاف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تشبیہات اور استعارات کم ہوتے جاتے ہیں۔ کم ہوتے جانے کی ایک تو یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ چونکہ استعارات وغیرہ ایک عرصہ سے استعمال ہو رہے ہیں اور وہ عام طور پر ایسی ہی چیزوں سے لیے جاتے ہیں جو انسان کی نظر سے گذر سکیں اسلیے ان میں بار بار دُھرائے جانے کی وجہ سے دلکشی نہیں رہی یا یہ کہ استعارات و تشبیہات عام طور پر ناممکن الوقوع یا کم از کم مبالغہ کے تحت میں آنے والے اور مشکل دائرہ میں سے لی جاتی ہیں اور اب جیسا کہ واقعات سے ثابت ہوتا ہے اس دنیا میں بہت سی ایسی باتیں جو غیر امکانی معلوم ہوتی تھیں دائرۂ امکان میں آنے لگیں اس لیے جسقدر ناممکن باتیں کم ہونے لگیں اوسی قدر استعارات اور تشبیہات کا دائرہ کم ہوتا گیا۔ پہلی دلیل کا جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ دنیا نے یا دنیا میں رہنے والے انسانوں کے دماغوں نے اسوقت تک اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ انکو تمام کائنات قدرت کا حال معلوم ہوگیا ہو۔ اور اس لیے ابھی دنیادی اور سماوی چیزوں میں اسقدر گنجائش باقی ہے کہ ان سے کام لیا جائے۔ دوسری دلیل کا جواب بھی یہی ہے مگر دوسری دلیل کے لیے یہ ہی جواب تجویز کر دینے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے ایجادات کرنے والے دماغ غیر امکانی چیزوں کی طرف جب ہی منتقل ہوے جب شاعروں نے انھیں کچھ ایسی باتیں سمجھا دیں جو انسان کے مطلب کی ہوں اور ہم انسانوں سے اتنی مناسبت ضرور رکھتی ہوں کہ شاعر اسکو بطور کسی وصف یا حالت کی معراج کے تشبیہ کے طور پر استعمال کر سکے۔ اب میں سوال کر سکتا ہوں کہ وہ

چیز جو ایجادات کرنے والے دماغوں کو ایجاد کی طرف منتقل کرلے سوسائٹی کے لیے مضر ہو سکتی ہے؟-

شاعری کی اس طرح حمایت کرنے سے اُس شاعری کی حمایت مقصود نہیں جو در اصل شاعری کہلانے کی مستحق نہیں ہے یعنی محض گل و بلبل کی شاعری-

ایڈیٹر

استدعاے خاص

مَیں اپنے جملہ احباب اور اولڈ بوائز کی خدمت میں خاص طور پر سفارش کرتا ہوں کہ وہ بجہیر عنایت کرکے رسالۂ "تمدن" کو ترقی دینے میں کوشش فرمائیں- جو احباب قلمی معاونت فرما سکتے ہیں- وہ براہ نوازش مضامین نظمیں- اور غزلیں عنایت فرمائیں- دیگر احباب خریدار بن کر اور خریدار پیدا کرکے ممنون فرمائیں- ایک علمی رسالہ جاری کرنے کا مجھے خیال عرصۂ دراز سے تھا- مگر میری مجبوریاں ابتک مانع ہوئیں- اب اللہ نے اپنے فضل سے میرے بڑے لڑکے عباس حسین سلمہ کو اس کام کے قابل کر دیا اور بمصداق ع اگر پدر نتواند پسر تمام کند- رسالۂ "تمدن" برادرم مولوی عبد الراشد صاحب سے لے کر جاری کیا گیا- اب یہ جملہ محبان علم اور خصوصاً میرے ذاتی احباب کی توجہ کا محتاج ہے- مجھے یقین کامل ہے کہ میری اس درخواست پہ توجہ فرمائی جائے گی-

خاکسار

سرفراز حسین قاری (علیگ) دہلوی

چاند

چاندکو کون نہیں جانتا۔ چاند اجرام فلکیہ کا وہ قابل قدر کرۂ نور ہے جو روشنی میں سورج سے دوسرے درجہ پر ہے اور دنیا کی اُلٹ پھیر کے ایک مساوی حصّہ کا سرتاج ہے۔ سورج دن کو اکیلا نظر آتا ہے مگر چاند جسکے نام میں کچھ محبت کا اثر ہے وہ سورج کی طرح اکھل کھرا نہیں ہے وہ اپنے مصاحبوں کے ساتھ اس نیلگوں تخت پر جلوہ افروز ہوتا ہے۔

چاند کے نام میں خبر نہیں کیوں اسقدر کشش ہے؟ اسکے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ چاند کے سایہ میں کیونکہ طالب و مطلوب کے یکجا ہونے کا سین باوجود اس چرخ کجرفتار کی ناہنجاریوں کے بعض اوقات دکھائی دے جاتا ہے اس وجہ سے چاند میں اس محبت کا کچھ عکس پہنچ گیا ہے اگر اس دلیل کو چاند کی طرفداری میں پیش کیا جاسکے تو اسکی مخالفت میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ شب فراق بھی تو اس چاند کے سایہ میں بسر ہوتی ہے۔ اور جو عاشق ناکام رات بھر کروٹیں بدلتا اور چاند کی طرف دیکھتا ہے۔ اسکی مایوسی اور مایوس کن نظر کا اثر چاند پر کیوں نہیں پڑتا۔

اس نظر کا اثر تو ہمارے پہلے دعوے کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ گو شب فراق سہی۔ مگر شب فراق کی تڑپ جدائی کی مایوس نظر دونوں معشوق کی محبت میں ڈوبی ہوی ہوتی ہیں اور وہ اسی طرح چاند میں بھی محبت یا کشش کی قوت پیدا کر دیتی ہیں جس طرح ایک کامل پیر جس طرف نظر ڈالتا ہے اور جو اسکی نگاہ کی زد میں آجاتا ہے اسکے قلب کو منور کر دیتا ہے

چاند میں دلفریبی ہوتی ہے ! مگر سورج میں اسکے خلاف نظر کو پیچھے ہٹانے کی قوت ہوتی ہے۔ سورج میں ایک جلالی شان ہوتی ہے اور چاند میں جمالی شان کے علاوہ ایک اور قوت ہوتی ہے جسکو میں دلکشی سے تعبیر کرچکا ہوں۔

چاند کی طرف اگر آپ دیکھیں تو اسکو دیکھتے رہنے کو جی چاہتا ہے اور بالکل وہی بات حسین انسان میں ہوتی ہے۔ میں خدانخواستہ یہ سنوانا نہیں چاہتا کہ معشوق اور چاند دونوں برابر کی چیزیں ہیں حضرت حافظ شیرازیؒ اسکا بہت پہلے فیصلہ فرما گئے ہیں کہ چاند کو معشوق سے کیا نسبت ہے۔

عارضش را بمثل ماہ فلک نتوان گفت
نسبت دوست بہر بے سروپا نتوان کرد

ہمارے ایک اردو شاعر نے بھی گو بہت صاف اور کھلا لکھا ہے مگر اپنی بساط کے موافق خوب لکھا ہے۔

چاند سے جو تجھ کو دے تشبیہ بے انصاف ہے
اسکے منھ پر چھائیاں ہیں تیرا مکھڑا صاف ہے

ان لوگوں کے لیے بیشک چاند سے معشوق کو تشبیہ دینا بامعنی ہوسکتا ہے جو اپنے معشوق کو چاند سے کمتر یا اسکے برابر سمجھتے ہوں۔ چاند کو اس دلنواز چیز سے تشبیہ دینے کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ خدانخواستہ چاند اوصاف معشوقیت میں افضل یا برابر ہے۔ ان لوگوں کو نظر انداز کرنے کے بعد جو ہمارے نزدیک اہل نظم کی تشبیہات سے کہ معشوق کو چاند سے کمتر سمجھتے ہیں۔ دوسرے طبقہ کی طرف رجوع کرنے سے چاند... کو

معشوق سے کوئی نسبت نہیں دیتا معلوم ہوتا ہے کہ وہ چاند کی صرف اس وجہ سے وقعت کرتا ہے کہ چاند میں ان اوصاف میں سے چند کی ایک جھلک پائی جاتی ہے جو بدرجۂ کمال معشوق میں موجود ہوتے ہیں غرض اس تمام بحث سے جو کچھ بھی نتیجہ نکلا وہ یہ ہے کہ دونوں فریق خواہ وہ چاند کو اپنے معشوق سے برتر خیال کریں یا بدتر وہ چاند کی اسی وجہ سے وقعت کرتے ہیں کہ چاند میں وہ اوصاف ہیں جو معشوق میں ہوتے ہیں۔ غرض محبت کے بندے چاند کو اس عالم موجودات کی بہت سی کیا بلکہ سوائے ایک کے سب چیزوں سے زیادہ قابل وقعت خیال کرتے ہیں اور یہ ہی اسکی دلکشی کا راز ہے۔

محمد ابراہیم دہلوی

"میں تم کو متنبہ کرتا ہوں کہ کبھی یہ خیال مت کرو کہ امارت کا لازمی نتیجہ خوشی ہے اور غربت کا رنج۔
کبھی اپنی زندگی کو یہ خیال کرکے شروع نہ کرو کہ تم کو دلی خوشی بھی حاصل ہوگی جب کہ تمھارے پاس دولت ہے۔ ایک آدمی کی خوشی زیادہ تر اس کے مزاج پر منحصر ہے اگر اس کا مزاج اچھا ہے تو امارت اسکے لیے خوشی پیدا کرنے کا باعث ہوگی اگر اسکا مزاج خراب ہے تو وہ رنج پیدا کریگی"

"بیمبر"

رسوم

کوئی قوم کوئی ملک کوئی ملت ایسی نہیں جسمیں رسوم کا رواج نہ ہو رسم ہے کیا؟ رسم اُن رواجوں کا نام ہے جو ایک عرصہ تک کسی ملک میں جاری رہنے کے بعد لوگوں پر اسقدر حاوی ہو جاتے ہیں کہ انکو مضر سمجھنے کے بعد بھی ان سے پیچھا چھڑانا دشوار کیا ناممکن معلوم ہونے لگتا ہے خصوصیت کے ساتھ ان رسوم کو ترک کرنا جنکو بالواسطہ یا بلاواسطہ مذہب سے منظوری حاصل ہوتی ہے۔

رسم پر ہندوستان کے اُردو رسائل اور اخبارات میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور جہاں ایک گروہ ایسے لوگوں کا ہے جو رسم کی پابندی کو وضعداری خیال کرتا ہے وہاں اُس گروہ کے افراد بھی کچھ کم نہیں ہیں جو رسم کو ایک مہمل حرکت خیال کرتے ہیں۔ رسم کی پابندی کے معاملہ میں جو طبقہ زیادہ پابند وضع ہے وہ عورتیں ہیں قریب قریب ہر گھر میں مردوں کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ عورتیں رسوم کی پابندی کے لیے بیجا زور دیتی ہیں اور بعض اوقات تو یہاں تک ہوتا ہے کہ گھروں میں لڑائی کی بنا یہی رسم کی پابندی ہو جاتی ہے۔ خاوند صاحب رسم کی پابندی حرام خیال کرتے ہیں بیگم صاحبہ رسم کو چھوڑنا کفر۔ اس چھوٹی سی بات پر آپس میں شکررنجی ہو جاتی ہے۔ اسوقت تک جو بحثیں اس مسئلہ پر ہوی ہیں وہ یہ بتاتی ہیں کہ سو میں سے نوے بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ رسوم محض لغو ہوتی ہیں مگر تعجب اور رونا تو اس بات کا ہے کہ وہ تعلیم یافتہ گروہ جو

رسم کو کفر اور اسکے کرنے والے کو قریب کافر سمجھتا آنکھوں دیکھے
کنوئیں میں گرتا اور رسموں کو پورا کرتا ہے۔ رسوم قبیحا کو چھوڑنے کا وعظ
سننے سے پہلے ہمکو ان باتوں پر غور کرنا چاہیے جو رسم کو چھوڑنے نہیں
دیتیں۔ کیونکہ مرض کی تشخیص ضروری ہوتی ہے اور جب مرض تشخیص ہوجاتا
ہے جب کہیں مرض کے لیے دوا تجویز ہوسکتی ہے۔ تو بالکل ظاہر
ہے کہ رسوم کو چھوڑنے کے لیے جو چیز مجبور کرتی ہے۔ وہ یا تو کفایت کا
خیال یا مفت کی پریشانی اور تکلیف سے بچنے کی ضرورت یا اس رسم کا
عام تہذیب کی ترازو میں پورا نہ اترنا۔ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو
رسم کی پابندی سے آزاد کرنا چاہے تو وہ کم از کم اس وقت تک اس سے
سبکدوش نہیں ہوسکتا جب تک پہلی مرتبہ وہ اپنے مقصد کو فوت نہ
ہو جانے دے۔ بادی النظر میں یہ ایک معمولی سی رائے ہے جو ان لوگوں کے
لیے دی گئی ہے جو دنیا۔ کنبہ قبیلہ اور لوگوں کی طعنہ زنی کا حد درجہ
خیال کرتے ہیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو اس خاص پابندی سے معرّا خیال
کرتے ہیں وہ بالکل آزاد ہیں یہ ممکن ہے کہ وہ رسوم کو چھوڑ کر اپنے
آپ کو تکلیف سے بچائیں اور کفایت کا ضروری مقصد بھی حاصل کریں
مگر وہ لوگوں سے اپنی تقلید نہیں کرا سکتے۔

ہندوستان میں اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں
میں نوے فیصدی آدمی ایسے ملیں گے جو نہ تو خود کفایت کرتے ہیں
اور نہ کسی دوسرے کو کفایت کرتا ہوا دیکھکر خوش ہوتے بلکہ اسکو حقیر
سمجھنے لگتے ہیں۔ ہر شخص خواہ کسی حیثیت اور کسی مرتبہ کا کیوں نہ ہو
فطرتاً وہ اس بات کو برداشت نہیں کرسکتا کہ کوئی فرد بھی اسے بے وقعت

سمجھے اور اسی لیے وہ رسوم کو چھوڑنے کے فوائد کو محض اس لیے قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے کہ کہیں لوگ اسے بے وقعت خیال نہ کرنے لگیں اس لیے اس شخص کے لیے جو رسوم کی اصلاح کرنا چاہتا ہے لازم آیا کہ وہ ابتدا میں کفایت اور اپنی تکلیف کے خیال کو نظر انداز کرے - جب وہ دو چار دفعہ کے بعد اپنے اصل مقصد کو پورا کر سکے گا اور رسوم کی اصلاح ہونے لگے گی -

جہاں میں رسوم کی اصلاح کا مدعی ہوں وہاں میں یہ نہیں کہتا کہ رسوم کو یک قلم ترک کر دیا جائے کیونکہ ہندوستانی عورتوں کا ملنا جلنا بہت کچھ ان رسوم پر مبنی ہے اور اس ملنے جلنے سے بہت سے ضروری کام مثلاً لباس وغیرہ کی اصلاح سلیقہ شعاری اور طریقہ برتاؤ کا علم اور شادی بیاہ کے متعلق ابتدائی معاملات سرانجام پاتے ہیں -

ایک دوسرے سے ملنے جلنے میں تخفیف کرنے کا خیال کرنا میرے نزدیک سوسائٹی کے لیے مضر معلوم ہوتا ہے اور اس مضمون کے لکھنے سے میرا مدعا یہ ہے کہ رسوم بھی رہیں اور ان میں ایسی سہولتیں بہم پہنچ جائیں جو خوبی اور لطف کے مقابلہ میں حد سے زیادہ تکلیف دہ نہوں اس خاص مسئلہ پر ملک کے اہل قلم اپنی اپنی رائے دیں - کہ موجودہ رسوم میں کس طرح اصلاح ہو سکتی ہے اور ان کی تکلیف دہ باتوں کی جگہ کیا کیا ایسی باتیں پیش کی جا سکتی ہیں جو سہل العمل بھی ہوں اور نسبتاً پر لطف بھی -

اخلاق حسین

جون جولائی - جو صاحبان جون جولائی کے پرچے ہم سے طلب فرماتے ہیں ان کی خدمت میں التماس ہے کہ جون جولائی کے پرچے تمدن پریس دہلی سے شائع ہوئے تھے اور ان کے متعلق انکی پتہ پر خط و کتابت ہونی چاہیے -

منیجر

مرد۔ عورت

ذیل کے دونوں مضمون "خطیب" دہلی میں شایع ہوے ہیں۔ ہم ناظرین تمدن کی دلچسپی کی غرض سے انہیں نقل کرتے ہیں۔ پہلا مضمون "عورت سے" سید ظفر حسن صاحب علوی ناظم دائرۃ الادب دہلی کا لکھا ہوا ہے اور دوسرا ایک عورت کا لکھا ہوا ہے جو حضرت نیاز فتحپوری کے توسل سے خطیب تک پہنچا ہے۔ ایڈیٹر

عورت سے

او سراب نشاط، تیری فتنہ سامانیوں نے، خدا جانے، کیا کیا بلاخیز ہنگامے راحت بخشی کے پردہ میں اب تک برپا کئے ہیں، اور کون جانتا ہے کہ ابھی تیری عجیب وغریب ذات سے کیا کیا مظالم ومصائب افسانے ہونگے، مجکو اب تک تیری سب سے پہلی نوازش یاد ہے جبکہ تیرے لئے میرے بائیں پہلو کو چاک کیا گیا تہا اور تو نامعلوم وغیر محسوس طریقہ سے میرے پہلو میری سکون نصیب خلوت پر قابض تھی۔

او فریب نشاط، ہابیل وقابیل کی سب سے پہلی عداوت میں تیرے ہی رخسار آتشین کا جلوہ تھا۔

او ہنگامہ خاموش، بنی اسرائیل میں فسادات کی ابتدا تیرے ہی نگاہ فسوں ساز سے روبراہ ہوئی تھی۔

او شربت سم آلودہ او میٹھی چھری۔ تیری ہی نامعلوم وہار برسوں مصر کے قیدخانے میں ایک معصوم کی آزادی پر پھرتی رہی کیا تو وہ نہیں ہے جس نے ہفت خانہ بنا کر ایک نبی کی عصمت اور ناموس الٰہی کو پھسلا کر لوٹ لینا چاہا تہا۔

او زاہد فریب لاتیغ رصفا کا طول نہ باکسی نے ہر ایک اشارہ ابرو تمتہ کیواسطے پامال کر ڈالا۔

ارے کیا تو نہ تھی ۔

اوبرش بہیم ''غریب فرہاد کا خون اب تک تیری فقرے بازیوں کا نوحہ خواں ہے ۔

او مقابل گھول '' اچھا بتلا تو لنکا کسکے نام پر راکھ کا ڈھیر بنائی گئی **اور نخچیر فراخت** کیا تجکو یاد نہیں رہا غریب رتن سین پر تو نے کیا کیا مصائب ڈالے اچھا وہ کون تھا جس نے نل سے حکومت چھڑائی ۔ **او تیش سرو** ''شیر افگن کا رخت ہستی کسکی چنگاری سے خاک ہوا **او تصویر قیامت** '' تجکو موقعہ ملنا شرط ہے پھر تو **بلائے ناگہانی** ہے جام **غفلت** ہے وزن صبر ہے **مرگ ہوش و حواس** ہے **زندان آزادی** ہے غرضیکہ وہ سب کچھ ہے جو **ابتلائے عظیم** کے لئے درکار ہونا چاہئے ۔

او پھسلانیوالی گڑیا '' تو بظاہر نہایت بھولی بھالی '' غریب صورت '' ترحم خواہ '' بے کس '' نازک یا نحیف کمزور '' دل ہلانیوالی '' ہے **مگر اف** تو بڑی ظالم و جابر ہے **تو سراپا** [illegible] ہے ۔ تیرے قبضہ میں لاکھوں حیات سوز **اداؤنکا** '' خونخوار ناقابل ہزیمت لشکر ہے جنکے پاس **ہلالی ابروؤں کے دوہرے تیغے** ہیں جنکے نشانوں پر **شہ زوروں کی مشکیں** کس لینیکو ہزاروں کمندیں ہیں جن کے پاس **مسموم کر دینے والی** '' گیس شمیم زلف '' ہے جنکے پاس قلوب کے سنگین حصاروں پاش پاش کردینے والی دھمکی او (**برق تبسم**) ہے جنکے پاس سرچ لایٹ (**رخ روشن**) اپنے شکار کو دور سے دیکھہ لینے کے لئے ہے ۔

تیری ان آنکھوں میں بد اور رس کہاں ہے انہیں تو **وجالیت** ہے جسکو چاہتی ہیں زندہ کرتی ہیں جنکو چاہتی ہیں مار ڈالتی ہیں ۔

او قیامت صغرا '' خدا جانے یہ تیرے پر آشوب سینہ پر کن عالمگیر آتش زن مادہ کا ڈھیر ہے ۔ شاید آتش فشاں پہاڑ ہی ہیں ۔

تیری چتون کا بل '' وہ بل نہیں جو قسمت میں کبھی پڑجاتا ہے اور کبھی نکل جاتا ہے

بلکہ یہ وہ بلا ہے جو کہیں سام زہر بنکر حلق میں اتر جاتا ہے اور کہیں خنجر جانستان بنکر کلیجہ میں تیر جاتا ہے۔

او فریب محبت تیری اکاونیں۔ آہ خون کو سفید کر دیتی ہیں قدرتی محبتوں کو توڑ دیتی ہیں پانی میں آگ لگا دیتی ہیں

او نقوش شکن! جب تو ہٹا دیتی ہے انسانوں سے۔ خدا کو بہلا دیتی ہے۔ تیری شراب التفات کو اسقدر پر نور ہے اسقدر تند ہے کہ ناچیز انسان اس جبار و قہار کی قدرت کی پرواہ کو بھو جاتا ہے۔

او خوبصورت بلا! جب تو اپنی طرف بلاتی ہے پھر اسکو جسے تو نے بلایا کوئی قوت روک نہیں سکتی۔ خواہ اسکے سامنے بھڑکتی ہوئی آگ لائی جائے۔ یا مواج سمندر۔ یا مہیب وشوارگذار پہاڑ۔ یا سنسان و وحشت خیز جنگل۔ وہ ضرور تیرے مشق ناز کیلئے تیرے پاس ہوتا ہے۔

او صبح کاذب! جب تیری زبان سے۔ کسی کے واسطے ہاں نکل جاتی ہے تو پھر نہیں "نہیں ہوتی نہیں ہوتی" خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔

او سفید جھوٹ! جب تو چاہتی ہے بڑے بڑے گھرانوں کی عزتیں ...... کھڑی ہو جاتی ہے کیا تو وہ نہیں ہے جو راتوں کو شیطان کی پرستش کرتی ہے اور صبح کو نہیں شرماتی۔

او اکال الامم! امویوں کو تو نے کھویا۔ عباسیوں کو تو نے برباد کیا۔ ایرانیوں کو غارت کیا ہندوستان کو تباہ کیا۔ افریقہ کو غارت کر رہی ہے "خانوادہ حلالت" میں تیری لگائی ہوئی آگ اب تک نہیں بجھی باوجودیکہ لاکھوں بہادروں نے اپنی عزیز و پاک خون سے بجھائی غریب بے زبان پارسیوں پر تو نے پڑھے جس کیطرح سوار ہے۔ یورپ کو عنقریب ...... والی ہے۔ وہ کونسی ریاست ہے جسکا دامن تیرے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی لپٹ سے بچا ہوا ہے

پناہ بخدا۔ ،، الحذر الحذر، اچھا بتلا، تو کس طمانیت پر ہم سے چاہتی ہے کہ تجھپر بھروسہ کیا جائے، یورپ نے تجھ پر بھروسہ کیا۔ کیا پایا۔ آج تیرے ہاتھوں وہ اسقدر مجبور ہیں کہ تیرے خلاف آواز بھی نہیں نکال سکتے۔ مشرق میں جو کچھ تو نے کیا۔ اگر وہ بھول گئی ہو۔ تو جا اور روا شلیم کی چتا سے پوچھ یا سعدی کی قبر سے دریافت کر۔ یا ملاحین سے معلوم کر۔ یا عنایت اسکی گور بے نام نشان سے سن۔ یا یورپ ہی میں تجھکو پوچھنا ہو تو شیکسپیر سے پوچھ۔ پوچھتے ہوئے شرم لگے تو ایڈیسن کے کارخانہ میں جا جہاں فلمیں تیار ہوتی ہیں۔ چشم عبرت کھول اور اپنے سیاہ کارنامے دیکھ اپنے مظالم کی کہانیاں سن اپنی فتنہ پردازیوں کی داستانیں پڑھ اور شرما اب ہمارے پاس تیرے لئے کچھ باقی نہیں رہا۔ گو تیری چلتی ہوئی تدبیریں اب بھی بے پناہ ہیں۔

کس ضمانت پر ہم تجھکو آزادی دیں۔ کیا تو یہ چاہتی ہے۔ تجھکو دولتوں کو۔ عزتوں کو۔ نیکوں کو تباہ کرنیکے واسطے بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے۔ تو اب یہ چاہتی ہے کہ تیرے عالم آشوب چہرے سے نقاب اسلئے دھکو دیا جائے کہ قتل عام میں تجھی آسانیاں ملجائیں۔ یا تو اِس سرے سے اُس سرے تک اطمینان کے ساتھ آگ لگا سکے۔ اب چار دیواریوں سے تو کیا اس باہر آنا چاہتی ہے کہ ہماری رہی سہی زندگی کا بھی خاتمہ کردے۔ او ظالم اسقدر تاب گسل مظالم پر بھی تجھکو صبر نہ آیا۔ اب بھی تیری پیاس نہ بجھی۔

گو تیرے سحر میں محسور ،، لاکھ دھوکے دیں۔ تربیت اولاد نعیم اولاد تکمیل تہذیت ترقی تمدن کے لاکھ افسانیں گائیں لیکن جنہیں خدا نے عقل دی ہے۔ وہ تیری سرشت کو تیری انعام کو خوب پہچان گئے ہیں۔ اب تو چاہے علیگڈہ میں اپنی تعلیم و تہذیب کا ڈوکر الصحف کر یا لکھنؤ میں تیرے لئے نظامی کا یہ فیصلہ ہو اگر نیک بودے سر انجام زن۔ زناں را مزن بودے نے زن بالکل درست ہے تو اسی کی مستحق ہے۔ جا سامنے سے دفعہ ہو اور کسی پاگل کو تہذیب و تعلیم کا تازہ فریب دے۔ تو جن کیلئے مایۂ ناز ہے انہیں کے سروں پر سوار ہو۔ اور انہیں کو

لیٰ ہی شرارتوں کا الہ بنا۔ کوئی عقل مند مجکو منہ نہ لگائے گا۔ تو غضب الہی کی متحرک تصویر ہے ہمارا دامن چھوڑ چھوڑ۔ معاف کر۔ (باقی آئندہ)

(ظفر حسن عساوی)

مردے

اے انسان فراموش، اے تو وہ کہ تجھے کبھی حقیقت کے انکار کرنے سے شرم نہیں آئی اور اے تو وہ کہ تجھے کبھی عداوت کو دنیا سے مٹا دینے کے لیے اپنی جبارت سے شیکار نہیں ہوتی، دیکھ مجھ کو اپنے ان کارناموں کی یاد نہ دلا، جو ہر چند تیرے ناصیہ کا ذوبہ کے لیے طرۂ فخر و امتیاز ہوں، مگر ہماری جنس کی تباہی اور بربادی کی سخت دردمند المناک داستانیں ہیں، اے حق ناشناس آج تو اپنے بائیں پہلو کے چیرے جانیکی شکایت کرتا ہے کہ مسایہ ہے کہ میری اولین آفرینش کو بھی اپنے لئے باعث تکلیف ثابت کرے، حالانکہ تجھے یاد ہوگا کہ تو باوجود ایک وسیع فضا والی پُر بہار جنت کے مالک ہونیکے بھی افسردہ و مضمحل تھا۔ تو جنت سے بیزار تھا، تو نے الوہم سے فریاد کی کہ نلد سونی کیوں ہے؟ خدایا باوجود تمام اسباب راحت و نشاط کے مہیا ہونے کے یہ ایک غیر مکن ویرانی سے کیا ہے، فردوس جسے حقیقتاً گلشن ہی کہنا چاہئے کیوں اُجاڑ سا نظر آتا ہے، کیا ان لہلہانے والے پھولوں، تر و تازہ پھلوں، شاداب درختوں، ان سکون نظر نہروں کے علاوہ بھی کسی اور چیز کی ضرورت ہے جو بلغ جناں میں نہیں ہے، اگر ہے تو وہ کیا ہے، جب بارگاہ قدس میں اس تیرے غم و الم اس بیقراری و اضطرار کو فرشتے لے گئے، تو تیرا وہ کھویا ہوا سکون جس کے لئے تو تڑپ رہا تھا، تیری وہ حقیقی طمانیت و راحت جسکا عوض جنت کی کوئی چیز نہ ہو سکتی تھی تجھے میری صورت شکل میں عنایت ہوئی

اب چاہے تو پہلو کے چیرے جانے کی فریاد کرتا پھر یا کوئی اور الزام خدا پر دے، کیونکہ (جیسا آگے میں ظاہر کرونگی) تو الزام رکھنے میں بڑا مشاق و شاطر ہے، مگر یہ تو سمجھ کہ تجھے (بقول تیرے) اس عمل جراحی کی ضرورت تھی یا نہیں، اگر ہم مان بھی لیں کہ جب تیری پسلیاں ایک دوسرے سے جدا کی گئیں تو تجھے تکلیف ہوئی، لیکن اے کم فہم کیا تجھے اس تکلیف سے یہ سبق نہیں ملا کہ دنیا میں تجھے کوئی راحت کوئی لذت نہیں حاصل ہوسکتی جبتک تو پہلے مصیبتوں کو نہ برداشت کرلے اور اسی کے ساتھ کیا یہ تیری فطرت نہیں ہے کہ ہر اس چیز کی تو زیادہ قدر کرے جو زیادہ محنت و مصیبت سے ہاتھ آئی ہے، لیکن اے تو وہ **فریب مجسم** کہ جب تک کوئی چیز تجھے دستیاب نہ ہو سراپا عہد و پیمان ہے اور جب ملجائے تو تو یکسر غفلت و نسیاں، تجھے یہ بات تو یاد رہ گئی کہ میں تیرے لئے جراحت پہلو تھی، لیکن یہ بتا کہ راحت پہلو کون تھا۔ اگر احسان بھلا دینا تو اپنی خو نہ کرلیتا، اگر احسان کرنے والے کو ٹھکرا دینا تیری زندگی کا مہتم بالشان کارنامہ نہ ہوتا، اگر رحمت وغیرت کے الفاظ تیرے لغت میں اصطلاحات مہملہ نہ ہوتے، اگر تو نکتہ شناس ہوتا تو اے **خیرہ چشم**، تو سمجھتا کہ میرا تیرے پہلو سے پیدا کیا جانا اسلئے اس کے کوئی معنی رکھتا ہی نہ تھا کہ تو مجھے ہمیشہ اپنے پہلو سے لگائے رکھتا اور تو قدر کرتا کہ میں تیرے اس پہلو کا جزو لطیف ہوں جہاں اے ظالم تیرا دل اب بھی تیری بیرحمیوں پر سر دھن رہا ہے اے **صداقت نواز** اے تو وہ کہ **کذب و افترا** کا تنہا مالک بنا بیٹھا ہے، ہابیل وقابیل کی پہلی عداوت کا ذمہ دار مجھے ٹھہراتا ہے، بنی اسرائیل کی تباہی میرے سر تھوپتا ہے، شاہان سلف کی بربادیاں میری وجہ سے بتاتا ہے، زاہدوں کی لغزش کو میری خطاؤں میں شمار کرتا ہے، مجھے ہنسی آتی ہے (حالانکہ میرا ہنسنا بھی تیرے نزدیک جرم عظیم ہے) اور تعجب نہیں جو اتنا کہدینے سے اپنے کسی اور گناہ کو بھی جسکا ذکر نا تو پہلے بھول گیا ہو، اب تو میری ہنسی کی وجہ سے بتائے۔ لیکن میں ہنسونگی

اور کیوں نہ ہنسوں، جب میں یہ دیکھتی ہوں کہ تو نے اپنے زعم باطل پر اعتماد کر کے غریب تاریخ کو بھی مجروح کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا جس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ وہ بھی بدقسمتی سے مونث ہی بولی اور لکھی جاتی ہے، کیا تجھے خبر نہیں کہ تیرے بھائی قابیل کی قربانی خدا نے رد کر دی تھی اور ہابیل کی قبول کر لی تھی۔ کیا تجھے علم نہیں کہ قابیل و ہابیل کی باہم عداوت کی وجہ یہ تھی، مگر جب تیری انشاء میں کسی پر بہتان رکھنے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں، تجھے کیا تو کہدیگا کہ "اگر قربانی کا جھگڑا تھا تو کیا ہوا۔ قربانی بھی تو آخر مونث ہی ہے"

بنی اسرائیل کی تباہی میرے سر تھوپتا ہے۔ اے کافر نعمت، من و سلوے کھاتے کھاتے لہسن پیاز کو مرا جی للچایا ہوگا۔ موسےٰ جب کوہ طور سے لوٹے ہونگے تو گوسالہ سامری کی پرستش کرتے مجھی کو دیکھا ہوگا، احکام خدا و رسول سے سرتابی میں نے کی ہوگی، تباہ و برباد ہوا اپنی نافرمانی سے اور الزام رکھے مجھ پر مگر کہدے کہ "نافرمانی بھی تو مونث ہی ہے۔"

بنی امیہ کی بربادی کا سبب مجھے بتاتا ہے، بنی عباس کا زوال میری ذات سے متعلق کرتا ہے۔ مگر جب تو نے تھوڑی بہت بھی تاریخ کی ورق گردانی ہوگی، تو کیا تیری نگاہ سے یہ نہ گزرا ہوگا کہ بنی امیہ کی سلطنت حسین کے خون سے قائم ہوئی اور اس لئے وہ سلطنت جس کی بنیاد ظلم پر شروع ہوئی ہو، اور جس کے تمام افراد نے بنی فاطمہ کے تباہ کرنے میں ہی تمام تر اپنا شعار کر لیا ہو وہ زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتی۔ ہشام بن عبدالملک کا حال پڑھ جو ایک قوی تاجدار اس خاندان کا تھا اور سمجھ کہ کیوں اس کے مرتے ہی سلطنت کا زوال شروع ہوگیا اور کیوں ۳۰ برس کی مختصر مدت سلطنت حکومت زوال سب ہی کچھ ختم ہوگیا۔ بنی عباس اور بنی فاطمہ جو دونوں ایک دادا کی اولاد تھے۔ چاہئے تھا کہ بنی امیہ کے بعد ملکے زندگی بسر کرتے، مگر نہیں، وہ باہم صلح و آشتی سے نہیں رہ سکتے تھے

کیونکہ وہ مرد تھے جنکے خمیر میں باہم جنگ و فساد موجود ہے، بنی عباس نے بھی بنی فاطمہ پر وہی بلکہ اس سے زیادہ ظلم توڑے جو بنی امیہ نے کیے تھے۔ کیا عبداللہ نبیرۂ حسن بن علی کو منصور عباسی نے قید کر کے مار نہیں ڈالا، کیا عبداللہ کے تیسرے بیٹے یحییٰ کو ہارون الرشید نے زہر سے نہیں مار ڈالا، کیا خلیفہ ہادی عورت تھا جس نے حسن مثلث پوتے حسین کو موضع فخ میں تہ تیغ کر دیا، کیا خلیفہ معتصم مرد نہیں تھا جس نے عمر بن علی بن حسین کے پوتے محمد کو قید میں گھلا گھلا کر مار ڈالا، کیا ہلاکو تیری جنس کا ایک بہادر فرد نہیں تھا جسنے خلافت عباسیہ کا تختہ بغداد میں جا کر اولٹ دیا، مگر تو جواب دیگا کہ بنی امیہ تباہ ہوئے بنی فاطمہ کی بغاوتوں سے، بنی عباس برباد ہوئے اس وجہ سے کہ اخیر وقت میں وزرار سلطنت بنی فاطمہ سے ملگئے تھے اور چونکہ بنی فاطمہ، فاطمہ کی اولاد تھے اسلئے تیرا الزام پھر بھی وہی رہا کیونکہ فاطمہ بھی عورت ہی تھیں۔ باقی دارد

صبح کا ستارہ

از جناب منذ محمد صاحب انور سیالکوٹی

بظاہر دیکھنے میں تو بہت حیران ششدر ہے
حقیقت میں ہزیمت خوردہ فوج سکندر ہے

بھلا تو ہی بتا دے تیری غم میں کیسی حالت ہے
تجھے کس کی محبت ہے تجھے یہ کسکی فرقت ہے

خموشی ہی خموشی دہر میں ہر سو برستی ہے
تری تاب تکلم کہنے سننے کو ترستی ہے

چلا ہے آخر شب تو وطن سے بیوطن ہوکر
چمن کو چھوڑتا ہے ورد سے زیب چمن ہوکر

طیور بوستاں فرقت میں تیری محو گریانی
تہے جانیے لیلائے فلک کی ہوگی عریانی

جو سمجھا باغباں شبنم یہ آنسو ہیں نہیں شبنم
کسی کا درد خاطر ہے کسی کا گریۂ پیہم

ابھی آیا ہے محفل میں ابھی یاں سے رواں ہوگا
ترے پیچھے رواں تاروں کا سارا کارواں ہوگا

مکالمۂ زبان و قلم

از جناب حسن مرزا صاحب شرر مشہدی لکھنوی

پھر گلفشان زباں گہر افشاں قلم ہے آج | پھر مجھکو باغ و گنج مضامین بہم ہے آج
پھر سامنے تجمل طبل و علم ہے آج | پھر دست زور وار میں تیغ دو دم ہے آج
پھر ہے شرر کے نام کا جھنڈا گڑا ہوا
پھر معرکہ ہے کلک و زباں میں پڑا ہوا

دعویٰ قلم کا ہے کہ میں شاہ سخن بھی ہوں | دنیا میں صلح کل ہوں مگر صف شکن بھی ہوں
بے انتہا کریم بھی ہوں سر نگن بھی ہوں | میں منکسر مزاج بھی ہوں تیغ زن بھی ہوں
کس طرح متصف ہوں نہ لاکھوں صفات سے
ہے انتظام ملک سخن میری ذات سے

گویا ہے یوں زباں مرا ہمسر کوئی نہیں | مجھ سے حجاب و شرم میں بہتر کوئی نہیں
میری طرح سے صاحب جوہر کوئی نہیں | مجھ سے نہ کام لے تو سخنور کوئی نہیں
ہر بات میں بشر کو مری احتیاج ہے
سن اے قلم کلام کو مجھ سے رواج ہے

کہتا ہے کلک میرے لئے ہے ایاغ علم | میں نے کیا زمانہ میں روشن چراغ علم
میری شمیم سے ہے معطر دماغ علم | دریا دلی سے میری ہے سرسبز باغ علم
سب جانتے ہیں وجہ بقائے بیاں ہوں میں
دست کدیور چمن بے خزاں ہوں میں

یہ قول ہے زباں کا خامے سے دمبدم | میری ہے احتیاج بہت اور تیری کم
شامل اگر نہوں تو نہ کچھ ہو سکے رقم | میرے بغیر تو بھی ہے بیکار اے قلم

بلبل اشد یہ رکھتی ہے مجھ سے ترانے میں
محتاج ہے ہر ایک زبان کے زمانے میں
کہتا ہے اب قلم یہ زباں سے بہ انکسار میری ضرورتیں بھی ہیں دنیا پہ آشکار
تحریر میں کروں تو بیاں کا ہو اعتبار میرے سبب سے ہے ترے ہر قول کو قرار
آنے نپایا فرق کبھی میری بات میں
سب ہیں قلم کے دست نگر کائنات میں
کہتی ہے یہ زبان کہ عبث کر نہ قیل و قال کیونکر کلام تو نے کئے یہ تو کر خیال
میری طرح سے اپنے بیاں کر گیا کمال اسباب کے لئے کوئی صورت نئی نکال
قوت سے میری قدر نہ اپنی بلند کر
تو اپنے حسب حال خموشی پسند کر
خامہ کا ہے یہ قول تجھے کیا خیال ہے یہ مجھ میں اسکی شان سے طرفہ کمال ہے
دعویٰ کروں زباں کا مری کیا مجال ہے لیکن مجھے خموش کرے تو محال ہے
سمجھوں شریک کیوں تجھے اپنے کلام میں
قوت کو اپنی آنے نہ دے میرے کام میں
بس اب خموش ہو تجھے لازم ہے انفعال تو ہے زباں دراز بہت او زبوں خصال
قادر ہے بات بات پہ وہ رب ذوالجلال مجھکو عطا کریم نے کی ہے زبان حال
رتبے خواص کے ہیں زیادہ عوام سے
بہتر ہے خامشی کہیں طول کلام سے
ہے یہ بیاں زباں فصاحت شعار کا سب مجھ سے ذکر کرتے ہیں پروردگار کا
کہتی ہوں حق ہے حال دل بیقرار کا دیتی ہوں ساتھ عابد شب زندہ دار کا
جو ذی حیات ہے مرا احسان مند ہے

تسبیح خواں مجھی سے ہر اک حق پسند ہے

گر میں نہوں تو علم بھی حاصل نہ ہو سکے گر میں نہوں تو حل کوئی مشکل نہ ہو سکے
گر میں نہوں تو ایک بھی قائل نہ ہو سکے گر میں نہوں تو حلِ مسائل نہ ہو سکے

جنبش ہو کیوں لبوں کو جو منہ میں زباں نہو
تفہیم نقطۂ دہنِ شاھداں نہ ہو

گر میں نہوں تو پھر نہ مقرر کا نام ہو کیونکر کوئی کسی سے بھلا ہم کلام ہو
میرے بغیر کام ہر اک ناتمام ہو کس طرح سے حصول ثوابِ سلام ہو

مجلس میں آکے کوئی کرے پھر خطاب کیا
سب لاجواب ہوں تو کوئی دے جواب کیا

میں ہوں کلید قفل دہن اہل لب گواہ ہیں ہر اک کے کام آتی ہوں میں سب گواہ ہیں
شاھد ہے علم اور مخاطب گواہ ہیں میرے بیاں کئے ہوئے مطلب گواہ ہیں

آگاہ گوش دل سے ہوں نہ کیوں ہر سعید کے
معنے سنے ہیں مجھ سے کلام مجید کے

ناطق اگر نہ میں ہوں تو انساں کوئی نہ ہو ذکر مصائب شہ ذیشان کوئی نہ ہو
میرے بغیر حق کا ثناخواں کوئی نہ ہو گر میں نہوں تو حافظ قرآں کوئی نہ ہو

باعث ثواب ذکر کلام خدا کی ہوں
میں نرد بان بلندیٔ ذہن رسا کی ہوں

دنیا میں لطف زیست کی صورت مجھی سے ہے ہر بات کی زمانہ میں زینت مجھی سے ہے
عالم میں کل علوم کی شہرت مجھی سے ہے جاری تمام علم قرات مجھی سے ہے

صحت حروف کی مرے دم سے بیاں میں ہے
ترتیل کا رواج مجھی سے جہاں میں ہے

مجھکو ہر ایک عاقل و دانا سے پوچھ لو ہر بات میں شریک ہوں دنیا سے پوچھ لو
نغموں کو میرے بلبل شیدا سے پوچھ لو مُردے جلا دیے ہیں مسیحا سے پوچھ لو
مرغوب کردگار بھی ہے التجا مری
مقبول بارگاہ صمد ہے دعا مری
قوت وہ کی عطا مجھے رب کریم نے مانا جسے ہر ایک عقیل و فہیم نے
ایسی بنائی بات غفور الرحیم نے پایا مجھی سے نام جناب کلیم نے
دیکھی مرے بیاں کی رسائی جو دور تک
حد ہو گئی کہ جل گیا خود کوہ طور تک
ہے یہ کلام اب قلم مشک بار کا ہر سو ظہور ہے مرے نقش و نگار کا
راقم ہوں حسن صانع فصل بہار کا چہرہ کشا ہوں قدرت پروردگار کا
باغ جہاں میں نقش مرے جزو کُل پہ ہیں
سو رنگ کے خطوط ہر اک برگ گل پہ ہیں
چاہا جو میں نے قطرے کو گوہر بنا دیا ذرہ کو مثل خسرو خاور بنا دیا
ضو دے کے ایک نقطہ کو اختر بنا دیا اکثر عروس نظم کا زیور بنا دیا
حرفوں کو حسن طرۂ لیلی پہ فوق ہے
جو دائرہ ہے وہ گلِ مضموں کا طوق ہے
طالب کو اپنے میں نے سخنور بنا دیا جاہل کو عالموں کے برابر بنا دیا
دے کر زر علوم تونگر بنا دیا ادنیٰ کو بادشاہ کا ہمسر بنا دیا
میں نے کب اہل علم کو رتبہ دیا نہیں
فضل خدا سے میری قلمرو میں کیا نہیں
جسکو ہے میری یاد وہ عالی خیال ہے جو میری ذات میں ہے صفت بے مثال ہے

وہ شمع ہوں کہ جسکی ضیا لازوال ہے   روشن مجھی سے مجلس اہل کمال ہے
کٹتا ہے سر تو اور بھی بڑھتی ہے ضو مری
سمجھے ہیں لوگ جسکو زباں ہے وہ لو مری

ٹھہرے تمام خلق میں ہیں جا بجا مرے   رتبے بہت بلند رہے ہیں صدا مرے
چلتا ہے کون کاغذ زر پر سوا مرے   لکھتے ہیں جنکو حرف وہ ہیں نقش پا مرے
حاصل یہ بات مجھکو خدا کے کرم سے ہے
جو فیضیاب ہے وہ مرے دم قدم سے ہے

حاصل ہے مجھکو قرب بھی رب غفور کا   میں نے کیا ہے حال رقم کوہ طور کا
سب کو نشاں بتاتا ہوں اہل قبور کا   زندہ مجھی سے نام ہے ہر ذی شعور کا
میں رہ چکا ہوں دست جناب امیر میں
تاثیر لفظ قم کی ہے میری صریر میں

میں فضل کردگار سے عالی صفات ہوں   باغ جہاں میں باعث لطف حیات ہوں
ہر علم کے لیے میں ہی وجہ ثبات ہوں   سب جانتے ہیں منتظم کائنات ہوں
چلتا ہوں پہلے لوح پہ پیک اجل سے میں
فرمانروائے خلق ہوں روز ازل سے میں

عالم پہ آشکار ہے جاہ و حشم مرا   ہر معرکہ میں رہتا ہے آگے قدم مرا
تابع ہر ایک ہوتا ہے وقت رقم مرا   چلتی ہے لے کے فوج مضامیں علم مرا
روشن مجھی سے ملک سخن میں چراغ ہے
سلطاں وہ ہوں کہ جس کا خزانہ دماغ ہے

ہوں سربلند مشک فشاں ہیں تنک بھی ہے   مجھ سے گل سخن میں ہے رنگ اور مہک بھی ہے
رتبہ میں مجھ سے پست کہیں عرش تک بھی ہے   روشن مجھی سے نام دبیر فلک بھی ہے

شاہد ہے آسماں مرا شہرا کہاں نہیں
ہے شین کی کشش کہکشاں نہیں

غزل ظرافت

نتیجہ فکر جناب سید ظریف حسین صاحب ظریف متوطن قصبہ تسہ ضلع مظفرنگر وارد حال دہلی

تمھاری چاہ مبارک رہے عدو کے لیے
اگر یہ چاہنے والے ہیں آخ تھو کے لیے

پڑھی نماز تیمم سے ہم نے دلّی میں
ٹکے کو آتی ہے بدھنی یہاں وضو کے لیے

بتائیں کیا تمھیں صرف کثیر شوق جمال
ہزار جوتیاں ٹوٹیں اک آرزو کے لیے

ازل سے تم نے نہ کی اپنے فائدہ پہ نظر
کہ جتنے چاہنے والے ہیں وہ بھو کے لیے

ملو جو غیر سے تو اس سے پوچھنا یہ بات
چکن کے چوک سے کسکے لیے شلو کے لیے

تمھارے لال کا دامن نکل گیا مریم
منگا کے سوزن عیسٰے رکھو رفو کے لیے

ظریف ہے یہ تمنا ظریف کو دیکھیں
تڑپتا رہتا ہے دل اپنا لکھنؤ کے لیے

گھریلو شاعری

محبت اپنی بیوی سے یہ دروازہ ہے ایماں کا
بھٹکنا چار سو اچھا نہیں ہوتا ہے انساں کا

ٹھلتے مارتی ہے اُسپہ بچے پیار کرتے ہیں
تعلق کسقدر گہرا ہے بلّی اور انساں کا

بہت ہی سخت ہے پردہ کے بارے میں مری ماما
ڈپٹتی ہے اگر دیوار سے بچے نے بھی جھانکا

جہاں بخیہ کیا ہے سارے دامن میں محبت سے
لگا دو اچھی بھابھی تم گریباں میں بھی اک ٹانکا

بھلا منجھلی بہو کیونکر نہ سب کے دلمیں گھر کریں
اطاعت انکی دیکھو اور غصہ نانی اماں کا

جذبۂ عشق

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن

دل بدست دگر دادن و حیراں بودن

عشق اگرچہ حکمائے متقدمین ان تین حرفوں کی بس اتنی فلاسفی کرکے خاموش ہوگئے ہیں کہ دل و دماغ کے ضعیف ہونے سے اک مرض پیدا ہو جاتا ہے جو اکثر انسان کو عمر بھر پریشاں رکھتا ہے۔ انھیں ہی ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اسکو ایک لطیف ترین جوہر شرافت کا اثر کہتا ہے مگر سچ تو یہ ہے کہ عشق کی کنہ ذات کی طرف بہت ہی کم توجہ کی گئی ہے۔ فی الاصل یہ اگر کوئی مرض ہے تو اسکے لیے کوئی نہ کوئی مداوا ہونا لازمی تھا کیونکہ تجربہ بتاتا ہے کہ دنیا میں ایسا مرض کوئی بھی نہیں ہے جسکی دوا نہ ہو۔ بخلاف عشق کے کہ اکثر اسکے مریضوں کو مجنوں اور لاعقل تصور کرکے لاعلاج چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جو ان کے لیے اُلٹا اثر پیدا کرنے والا ہوتا ہے۔ تذکرۂ بالا جملے کا یہ جواب ہو سکتا ہے کہ جب کلیہ یہ ٹھہرا کہ ہر مرض کی کوئی دوا ہے تو عاشق کے لیے بھی اُسکی معشوق کا وصال بہترین نسخہ ہے۔ مگر ہم لکھ آئے ہیں کہ دنیا میں دوا کا پیدا ہونا لازمی ہے حالانکہ ایسا نہیں۔ مثال کے لیے لیجیے کہ ایک شخص عاشق الٰہی ہے کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی حکیم کوئی طبیب اُس دوا کو اُسکے لیے مہیا کر سکے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ بلکہ اس مثال میں ہمیں ایک نئی بات پیدا کرنی پڑے گی۔ کہ عاشق الٰہی کی دوا۔ دنیا میں ملنا ناممکن ہے۔ کسی طبیب سے اُسکا مداوا محال ہے کیونکہ سبب ہے اُسکا علاج۔ یعنی وصال الٰہی مشکل ہے۔ البتہ یہ درد عشق ہی اُسکی دوا ہو جائیگا اگر ممکن ہے تو یہی ممکن ہے کہ جوں جوں عشق الٰہی ترقی کرتا جائے گا۔ اور صفات

اور ذات واجب الوجود میں عاشق صادق کو انہماک اور استغراق ہوتا جائے گا۔ اُسی طرح وہ اپنے معشوق حقیقی سے قریب ہوتا رہے گا۔ گویا اس جگہ ہمیں مرزا غالب کا شعر ماننا پڑے گا ؎

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا　　درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

تو اس سے ثابت ہوا کہ کبھی کبھی درد بھی درد کی دوا ہو جاتا ہے۔ اور یہ غیر ممکن ہے۔ اور اس سے دور لازم آتا ہے۔ اسکو ختم کرنیکے بعد ہم دوسرے مقولہ پر نظر ڈالتے ہیں کہ عشق شرافت انسانی کا ایک بہترین جذبہ ہے" اگر اسکو تسلیم کر لیا جائے تو اس بات پر بھی نظر ڈالنی ضروری ہوگی کہ عوام الناس انکے اس قولہ کو کیوں تسلیم نہیں کرتے اور وہ ایسے اشخاص کو جنکے جذبات بہترین شرافت انسانی تسلیم کیے گئے ہیں بیکار اور لاشئے سے کیوں تعبیر کرتے ہیں اور کیوں عاشقوں کی کوئی وقعت نہیں۔ کیوں اسکی باتیں دیوانہ پن کی بے تکی بڑ ہیں۔ اُنکے کام لاأبالی۔ اُنکے حرکات مجنونانہ تصور کیے ہیں۔ آخر یہ کس الزام پر۔ کیا خارج میں کوئی دوسری مثال بھی ایسی مل سکتی ہے کہ انسان اپنی کسی انتہائی شرافت کے جذبہ کے استعمال سے مجنوں اور سودائی کہلانے کا مستحق ہو۔ ممکن ہے کہ اسپر یہ خیال کیا جائے کہ عشق اختیاری شئے نہیں ہے اور انسان کی عزت اور وقعت اُسی ہنر اور اُسی شرافت کے اعلےٰ جوہر کی وجہ سے کی جا سکتی ہے جو اختیاری ہو۔ اور جو مادّہ اختیاری نہیں ہے وہ کچھ اہمیت نہیں پا سکتا اور اہل جہاں اُسکو وقعت نہیں دے سکتے۔ اگر ایسا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اسی ایک خاص صفت کے ماسوا اور صفات انسانی کے جو فطرتاً اور خلقتاً نیچر کی طرف سے اُسے عطا ہوئی ہیں کیوں انسانیت کا بہترین جزو تسلیم کی جاتی ہیں۔ مثلاً شاعری کو لیجیے ظاہر ہے کہ شاعری ایک ایسا مادّہ اور ایک ایسا علم ہے جو سکھانے سے نہیں آتا بلکہ قدرت کے فیاضانہ جود و عطا کے

سبب اس کو تفویض ہوتا ہے۔ یا بہ الفاظ دیگر یوں کہیے کہ ایسا مادہ ہے جو خود بخود امڈا آتا ہے مگر یہی شاعری اگر کسی میں حدِ کمال کو پہنچی ہوی ہے اگر کسی شاعر کو یہ قدرت حاصل ہے۔ کہ وہ اپنے ایک مصرعہ یا اپنے ایک شعر یا ایک نظم سے سامعین کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے اگر اُسمیں یہ طاقت ہے کہ وہ انسان کے غصے اور ترحمانہ صفات کو جوش میں لا سکتا ہے تو وہ صرف قابل عزت ہی نہیں بلکہ اپنی قوم اپنے ملک وغیرہ کی نظروں میں عزیز تر مانا جاتا ہے ما اینکہ کلیہ بالا کے لحاظ سے عوام یا خواص کی طرف سے اسکے واسطے یہ محبت کا استعمال صحیح نہیں ہے۔ ایسے ہی اور بہت سی مثالیں موجود ہیں مگر آہ عاشق ان سب باتوں سے محروم ہے تو ہمیں ضرور فرض کرنا اور ماننا پڑیگا کہ عشق ان دونوں شے میں سے کچھ نہیں ہے وہ کوئی اور ہی چیز ہے جو ہمارے حواس خمسہ کے حدود سے باہر۔ اور بالا ہے۔ ان دونوں باتوں سے عشق کا بری ہونا۔ ہمیں یہ جرأت دلاتا اور ہمیں یہ صلاح دیتا ہے کہ ہم عشق کی ہستی ہی سے انکار کردیں۔ مگر ساتھ ہی جب یہ ارادہ کرتے ہیں تو دلی احساس یہ بھی نہیں کرنے دیتا۔ کیا معنی کہ سریلی آواز خوشنما چیز خوبصورت انسان کو دیکھکر کوئی شے کانٹے کی طرح ہمارے دل میں کھٹک جاتی ہے جس سے مجبور ہو کر کچھ دیر کے لیے دل و جگر پر ہاتھ رکھنے پڑتے ہیں۔ مگر ہماری سماعت اور بصارت اور ہماری تمام قوتیں اسکو دیکھ سُن۔ اور پا نہیں سکتیں۔ کہ وہ شے کیا ہے اور کیسی ہے۔ ہاں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔

خامشی بے سبب نہیں غالبؔ کچھ تو ہے جسکی پردہ داری ہے

اور یہ حالت ایک انسان ہی کی ذات تک محدود نہیں ہے۔ ذوی العقول کے سوائے غیر ذوی العقول۔ اور غیر ذوی العقول کے سوائے غیر ذی روح تک اسکے اثر اور اس جذبہ سے بری نہیں ہیں۔ بچہ لا یعقل محتاج۔ بے اختیار پیدا ہوتا ہے اُسوقت ظاہرا سوائے تکلیف شاقہ کے کوئی بہتری کی اُمید اُسکی ذات سے نہیں کی جا سکتی مگر

کوئی شے ضرور ایسی ہے کہ ماں باپ کو مجبور کر کے اُسکی بزرگ داشت پر معین کر دیتی ہے بچے کی تکلیف ان کی تکلیف اور بچے کی راحت انکی راحت ہو جاتی ہے اسمیں اتنی گنجایش باقی ہے کہ کہدیا جاے یہ ساری باتیں اُس سے آیندہ کی بہتری۔ اور مستقبل کے نوح کی امید کراتی ہے مگر جب غیر ذوی العقول جانوروں کی طرف نظر ڈالتے ہیں تو اسوقت یہ کنیہ بھی باطل اور بے معنی ثابت ہوتا ہے کیونکہ ظاہراً اُنھیں کوئی ایسی اُمید نہیں ہے جس میں ان کی آیندہ کی بہتری متصور ہو۔ کیونکہ ساری اُمیدیں صرف عقل پر منحصر ہیں۔ وہاں عقل کا لطیفہ جوہر ہی موجود نہیں۔ تو پھر امید کیسی اس رتبہ اور اس درجہ سے بھی بالاتر وہ درجہ ہے جو انھیں لایعقل جانوروں میں ہمیں نظر آتا ہے ممکن ہے کہ بچے کا عشق اُسکی نگہداشت صرف اسوجہ سے کیجاتی ہو کہ وہ ایک مدت معینہ کی تکلیف کا ثمرہ اور اپنا جزو بدن ہے۔ مگر جب ہم چکور کو چاند پر دوڑتے۔ بلبل کو گُل کی طرف بار بار چکّر لگاتے۔ بھونرے کو کلیوں کے اردگرد منڈلاتے دیکھتے ہیں تو یہ خیال بھی کافور ہو جاتا ہے اور فوراً سمجھ میں آتا ہے کہ یہ بزرگداشت یہ حفاظت وغیرہ نہ اپنے جزو بدن کے لحاظ سے ہے نہ محنت کے سبب ہے۔ بلکہ کوئی اور نشتر ہے جو بار بار دل میں چبھتا ہے۔ اس سے زیادہ تعجب انگیز وہ جذبہ ہے جو غیر ذی روح میں پایا جاتا ہے۔ سورج مکھی کا سورج کے رُخ پر پھرنا کنول کے پھول۔ یا گُل نیلوفر کا چاند کی صورت دیکھتے ہی خوشی سے کھِل کھِلانا چاند کو دیکھتے ہی کتاں کا پارہ پارہ ہو جانا۔ کاہ و کہربا کا عالم۔ مقناطیس کی کشش وغیرہ وغیرہ ایسی باتیں ہیں جنھیں دیکھکر کامل یقین ہوتا ہے کہ کچھ دال میں کالا ہے اور۔ کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں۔ ہم ایک درخت کے ہرے بھرے پودے کو ایک خشک جگہہ سے کھود کر نہایت احتیاط کے ساتھ کسی کھاد کی جگہہ لگا دیتے ہیں۔ اور جسقدر خدمت ہم سے ہو سکتی ہے کرتے ہیں۔

مگر کچھ مدت گذرے بغیر وہ پودا سرسبز و شاداب نہیں ہوتا بلکہ بعض اشجار سوکھ جاتے ہیں حالانکہ جس جگہ یہ اب ہے وہ جگہ اسکے لیے پہلی جگہ سے ہر طرح موزوں اور مناسب ہے۔ مگر لاکھ تدبیر کریں وہ چند روز بغیر نشو و نما کے اُداس کھڑا رہے گا۔ ثابت ہوا کہ اسے اُس پہلی جگہ سے کوئی نہ کوئی خاص لگاؤ تھا جس سے جدا ہونا اسے بیحد شاق گذرا۔ اسی فن باغبانی کے جاننے والے لوگ ان گھڑت باتوں سے بہت سا حاشیہ چڑھا سکتے ہیں مگر ہم اسلیے اوپر ہی لکھ آئے ہیں کہ نہایت احتیاط سے اکھیڑا جائے کہ اُسکے تنہ اُسکی بیخ و بُن کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اُسے اپنی پرورش کے لیے پہلے سے بہتر ساماں میسر ہو۔ بہرحال معلوم ہوگیا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ مگر وہی شے دل سے زبان تک نہیں آسکتی قوت مدرکہ اُسکو پاتی ہے مگر کوئی قوت اسکے بیان اور دوسروں کو وہ کیفیت دکھانے کے قابل نہیں ہے۔

ایک زبردست حکیم کا قول ہے کہ یہ درجہ انسان کو اُسوقت نصیب ہو سکتا ہے جب حواس خمسہ کی محدود آگاہی سے بالا ہو۔ مگر یہ درجہ نصیب ہونا مشکل ہے جنھیں کسی طرح حاصل بھی ہوگیا وہ اسکے بیان کرنے سے قاصر ہیں ؎ آنرا کہ خبر شد خبرش باز نیامد۔ اسی عشق کا ایک نام محبت بھی ہے جسے مذہب و ملت نے بھی ضروری مانا ہے اور فی الاصل اگر اُسکو ضروری نہ تسلیم کیا جائے تو دنیا سے ہمدردی اُٹھ جائے اور فوراً نظام عالم درہم و برہم نظر آئے۔ پہاڑوں کا زمینوں پر دباؤ۔ سبزہ اور اشجار کا زمین پر لہلہانا یہ سب باتیں ایسی ہیں جیسے عشق کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر یہی عشق جب تک بیغرضانہ ہے عشق اُسکا نام ہے جسوقت کہ اس درجہ سے نکلکر کسی غرض میں شامل ہوگیا وہ عشق نہیں۔ رہی یہ بات کہ عشق کیونکر پیدا ہوتا ہے اسکے اسباب ظاہر میں کسی اچھی شے کے دیکھنے۔ یا سُننے سے عشق کا دلمیں پیدا ہو جاتا ہے۔ جس شے کا اثر دل پر پڑے وہ معشوق کے نام سے تعبیر کی جائے گی۔

(باقی آئندہ)

عبدالباری آسی

غزلیات

مولانا صفی صاحب لکھنوی مدظلہ العالی

وہ آئیں گے یہ قیامت تک اعتبار نہ تھا
سکون دل کا بہانا تھا انتظار نہ تھا

فقط مقدمہ اضطراب دل تھا سکون
جسے قرار سمجھتے تھے وہ قرار نہ تھا

بہار آنے سے پہلے بھی دل ہی تھا مگر
جنوں کے ناخن سرتیز سے فگار نہ تھا

جھلک رہا تھا وہ کیفیت شباب کا رنگ
نشیلی انکھڑیوں میں یار کے خمار نہ تھا

اک آبلہ سا جو دل ہو رہا ہو سینہ میں
وہ اسطرح سے فلک لائق فشار نہ تھا

گناہگاروں کو پوچھا جب اُسکی رحمت نے
بہت خفیف ہوا جو گناہگار نہ تھا

ہوائے کوچۂ جاناں ذرا ادھر آئی
ادھر ہمارے دل تنگ میں غبار نہ تھا

وہ دل جو تھا بھی تو کیا تھا ہمارے پہلو میں
جب اُسپر زور نہ تھا کوئی اختیار نہ تھا

ہزار شکر کہ شبنم نے آبرو رکھ لی
کوئی بھی گور غریباں پہ اشکبار نہ تھا

پڑھا نہ فاتحہ احباب نے کبھی آکر
مگر مزار ہمارا صفی مزار نہ تھا

کل ہم آئینہ میں رُخ کی جھرّیاں دیکھا کیے
کاروانِ عمر رفتہ کے نشاں دیکھا کیے

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کیے
آشیاں اُجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کیے

بستیاں ویراں ہوئیں آباد ویرانے ہوئے
شعبدے تیرے یہی اے آسماں دیکھا کیے

ہوں نہ یارب دیکھنا دشمن کو بھی وہ دن نصیب
جو فراق یار میں ہم نیم جاں دیکھا کیے

دل تہ و بالا جو تھا سودائیاں زلف کا
گہ زمیں دیکھا کیے گہ آسماں دیکھا کیے

جب اسیر دام ہو کر ہم چلے سوئے قفس
دور تک مڑ مڑ کے اپنا آشیاں دیکھا کیے

چشم ہمدردی صفی جن سے تھی وہ بیٹھے ہوے
اشک کی جا خون انکھوں سے رواں دیکھا کیے

فخر المتقدمین و متاخرین ابو معظم نواب سراج الدین احمد خاں صاحب۔ سائل دہلوی داماد حضرت فصیح الملک داغ

اصول کائنات عاشقی ہے داستاں میری
پھر انداز بیاں میں خوبی طرز بیاں میری

کبھی ہونٹوں پہ پپڑی ہے کبھی آنکھوں میں آنسو ہیں
چھپاؤں کیا پریشانی ہو صورت سے عیاں میری

مرے دست جنوں کی چارہ گر بھی داد دیتا ہے
کہ پوری پوری سب زخموں پہ آئیں دھجیاں میری

بہار جامۂ گلگوں نہیں دیکھی تو اب دیکھو
کھلا دیتی ہے کیا گل لالہ چشم خونفشاں میری

مرا احوال یوں کہدے تو کہدے نامہ براں سے
دہن میں کاٹ کر اپنے لگا لے گر زباں میری

ادھر گلچیں کی نیت ہے ادھر صیاد کی نظریں
جھکی جاتی ہے بار گل سے شاخ آشیاں میری

ملاقاتوں کی شکلیں ہیں یہ اپنی اپنی مرضی ہے
جہاں تیری وہاں تیری جہاں میری وہاں میری

مرے دل میں ہی رہنے دو شکایت ہاے دشمن کی
نہ رسوا ہے جہاں تم ہو نہ کھلواؤ زباں میری

وہ کہتے ہیں کہ بدلو نام سائل ورنہ تم جانو
نبھے گی تم سے مشکل سے سراج الدین خاں میری

جناب مرزا ثاقب صاحب قزلباش لکھنوی مدظلہ العالی

ہمت شکن جہاں میں جفا ہے جمال کی
ہوتے ہی عشق پڑ گئی عادت سوال کی

میں اور صبح ہجر یہ تمنا محال کی
جتنی مری حیات بشب اتنے ہی سال کی

اک کیف بیخودی میں کٹی شب وصال کی
اچھا ہوا خبر نہ ہوی اپنے حال کی

ممنوں لطف خانہ بدوشی ازل سے ہوں
جس جا پہنچ گیا وہی منزل خیال کی

شاکی ہیں خاک ڈالنے والوں کے اہل قبر
مٹی میں دب گئی ہے خبر انکے حال کی

ہے کون سا یہ صید کہ دم توڑتا ہے یوں
صیاد لوٹتی ہیں رگیں تیرے جال کی

ہر قطرہ خون دل کا ہے قاتل سے نذر دار
یارب دراز عمر ہو دریۂ سوال کی

روک اپنی آہ گرم کو بس عندلیب بس
اُڑنے لگی ہے باغ سے سبزی نہال کی

تارِ کفن بھی گل گئے کیا جاؤں حشر میں
اے دل تو ہی اوڑھا دے ردا انفعال کی

جز رنج و غم کچھ اور نہ دیکھا تمام عمر
راحت بھی تھی مگر وہی خواب و خیال کی

برباد میرے بعد نہ ہو کائناتِ دل
کوئی جگہ نکال دو میرے ملال کی

بند آنکھ کر کے بیٹھ کہ پہلو میں دل رہے
عالم نظر فریب ہے دنیا ہے چال کی

رہنے کو آشیانہ بنایا تو کیا ملا
تنکوں نے مل کے کھینچ دی تصویر جال کی

ٹھوکر سے خاک میں بھی ملا دو تو خوب ہے
مٹی نہ ہو خراب دلِ پائمال کی

غش کا پیام ضعف میں لائی نسیم صبح
ٹھنڈی ہوا نے اور طبیعت نڈھال کی

برسوں سے صاف کرتا ہوں اشکوں سے لوحِ دل
تصویر چاہتا ہوں رُخِ بے مثال کی

خود رفتگیِ عشق میں کیا کام دل سے لوں
گم ہیں حواس بند ہیں راہیں خیال کی

طے کر رہا ہوں کب سے تجھے اے شبِ فراق
اب کتنی دور رہ گئیں راتیں وصال کی

سجدے میں جا کے سر کو اُٹھانا پڑا مجھے
رحمت نے بات رکھ لی مرے انفعال کی

ہر رگ لہو اُگلتی ہے منھ اپنا کھول کر
اک زخم ہو تو فکر کروں اندمال کی

اُترے ہوئے ہیں قافلۂ ہستی و عدم
ثاقب عجب وسیع ہے منزل خیال کی

محفل سنوار لی مرے دل نے خیال کی
تصویر کھینچ کر ترے حسن و جمال کی

حیران ہوں کدھر سے بلا آئی جال کی
دھوکا دیا زمیں نے کہ گردش نے چال کی

کب سے ہے غم خبر نہیں کچھ ماہ و سال کی
گنتا ہوں ایک عمر سے گھڑیاں ملال کی

سب کو ہے تیرے ساتھ خبر میرے حال کی
یا داستان عشق کی ہے یا جمال کی

اپنا سا زور کر کے تھکے منعماں دھر
مٹھی نہ کھل سکی مرے دست سوال کی

اچھے نصیب تھے کہ گلستانِ دہر میں
دو دن کی زندگی بھی غموں نے وبال کی

داغِ چمن کے ساتھ ہزاروں ہی زخم ہیں — دل میرا چھان ڈالا ہے چادر نے جال کی
یادِ مریض ایک مرض ہے خدا بچائے — بھولے سے پوچھیے نہ خبر میرے حال کی
اتنا بدل دیا تھا مرا رنگ ہجر نے — منھ دیکھتی رہیں مرا راتیں وصال کی
سُنیے کہ جاگ جاگ کے برسوں کیا ہے یاد — یہ داستان غم نہیں خواب و خیال کی
ہاں پائے حرص روک کے قارون کے سر کو دیکھ — کشتی زمیں میں ڈوبتی جاتی ہے مال کی
جس دل میں زخم تھے وہ لہو ہوکے بہہ گیا — اچھا ہوا خلش تو مٹی اندمال کی
تم کو جواب دینے لگا کیوں خرام ناز — سبزہ تھا یہ۔ کہ قبر کوئی پائمال کی
آؤ تو ہم دکھائیں تمھیں اک نیا جہاں — آباد ہے خیال میں دنیا مثال کی
الزام قید سب ہوس زندگی پہ ہے — صیاد کی نہ کوئی خطا ہے نہ جال کی
یکجا ہوے ہیں دور سے آ آ کے اہل قبر — دل ہو تو دیکھ آئیے محفل خیال کی
کس سنگدل کا در ہے کہ ملتا نہیں جواب — ٹکرا کے پھر رہی ہیں صدائیں سوال کی
بھر جائینگے کبھی نہ کبھی خاک قبر سے — زخموں کو احتیاج نہیں اندمال کی
بدلا مزاج دہر۔ مٹا دل تھکے طبیب — حالت وہی رہی مرض لازوال کی
اوراقِ شام غم شبِ تربت سے جا ملے — آخر کتاب ختم ہوی میرے حال کی
کیوں آؤ۔ دور ہی سے سنو میری سرگذشت — تم کو خدا دکھائے نہ صورت ملال کی
کچھ آگے بڑھ چلے ہیں شفیعان روز حشر — تاثیر تو ضرور ہوی انفعال کی

پہنچا دیا کلام کو ثاقب نے عرش پر
تقلید کر کے میرے صاحب کمال کی

جناب منشی سید وحید الدین احمد صاحب بیخود دہلوی مدظلہ العالی

پامال نقش کیوں نہو مجھ خستہ حال کی — تعلیم دے رہے ہیں قیامت کو چال کی
کھٹکے گی بعد مرگ بھی حسرت وصال کی — نکلی نہ تم سے پھانس کسی خستہ حال کی

رہ رہ کے یاد آئی ہے شوخی جو چال کی — مٹ مٹ گئی ہے قبر ترے پائمال کی
ہمکو نہیں ہے تجھ سے ضرورت سوال کی — خود منھ سے بولتی ہے تمنا وصال کی
آئینہ کیا بتائے گا مجھ سے ملاؤ آنکھ — میری نظر کسوٹی ہے حُسن و جمال کی
ہم کیون یہ سمجھیں ہم بھی ہیں عالم میں ہم کہاں — اپنا خیال ہی غلطی ہے خیال کی
پھرے لگے ہوئے ہیں تصور میں غیر کے — رہتی ہے روک ٹوک ہمارے خیال کی
پردے کی بات کے لیے پردہ ضرور تھا — پہلو میں دل ہے دلمیں تمنا وصال کی
اے دل ہماری بات سُنے اب تری مجال — ہے دُھن لگی ہوی تجھے اُنکے وصال کی
ارمان وہ نکالنے آئے ہیں نزع میں — کیا لوٹ مچ رہی ہے مسافر کے مال کی
دل میں وفا ہے درد ہے الفت ہے سوز ہے — فہرست لکھ رہا ہوں یہ میں اپنے مال کی
غصے میں بھی تو اس نے نچھوڑی ادائے حُسن — ماتھے کی ہر شکن میں ہے صورت ہلال کی
ہم نے جتا دیا تھا کہ دشمن ہے بے وفا — تم سمجھے اس نے جوڑ چلا اس نے چال کی
برسوں رہے ہیں حضرتِ موسیٰ کے ہوش گم — دیکھی تھی اک جھلک ترے حُسن و جمال کی
بچنا تمام عمر تم اس فاقہ مست سے — دیکھو عدو کی آنکھ ہے بھوکی جمال کی
دل میں کبھی چھپے کبھی آنکھوں میں چھپ گئے — ہوتی ہے اُن سے آنکھ مچولی خیال کی
تم چھپ کے سات پردوں میں مجھسے نہ چھپ سکے — آنکھوں سے دور ہیں ہیں نگاہیں خیال کی
جو ابتدا میں رنگ تھے وہ انتہا میں ہیں — تفریق عشق میں نہیں ماضی و حال کی
میں کشتۂ نگاہ تغافل شعار ہوں — پرسش نہو گی حشر میں بھی میرے حال کی
سب بھید اُسکے کھول لیے جس سے جا ملی — اس شوخ کی نگاہ بھی ہے کس کمال کی
کچھ اس ادا سے وصل میں روٹھے ہیں آج وہ — برسوں رہے گی ہم کو تمنا ملال کی
دھوکے میں پہلے حضرت واعظ نے پی تو مے — جب نشہ کھل گیا تو بہت قیل و قال کی
ہم تجھ سے اور تیرے سوا کیا طلب کریں — منظور کب ہے قدر گھٹانی سوال کی

یہ ابر یہ ہوا یہ جوانی یہ فصل گل
زاہد ابھی سے تجھکو پڑی ہے مآل کی

ظلم و ستم کے شکوہ پہ شوخی تو دیکھیے
صورت بنائے بیٹھے ہیں وہ انفعال کی

ویران کرکے دل کو اسے ڈھونڈتے ہیں ہم
صحرا میں جستجو ہے رمیدہ غزال کی

بچتا مریض ہجر کا کچھ کھیل تو نہ تھا
برسوں رہا علاج بہت دیکھ بھال کی

جو تجھ پہ مٹ گئے جنھیں تو نے مٹا دیا
وہ لوگ لوٹ لے گئے دولت وصال کی

کچھ ابکے گر کے برق نے تنکے جلا دیے
کچھ آگ آشیانے میں تھی پچھلے سال کی

بیخود کی خامشی کا سبب ان سے پوچھیے
اسکو تو کچھ خبر ہی نہیں اپنے حال کی

آغا غلام حسین ارشد قزلباش مدظلہ العالی

ہوں وہ مجنوں جسے فکر سر و ساماں ہی نہیں
غیر از چاک جگر چاک گریباں ہی نہیں

تھا کبھی حسن بتاں سے جو پرستاں جہاں
آج اس دل سا کوئی خانۂ ویراں ہی نہیں

زخم شمشیر زباں زخم سناں سے بھی ہے تیز
یہ وہ ہے درد کہ جو قابل درماں ہی نہیں

ہے عبث فکر مداوائے دل زار حکیم
عشق کا درد تو منت کش درماں ہی نہیں

کنج خلوت کے برابر نہیں جلوت کے مزے
ساز یہ وہ ہے جسے حاجت ساماں ہی نہیں

اثر نالۂ شبگیر ہو پیدا کیونکر
اب وہ پہلو میں ہمارے دل نالاں ہی نہیں

واہ رے ضبط کہ دل غنچہ صفت خوں ہے مگر
کوئی دیکھے تو یہ سمجھے کہ پریشاں ہی نہیں

ہے وہ پہلی سی کہاں کیفیت جوش جنوں
اب وہ لیلا نہیں وہ قیس و بیاباں ہی نہیں

ذبح بے تیغ کیا انکی ادا کے میں نثار
اور اس ناز کے قرباں کہ پشیماں ہی نہیں

کیا کریں اس بت کافر سے نبھائیں کیونکر
جسکو کچھ پاس وفاداریِ پیماں ہی نہیں

کیا ہوا دل ہے اگر محو جمال خوباں
بندۂ حسن پریزاد سلیماں ہی نہیں

ہاتھ پھیلا کے جنوں عشق میں یہ کہتا ہے
جو نہیں چاک وہ عاشق کا گریباں ہی نہیں

کیا وہ آکر مرے تابوت کو کاندھا دیگا — جس ستمگار کا دل خوگرِ احساں ہی نہیں
واے ناکامیِ قسمت کہ وہ آئے لیکن — ضعف سے قوّت پابوسیِ جاناں ہی نہیں
زخمِ دل ڈھونڈھ رہا ہے کوئی سامانِ طپش — دستِ قاتل میں مگر آج نمکداں ہی نہیں
اپنی ہُو حق ہی کیا کر تو خدا کے بندے — تجھکو صوفی خبرِ مستیِ رنداں ہی نہیں
مفت میں اسکو تڑپنے کا مزا ہی کیا ہے — جس کلیجے میں ترے تیر کا پیکاں ہی نہیں
ہے وہ پتھر نہیں جس دلکو بتوں کی الفت — بندۂ عشق نہیں ہے جو۔ وہ انساں ہی نہیں
چمنِ دہر کے نظارہ کو نرگس کی طرح — پاس کچھ اپنے بجز دیدۂ حیراں ہی نہیں
محرمِ ذوقِ تبسم ہو تو کیا غنچۂ دل — واے قسمت کہ میسر لبِ خنداں ہی نہیں
عندلیب اپنا کہیں اور ٹھکانا کرلے — ناز تھا جسپہ تجھے اب وہ گلستاں ہی نہیں
ہوں وہ شبنم کہ فنا ہوتا ہوں میں آپسے آپ — تابشِ منتِ خورشیدِ درخشاں نہیں نہیں
ہے تری تیغ کے مانند جہاں تشنۂ خوں — اک مری جان کا دشمن ترا درباں ہی نہیں

رازِ الفت کا نہ دو دن بھی چھپایا ارشد
تجھ سا کمبخت جہاں میں کوئی ناداں ہی نہیں

عرضداشت

جناب مرزا ثاقب صاحب قزلباش لکھنوی مدظلہ العالی

جانشینی میر و غالب کی کہاں اور میں کہاں
وہ خدائے فن تھے اُنسے مجھکو نسبت کچھ نہیں

ہوگئے مشقِ سخن کرتے ہوئے پینتیس[۳۵] سال
اور ابتک حاصلِ رنج و مشقت کچھ نہیں

دوست اپنے حسنِ ظن سے مجھکو جو چاہیں کہیں
واقعہ یہ ہے کہ مجھ میں قابلیت کچھ نہیں

آپ نے مجھکو بُرا سمجھا بہت اچھا کیا
آپ نے تعریف کی تو اسکی حاجت کچھ نہیں

نازشِ فن کیا ہے کہتے ہیں کسے دعوائے نظم
اعتراف بے سوادی ہے رعونت کچھ نہیں

آگیا ہوگا کہیں سے میر و غالب کا مذاق
اپنے دلمیں تو بجز ذوقِ جہالت کچھ نہیں

خاطرِ عزلت گزیں ہے دشمنِ نام و نمود
مرمٹی ہے جسپہ دنیا اُس سے رغبت کچھ نہیں

اپنے لطفِ طبع کے باعث ہے شغلِ شاعری
آپ خوش ہوں سنکے اسکی بھی ضرورت کچھ نہیں

چپ رہی محفل تو شانِ بے کمالی کیا گھٹی
واہ واکا غل ہوا بھی تو فضیلت کچھ نہیں

جوہرِ قابل ہے ۔ جسکو مان لیں اہلِ مذاق
خود وحیدِ عصر بن بیٹھے تو عزت کچھ نہیں

مجھکو دنیا نے نہ پہچانا ۔ غنیمت ہے یہی
شکر ہے اس ناشناسی کا شکایت کچھ نہیں

ذوقِ فطری چھیڑتا ہے جب تو کہہ لیتا ہوں کچھ
وہ بھی جز افشائے اسرارِ محبت کچھ نہیں

دل نے سمجھایا مجھے ثاقب یہ مفہومِ خطاب
دوستوں کی بذلہ سنجی ہے ۔ حقیقت کچھ نہیں

خیر مقدم ہے "تمدّن" کا بھی لازم اسجگہ
یہ تو اپنا ہی جگر ہے اجنبیت کچھ نہیں

اے خوشا اقبالِ ما ۔ خوش آمدی ۔ خوش آمدی
یہ نہ کہنا لکھنؤ کو ہمسے الفت کچھ نہیں

ہائے تم کب آئے جب اپنا بھرا گھر لٹ گیا
خاک اُڑتی ہے یہاں سامانِ راحت کچھ نہیں

خیر آؤ ۔ ہم بھی ہیں موجود خدمت کے لیے
پیشکش ہے نقدِ دل حاضر میں حجت کچھ نہیں

ساتھ اصولاً کسی بات میں اختلاف نہیں کیا۔ خواہ وہ امور عبادات سے تعلق رکھتے ہوں یا معاملات اور احکام جزاو سزا سے۔ بلکہ بہت غور و خوض اور تجربہ کے بعد مجھے تو یہ ثابت ہوا ہے کہ اس مذہب کی بنیاد دیگر مذاہب سے کہیں بڑھکر پائیدار اور قوی اصولوں پر رکھی گئی ہے کیونکہ دین مسیحی جو اسلام سے صدیوں پہلے دنیا میں ظاہر ہوا۔ اور بہت زور شور کے ساتھ پھیل بھی چکا تھا۔ کچھ ہی عرصہ بعد دنیا میں اپنے نام لیواؤں کی جمعیت عظیم کو اس حالت میں چھوڑ گیا کہ اُنھوں نے اُس مذہب کو بالکل ترک کر دیا اور اسکے زرّیں اصول کے خلاف عملدرآمد کرنے لگے تھے۔ گو وہ جہالت اور تاریکی کا زمانہ تھا لیکن جوں ہی اسلام کی شعاعیں عالم معمورہ میں پھیلیں طبیعتوں نے اُنھیں ذوق و شوق سے قبول کرنا شروع کر دیا جس شخص کو یہ معلوم ہے کہ مذہب اسلام کے ابتداءً ماننے والے وہ لوگ تھے جو فہم و فراست اور زباں آوری میں دنیا کی تمام معاصر قوموں پر فائق۔ شاعرانہ خیالات کے سب سے بڑے مرد میدان اور اعلےٰ درجہ کے ذہن و ذکاوت میں فرد تھے۔ وہ لامحالہ کہہ اُٹھے گا کہ اس پاکیزہ دین کے حقائق پر ایک غائرانہ محققانہ و منصفانہ نظر ڈالنا ہر شخص کا فرض ہے۔

چونکہ مجھے مذاہب عالم کی تحقیقات کا خاص طور پر شوق تھا۔ اور میں اِس بارہ میں لوگوں کی زبانوں سے سُنی سُنائی باتوں پر وثوق نہ کرکے اُن مذاہب کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتا۔ اور ان سے ذاتی رائے قائم کرنے کے واسطے مصالحہ بہم پہنچاتا تھا اس لیے مَیں نے فارس کے ایک مشہور زبردست عالم سید حسن بزرگ سے مدد لی۔ جنسے میں شہر خراسان میں ملا تھا۔ اور ہم دونوں میں نہایت گہری دوستی ہو گئی تھی۔ کیونکہ اُنھوں نے معقول بحث کے ذریعہ سے میرے خیالات اور حالات کا پتہ لگایا تھا۔ نہ کہ عیب جو جاسوس بن کر۔ بدیں وجہ

میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کی شناسائی میری خوش قسمتی کا باعث ہوی۔ میں ان کی خدمت میں پورے ڈیڑھ سال تک رہا۔ اس اثنا میں ہمارے مابین بہت سے اسلامی مسائل پر بحث ہوا کرتی تھی۔ اور اُن مباحثات کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اس بات کو بخوبی سمجھ گیا کہ مذہب اسلام صرف ایک خدا کو پرستش کے قابل بتاتا ہے۔ اور توحید باری کے ایسے قوی دلائل پیش کرتا ہے جن کو مسیح علیہ السلام کے متبع لوگ بالکل جانتے بھی نہیں نیز یہ کہ اسلام حضرت موسیٰ اور حضرت عیسےٰ (علیہم السلام) کی نبوت کا اقرار اور انکی تعظیم بدرجۂ غایت کرتا ہے۔ وہ اگلوں کے قصے پچھلوں کو صحیح صحیح اور بوضاحت سُنا کر بدیوں پر معقول عبرت انگیز سزائیں تجویز کرتا ہے اور اُن باتوں کا مرتکب فوراً اُن سے متنفر ہو کر نیکیوں کا شیدا بن جاتا ہے۔

یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اسلام پاکیزگی ظاہر و باطن۔ مروت اور جوانمردی کا مذہب ہے۔ وہ اپنے پیرووُں کو اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ جبتک دوسرا آدمی تمکو نہ ستائے۔ تم اُسپر ہرگز کوئی جفا نہ کرو۔ وہ شجر علم کی خوشہ چینی کا حکم دیتا ہے چاہے وہ درخت آباد دنیا کے انتہائی گوشہ پر ہی کیوں نہ ہو۔ اسکے علاوہ مذہب اسلام محتاجوں اور مسافروں کی خبرگیری۔ یتیموں پر مہربانی اور بددیانتی اور دروغگوئی سے بچنے کا حکم دیتا ہے۔

ہاں میں اس بات کا انکار نہیں کرتا کہ خوبیوں کی مشترک روح جیسی مذہب اسلام میں ہے ویسی ہی اور مذاہب میں بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ اسلام میں فلسفہ عمرانیہ کا باب بہ نسبت اور ادیان کے کہیں بڑھکر وسیع ہے۔

اور چونکہ انسان کو اپنے عمرانؔ کے آغاز۔ اُبھار۔ اور اُٹھان کے زمانہ میں ہر ایک چیز کے مطالعہ اور جانچ کی طرف توجہ ہوتی ہے اور وہ دنیا کے اسرار پر اس نظر سے

[1] مذہب کی وہ اصولی خصوصیات مراد ہیں جو قوم کے بننے اور ترقی کرنے میں موثر ہیں۔ (ایڈیٹر)

واقف ہونا چاہتا ہے کہ حقیقی اور اصلی باتوں کی پیروی اور لغو باتوں کو ترک کرے
اس لیے جاپانیوں کی جدید زندگی کی رفتار بھی ایسی ہی واقع ہوی ہے۔اور جیساکہ
ہم کو پچھلے دنوں جاپانی رسالہ شیوکیمیا سے معلوم ہوا ہے "ناگاساکی" مجلس مذاہب نے
دین اسلام کی چھان بین شروع کردی ہے۔خاصکر جب سے ٹوکیو کالج کے تعلیم یافتہ
چینی مسلمان حسان ٹیوشن نے جاپانی زبان میں اپنی تازہ ترین تالیف (جسکا ذکر
وکیل میں آچکا ہے۔ایڈیٹر) شائع کی ہے اسوقت سے تو مجلس مذکورہ کی تحقیقات
میں اور بھی زیادہ سرگرمی پیدا ہو گئی ہے۔مؤلف نے اس کتاب کا نام "کادویا"
(یعنی یکتا مذہب) رکھا ہے۔اور اسمیں فضائل اسلام سے بحث کی ہے جاپانی قوم کو
اس دین پر غور کرنے کے لیے اُبھارنا اور اُسکے قبول کرنے پر آمادہ کرنا چاہا ہے۔کیونکہ
یہ پاک مذہب اسلام سعادت دنیوی واُخروی کا ضامن اور انسان کو جوانمردی میں
شیر ببر اور اخلاق میں ملکوتی صفات بنادینے والا ہے۔

مجھے اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ جاپانی لوگ جو ہر معاملہ میں چھان بین کرنے
کے بیحد شائق ہیں۔عنقریب اپنی خوش فکری کی قوت سے اس مذہب کے اسرار میں
کوئی ایسا مسئلہ حل کرلیں گے جسکو سُنکر ہم لوگ بھی خوش ہوجائیں۔کیونکہ ہم
(یوروپی عیسائیوں) کو اس مذہب کے ساتھ خواہ مخواہ بغض للّٰہی پیدا ہو گیا ہے بلکہ
ہم نہایت بدمزاجی اور جھلاہٹ کے ساتھ اسکے دشمن بنگئے ہیں۔حالانکہ ہمارے اکثر
مدبر اور دانشمند اس دین سے محض ناواقف ہیں۔اور اسکو گالیاں دینے اور عیب
لگانے اور طرح طرح سے متہم کرنے میں صرف اُن لوگوں کے بیانوں کو سند بناتے
ہیں جنھوں نے ممالک مشرق میں جاکر کوچبانوں۔گدھے والوں۔اور کمینوں کے
سوا اور اعلےٰ طبقہ کے لوگوں سے ملاقات تک نہیں کی۔بجا لیکہ جن لوگوں سے وہ ملے
ہیں انکو اس مذہب کے سمجھنے سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔اور یہ پاک دین ایسے

لوگوں سے بالکل بری ہے۔

مَیں نہایت وثوق سے کہتا ہوں کہ اگر میرے امریکن بھائی سیدھے اور شائستہ طریقہ سے اس مذہب کی تحقیقات کرینگے اور ایسے معاملہ فہم اور باخبر مسلمانوں سے اسکے مسائل حل کرینگے جو اُنھیں ہماری ہی زبان میں اس دین کی حقیقت کی طرف رہنمائی کرسکیں۔ تو وہ بہت کچھ فائدہ اُٹھائیں گے۔ اور اس سے ویسے ہی واقف ہوجائیں گے جیساکہ مَیں واقف ہوگیا ہوں۔ اگرچہ ابتک مَیں اس مذہب کے بعض حقائق شلاً تعدد زوجات اور میراث کی نسبت۔ جو دونوں بہت کچھ قابل غور اور بحث طلب ہیں۔ پورا اطمینان کرنے اور باقی ماندہ شبہات رفع کرنے کے لیے کوشش کررہا ہوں مجھکو اس بات کا ذرا بھی شائبہ نہیں ہے کہ مسلمان لوگ اپنے دین حق کے ثابت کرنے اور اسکو غیر مذاہب والوں کے حملوں سے بچانے میں کمی کرتے ہیں۔ اور یہ بے حسی کی حالت جو آجکل اُنکے اوصاف میں داخل کی جاتی ہے اسے دین اسلام کے احکام سے کچھ بھی تعلق نہیں۔ . . . .

. . . . جوان کے قابل قدر افراد کو اُبھرنے نہیں دیتے۔ ورنہ جمہوریت اور شوریٰ اور ملکی انتظام کو بہترین طریقہ سے نباہنا اسی مذہب کا حصّہ ہے۔ اگر یہ مسلمان لوگ اسلام کی خدمت پر کمربستہ ہوں اور اسکی تعلیمات کے اچھے عالم اُسکی نصرت کریں۔ کیونکہ جہانتک میں نے دیکھا اسکی تعلیمات بیحد شُستہ اور دلپسند ہیں تو انکی جماعت جاپان کی جانب روانہ ہوکر شہر نگاساکی میں داخل ہو جسکی طرف مَیں خود بھی عنقریب سفر کرنے والا ہوں۔ تو میں بھی اُن سے مل کر وہاں کام کرونگا اور اس دین کی جو روح میری سمجھ میں آئی ہے وہ جاپانیوں کو بھی سمجھاؤں گا اسوقت میں علمائے اسلام سے تعدد زوجات اور میراث کے مسئلوں پر بحث کرکے اپنے شبہات اور شکوک مٹارہا ہوں۔ اور جسوقت یہ دونوں مسئلے مَیں اُسی

اندازہ سے سمجھ لوں گا جس طرح اور مسئلوں کو سمجھ چکا ہوں اور ان کی صحت کا قائل ہو جاؤں گا تو بیشک میں خود بھی مشرف باسلام ہو کر اُن کا دست و بازو بنوں گا۔ اور پھر انشاء اللہ مذہب اسلام کا تعارف جاپانیوں سے بخوبی تمام کر دوں گا۔"

اس مضمون پر رسالہ مذکورہ کے ایڈیٹر نے یہ نوٹ دیا ہے :-

ہم مسٹر بنک زونز کی دماغ سوزی کے قائل ہیں۔ مگر اس مضمون میں انہوں نے اپنے قلم کو حد اعتدال سے بہت آگے بڑھا دیا ہے۔ اسلام جو ایسی وحشی اور جاہل قوموں کا مذہب ہے جنہیں باوجودے کہ ان دنوں ہم نے بہت کچھ انکی رہنمائی و اعانت کی ہے پھر بھی وہ زندگی کے معنوں سے سراسر بےخبر اور ہمارے ہی دست نگر ہیں ایسے مذہب کو قابل مضمون نگار نے اتنے اعلےٰ مرتبہ پر پہنچا دیا کہ کوئی مذہب دنیا میں اسکے ساتھ مل کر ٹکر ہی نہیں کھا سکتا۔ ہماری رائے میں جاپانی اس مذہب کی طرف ہرگز مائل نہ ہونگے۔ کیونکہ وہ بڑے روشن خیال ہیں۔ اور یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ ایسے مذہب کو قبول کریں جسکے پیروؤں کے تنزل اور ضعف نے اسکی کمزوری اور اسکے اصول کی لچرپت کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا ہو۔ مسٹر بنک زونز اور ان کے دوسرے ساتھیوں کی تردید کے واسطے جو سمجھتے ہیں کہ انکے معدودے چند دماغ دنیا کے تمام عیسائیوں کے دماغوں سے فائق ہیں اتنا ہی لکھنا کافی ہے تاکہ وہ آئندہ ایسی باتوں کے سُنانے سے ہمارا دماغ پراگندہ کرنے کی جرأت نہ کریں۔ کیونکہ ہمیں امید ہے کہ ہمارے ناظرین اس مضمون کو نظر توجہ سے دیکھنا درکنار اسے پڑھکر ہی مضمون نگار کی حماقت پر قہقہہ لگائیں گے۔"

"دی ورلڈ" کے ایڈیٹر نے اس نوٹ میں اپنی کمظرفی کا پورا ثبوت دیدیا ہے۔

"از کوزہ ہماں برون تراود کہ دروست" اس نے اسلام یا مسلمانوں پر جو داغ لگانا چاہا ہے دین اسلام اُس سے بالکل بری ہے۔ اُسے خبر نہیں کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی وخستہ حالی محض ان کی غفلت اور احکام اسلام کو پس پشت ڈالدینے کے وجہ سے ہے۔ مذہب کا اسمیں کچھ قصور نہیں۔ اور ایڈیٹر کے خیالات کی تردید کے لیے صرف یہی ایک بات کافی ہے کہ اگر اسلام ایک فطری مذہب اور عبادات و معاملات وغیرہ کے بارہ میں توفیق وسعادت کی مستحکم تریں بنیادوں پر مبنی نہ ہوتا تو یہی چند سال جنمیں ....

........۔ اسلام اور اہل اسلام دونوں کو فنا کردینے کے لیے بس تھے۔ یہ اس مذہب کی صداقت ہی کا زور ہے کہ باوجود مسلمانوں کی اسکے احکام و اصول سے خلاف ورزی کے اسکی اشاعت میں بجاے کمی کے روز افزوں ترقی ہے۔ اور منصف مزاج وروشن خیال یوروپین فاضل خود بخود اس کی جانب مائل ہوتے جاتے ہیں۔ جنمیں سے ایک مسٹر نیک روز بھی ہیں۔ مسٹر نیک روز کے خیالات کی داد دینا ہمارے امکان سے خارج ہے۔ ہم انکے لیے حق سُبحانہٗ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ انکو راہ راست دکھا کر اپنے سچے دین کا پیرو بنائے۔ اور اسلام کو جسکی خدمت موجودہ مسلمانوں سے نہیں بن پڑتی ایسے ہی نئے مردان غیب کے ہاتھوں قوت وعظمت عطا کرے۔ آمین۔

مسٹر نیک روز نے مسلمانوں کے بغرض اشاعت اسلام جاپان جانے کی جو رائے دی ہے یہ ایک ایسا امر ہے جسکے واسطے ہم نے مدت تک قومی دولتمندوں کو اُبھارا اور اُنھیں اپنی خدا داد دولت میں سے کچھ حصہ اسلام کی حمایت کے لیے دینے پر آمادہ بنایا مگر ہنوز روز اول ہے۔ کاش خدا ئے کریم ہمارے دولتمند بھائیوں کو آنکھیں دیتا کہ وہ دنیا کی حالت اور اسلام کی

ضرورتوں کو دیکھتے۔ اور اپنا سرمایہ ایسے کاموں میں لگاتے جن کا بے حساب اجر اسی کریم کے دربار سے ملے گا جسکے خزائن رحمت بیحد و بے پایاں ہیں۔

الغرض میں سر پیر پاؤں دھر کے روانہ ہوگیا۔ جاڑے کا موسم شروع تھا۔ موٹی روئی کا لحاف اور کپڑے جلدی جلدی سلوائے۔ پسے ہوے مصالحے اور مرچیں اور بیسیوں خاک بلا دوائیاں ساتھ لیں۔ میرے جانے کا اعلان وکیل مطبوعہ ۲۔ دسمبر ۱۹۰۵ء صفحۂ ۳ پر ان الفاظ میں ہوا:۔

سفر جاپان ہمارے دوست قاری سرفراز حسین صاحب عزمی دہلوی جن سے پبلک ایک حد تک واقف ہے۔ اپنی فرلو کا ایک حصہ جاپان میں صرف کرنے کی غرض سے ۱۱۔ نومبر ۱۹۰۵ء کو جہاز لائٹننگ پر سوار ہو کر کلکتہ سے روانہ ہو گئے۔ اُن کا پتہ فی الحال معرفت ڈاکخانہ ناگاساکی ملک جاپان ہوگا۔ ؎

بسفر رفتنت مبارک باد
بسلامت روی و باز آئی

ہمیں امید ہے کہ قاری صاحب اپنے سیر و سفر میں جاپان کی مذہبی حالت کا مطالعہ کریں گے اور اپنی قابل قدر تحقیقات کے نتائج سے وقتاً فوقتاً وکیل کے کالموں کو مزین فرماتے رہیں گے۔*

"خدا خود میر سامان است ارباب توکل را" کے ثبوت میں اپنا یہ ذاتی تجربہ بیان کرتا ہوں کہ کلکتہ پہنچنے کے وقت تک میں جاپان میں کسی شخص کو نہیں جانتا تھا محض خدا کے توکل پر اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ کلکتہ میں اتفاقاً ایک بمبئی کے سوداگر سے ملاقات ہوی۔ اُنھوں نے سنگاپور میں مسرز ابراہیم بھائی (بزرگان سر فاضل بھائی کریم بھائی) کے منیجر کے نام خط تعارف دیا۔ وہاں پہنچنے پر اُنھوں نے

اپنے ہانگ کانگ کے منیجر (سار بھائی) کے نام چھٹی دی سار بھائی بڑی عنایت سے پیش آئے اور انھوں نے اپنے شنگاہی کے منیجر کے نام چھٹی دی - پھر انھوں نے اپنے کوبے کے ایجنٹ کے نام چھٹی دی - مگر مجھے ناگاساکی جانا تھا جو جاپان کا پہلا بندرگاہ ہے اور کوبے اسکے آگے دوسرا بندرگاہ ہے - بہرحال اسقدر ڈھارس بندھ گئی تھی کہ کوبے میں پاؤں ٹیکنے کو جگہ ہے -

الغرض دو شنبہ ۱۱ دسمبر ۱۹۰۵ء کو میں ناگاساکی پہنچا - میرے اُس شہر میں وارد ہونے کی اطلاع وہاں کے مشہور انگریزی اخبار "ناگاساکی پریس" نے اپنے ۱۳ دسمبر کی اشاعت میں حسب ذیل الفاظ میں شائع کی :-

ترجمہ

ناگاساکی پریس ۱۳ دسمبر ۱۹۰۵ء

"محمد سرفراز حسین نامی ایک صاحب پیر کو جرمن میل اسٹیمر سے ہندوستان سے یہاں وارد ہوئے ہیں - وہ جاپان بدھ مذہب کا مطالعہ کرنے کے لیے آئے ہیں اور وہ خوش ہوں گے اگر کوئی صاحب ان سے تمام مذاہب کے متعلق عموماً اور اسلام کے متعلق خصوصاً تبادلۂ خیالات کریں - نیو یارک کے کسی اخبار میں ایک نامہ نگار نے شائع کیا تھا کہ مذاہب کی معلومات کی ایک ایسوسی ایشن ناگاساکی میں منعقد ہونے والی ہے اور اس خبر کو ہندوستان کے اخبار نے نقل کیا تھا - محمد سرفراز حسین یہاں چند دنوں ایسوسی ایشن کے ممبروں سے خط و کتابت کرنے کے لیے قیام کرینگے - وہ ہندوستانی گورنمنٹ کے ایک افسر ہیں اور اپنی فرلو کے زمانہ میں جاپان آئے ہیں - انکا موجودہ پتہ جاپان ہوٹل ہے"

تمدن
لکھنؤ

میرا و تیرا

بشنوید اے دوستاں این داستاں
خود حقیقت نقد حال ماست آں

جس طرح بعض زندہ ہستیوں کی ایک خاص طاقت اور خاص شہرت ہوتی ہے اسی طرح بعض الفاظ اور بعض فقرات میں بھی بمقابلہ بعض الفاظ اور بعض فقرات کے ایک خاص طاقت اور اثر ہوتا ہے بعض وقت ایک لفظ ہی بمقابلہ چند الفاظ اور چند فقرات کے وہ اثر اور وہ خصوصیت رکھتا ہے کہ بعض چند الفاظ اور چند فقرات میں ایسا اثر اور ایسی خصوصیت نہیں ہوتی بعض وقت بعض فقرات اور بعض اشعار یا رود کا کام دے جاتے ہیں اُن کے اطلاق سے دلوں میں ایک آگ سی لگ جاتی ہے۔ اُن کا مُنھ سے نکلنا ایک جادو کا اثر رکھتا ہے ایسے الفاظ اور ایسے فقرات ایک لہر کی طرح دل و دماغ میں دوڑ جاتے ہیں دل و دماغ ہی متاثر نہیں ہوتے تمام جوارح اور بشرہ بھی یہ شہادت دیتا ہے کہ اُن کا اثر باطن سے نکلکر ظاہر میں بھی وجود پذیر ہو رہا ہے۔

معنی الفاظ در دل جا کند   چرخ خضرا خاک را اخضر کند

کبھی کبھی ایک لفظ ہی ساری محفل میں ایک کھلبلی ڈال دیتا ہے اور مجلس کی مجلس

ششدر ہو جاتی ہے اور بعض وقت اسی طرح ایک ہی لفظ یا ایک ہی فقرہ ایک برافروختہ محفل کی تسکین اور طمانیت کا موجب ہو جاتا ہے اور وہ طبیعتیں جو آگ کی طرح شعلہ زن تھیں بالکل سرد پڑ جاتی ہیں بعض شعرا کی نظمیں اور اشعار دونوں قسم کے اثر رکھتے ہیں یا یہ کہ ان میں دونوں قسم کی طاقتیں ہوتی ہیں کہنے کو وہ چند الفاظ یا چند فقرات ہی ہوتے ہیں لیکن ان میں اس غضب کا زور اور اثر ہوتا ہے کہ مردہ طبیعتیں بھی سن کر اپنے آپ سے باہر ہو جاتی ہیں دنیا میں اس قسم کے واقعات ہمارے اردگرد ایک ہی نہیں صدہا گذرتے ہیں بعض وقت ایک ہی لفظ اور فقرہ کے اطلاق سے کشت وخون تک اور بعض الفاظ اور بعض فقرات کے اطلاق سے صدہا قسم کی برکات اور داد و دہش کی نوبت پہنچ جاتی ہے اگرچہ کوئی اور یقین نہ کرے مگر جو لوگ یقین کرتے ہیں اُن کے نزدیک بعض افسوں اور منتر جنتر ایسا اثر اور ایسا زور رکھتے ہیں کہ گویا ایک بڑی طاقت کام کر رہی ہے۔

گرد فارس گرد سرافراشتہ گرد را تو مرد حق پنداشتہ

مندرجہ عنوان الفاظ (میرا و تیرا) دو ایسے لفظ ہیں کہ جو ہماری دنیا کی جان یا نچوڑ ہیں یا یہ کہ ہماری کائنات خصوصاً انسانی کائنات کی ابجد اور قاعدہ کے یہ دونوں راس الحروف یا راس الالفاظ ہیں یا یہ کہ ہماری انسانی منڈی کی رونق زیب و زینت ان ہی دونوں کی بدولت ہے اور یہی ہماری تمدنی زیب و زینت کا طرہ اور بالفاظ دیگر یہی دو الفاظ دنیا کی تمام خرابیوں ذلتوں اور الجھنوں کا بھی موجب ہیں اگر یہ نہ ہوں تو یہ دنیا اپنی نیند جاگ اُٹھے اور اپنی نیند سوئے یہ ان ہی کی مہربانی ہے کہ حضرت انسان صبح سے لے کر شام تک دنیا بھر کے بکھیڑوں اور الجھنوں میں گرفتار اور مقید رہتا ہے ان ہی دو آفتوں کی بدولت ہم دولت امن اور دولت آسائش سے محروم رہتے ہیں اور رات دن ہماری جان پر بنی رہتی ہے۔

ایں ہمہ آوردۂ من و تو است

ذرا کان کھول کر اور آنکھیں چار کر کے سنو اور دیکھو یہ سب امن وامان - بکھیڑ سے

جھگڑے جنگ وجدال۔ رونق وبے رونقی مال واموال۔ آل واولاد نوکر میں تیں سب ان ہی دو لفظوں کے کھیل ہیں اگر دنیا میں کوئی آرام ہے تو ان کی بدولت اور اگر کوئی تکلیف ہے تو ان ہی کی بدولت۔

ہر دو گوں آہو گیا خوردند و آب
زیں یکے سرگیں شد وزاں مشک آب

اگر دنیا کے مختلف اور چھوٹی کے جھگڑوں اور مناقشوں کی ایک لمبی چوڑی فہرست بنائی جائے تو اس کا ماحصل یہی دو لفظ۔

میں اور تیرا

نکلیں گے۔ ایک طرف اگر یہ آرام وہ اطمینان بخش ہوں گے تو دوسری طرف فساد کی جڑ۔

مفلساں گر خوش شوند از زر قلب
لیک آں رسوا شود در دار ضرب

ذرا کسی چھوٹی بڑی عدالت میں جا کر دیکھو کہ ۱۰ بجے سے لے کر شام کے ۴ بجے تک کیا کچھ ہوتا ہے ذرا کان دھر کر سنو گے تو اسی میرا۔ تیرا۔ میں اور تو کا زمزمہ سنائی دے گا ایک طرف حاکم اور دوسری طرف مدعی مدعا علیہ اور ان کے فاضل وکیل صاحبان اسی ورد میں لگے ہوں گے صد ہا دفتروں میں اسی میرا۔ تیرا۔ میں اور تو کا قصہ لکھا ہو گا۔ ایک دن نہیں دو دن نہیں مہینوں کیا سالوں اسی بحث میں گذر جاتے ہیں ایک غریب کے کنبہ اور جھونپڑے میں بھی اسی کا شور و شر ہو گا اور ایک بادشاہ کے محل میں بھی اسی کی پرستش ہوتی ہو گی ایک پاک خیال کا بھی یہی ورد ہو گا اور ایک ناپاک کا بھی یہی وظیفہ ہو گا تمہیں کوئی مکان اور کوئی منزل بھی اس سے خالی نظر نہ آئے گی ہر گلی و کوچہ میں یہی آواز سنائی دے گی۔ اور ہر آدمی کے منہ سے تم یہی سنو گے

از ہر د ہانے ایں صدا بس بشنوی

ان دو لفظوں کی بابت زمانہ فلاسفروں اور مورخوں کی بھی خوش کن رائیں کبھی سنی ہیں وہ کچھ اور ہی الاپتے ہیں بعض کی یہ رائے یا یہ خیال ہے کہ

(یہ میں میں تو تو یا میرا اور تیرا)

ہماری ابتدائی دنیا میں یا ہمارے اسلاف میں یا تو تھا ہی نہیں اور یا اس رنگ میں نہیں تھا جوں جوں تہذیب ترقی کرتی گئی ووں ووں یہ راگ بھی ترقی پذیر ہوتا گیا ایسے محققین کہتے ہیں کہ اگر ہم کچھ صدیوں ہی نہیں بلکہ ہزاروں سال بھی پیچھے ہٹ جاویں گے تو ہمیں پتہ لگتا جائے گا کہ اسوقت یہ میں میں تو تو یا میرا اور تیرا کوئی قیمت ہی نہیں رکھتا تھا دنیا میں جو کچھ تھا سب کچھ مشترکہ ہی تھا نہ کسی کو کوئی دعوے تھا اور نہ کوئی عذر۔ زندگی ان موجودہ پیچیدگیوں میں گرفتار نہیں تھی محض ایک سادگی سے گذرتی تھی۔

یہ پابندیاں جو اس زمانہ میں باوجود اس تہذیب اور دعوائے شائستگی کے ہر طرف سے گلوگیر ہیں نتیجہ ہے اُس غیرت اور اُس حمیت کا جو ایک فرضی ضابطہ کے تحت انسانی جماعتوں میں رفتہ رفتہ ترقی پذیر ہوئی ہے جب یہ غیرت اور حمیت یا پیچ نہیں تھی اُس وقت یہ میرا اور تیرا بھی نہیں تھا بعض اقوام کی پرانی روایات اسپر شاہد ہیں کہ شروع شروع میں عورات کی نسبت اس قدر غیرت نہیں تھی ایک ایک عورت کا کئی ایک آدمیوں کے ساتھ شادی کر لینا کچھ برائی نہ تھی یا ایک کی عورت سے کسی غیر شخص کا تعلق رکھنا ناجائز نہیں سمجھا جاتا تھا اسی طرح اور باتوں اور امور کی نسبت بھی اسقدر تنگی اور جھگڑا نہیں تھا۔

یورپ کے بعض عالموں نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے اور اس پر زور دیا ہے کہ اُن کی ایسی رائیں بالکل صحیح ہیں جس طرح بعض حکماء یورپ کی ان ... پر بعض لوگ یقین کرتے ہیں کہ انسان دراصل بندر یا کسی اور جانور کی ایک اصلاحی صورت ہے لیکن اگر ہم صرف بعض تھیوریوں کے ہی دلدادہ نہیں ہیں تو ہمیں ایسی روایات پر بھی فتوح کرنے کی ممانعت نہیں ہے بہتر یہی نہیں کہ اس قسم کی بعض روایات کی مزید تنقید کیجائے۔

یہ کہنا کہ انسانی طبیعت میں ... میرا اور تیرا کا خیال بعد میں نشوونما پاتا گیا ہے۔ انسان کا یہ ایک طبعی خاصہ یا ... ہے ... ایک ... یا ایک غلط استدلال ہے۔

میری نسبت ... میں ... تو تو میرا و تیرا ایسے الفاظ ہیں کہ ان کی بنیاد خود انسان کی

طبیعت یا سرشت میں ہی رکھی گئی ہے اگرچہ بعد میں ان کی تشریحات اور تفصیلات چند خارجی رجحانات کے بھی تابع کر دی گئی ہیں۔ مگر ان کی اصل خود انسان کی اپنی طبیعت ہی ہے۔ جس طرح ہر شخص ایک جداگانہ تشخص رکھتا ہے اسی طرح اس کی میں اور میرا بھی جداگانہ ہی ہستی رکھتے ہیں جس طرح ہر شخص خود کو دوسروں سے جدا سمجھتا ہے اسی طرح ہر شخص اپنی میں اور اپنے میرے کو بھی جداگانہ ہی رکھتا ہے اور ہر شخص کی سرشت اور فطرت میں اللہ کریم نے میں اور میرا کا ولولہ ڈال رکھا ہے انسان طبعاً ہی تمیز کرتا ہے کہ

یہ میں ہوں وہ فلاں ہے یہ میرا ہے اور وہ اس کا ہے میں میں ہوں اور تو تو ہے

وہ وہ ہے اور میں میں ہوں یہ میرا ہے اور وہ تیرا ہے یا وہ میرا ہے اور وہ اس کا ہے دیکھو ایک کوزا ئیدہ بچے کے سامنے جب کوئی شے رکھی جاتی ہے یا اس کے ہاتھ میں پکڑا دی جاتی ہے تو وہ اسکو اپنی سمجھتا ہے اور جب کوئی دوسرا بچہ اسے ہاتھ لگاتا ہے تو پہلا بچہ برا مانتا ہے اگر دوسرا بچہ اس شے کو ہاتھ لگاتا ہے تو پہلا بچہ اس سے بزور اور غصہ چھینتا ہے روتا ہے چلاتا ہے حالانکہ وہ اس شے کی قیمت اور ضرورت سے قطعی ناواقف ہوتا ہے جب کوئی دوسرا بچہ کسی بچے کی ماں کا دودھ پینے لگے تو عموماً وہ برا مانتا ہے جب کوئی اسکی ماں کو مارے تو وہ ایک غصہ میں آتا ہے اور بلبلاتا ہے۔ دو بچوں کو اندھیرے میں چھوڑ دو وہ دونوں اپنی ماؤں کی آوازیں پہچان کر انکی ہی کی طرف جائیں گے۔ یہ شعور اور یہ حس صرف انسانی بچوں میں ہی نہیں ہوتی جانوروں میں بھی ایسا شعور پایا جاتا ہے اور جانوروں کے بچے بھی ایسا شعور رکھتے ہیں جب کوئی دوسرا جانور اس کا دانہ چگنے لگتا ہے تو وہ مزاحم ہوتا ہے اور اس تصرف کو تصرف بیجا سمجھتا ہے۔ اگر کوئی جانور کسی دوسرے جانور کے گھونسلے میں چلا جائے تو گھونسلے والا جانور اس کے پر نوچنے پر تیار ہو جاتا ہے اسی طرح دوسرے چرند اور پرند بھی کرتے ہیں ایک کتا کھاتا ہو تو دوسرا کتا جب اس کے قریب بھی گذرتا ہے تو وہ جان کا مار سمجھاتا ہے بیشک بعض جانور ایسے بھی ہیں کہ انسانوں کی طرح ایک دوسرے سے ایک سلوک سے پیش آتے ہیں مگر یا وجود ایسے بھی ان کی میں اور میرا دور نہیں ہوتا جب دیگر حیوانات میں

بھی یہ بات پائی جاتی ہے تو پھر یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ انسان کی طبائع میں میں اور میرا و تیرا کا ولولہ نہیں تھا اور یہ رفتہ رفتہ اور بہت پیچھے پیدا ہوا ہے۔

اگر ہم یہ مان لیں تو اس میں قدرت کی چال اور ضابطہ پر بھی حرف آتا ہے جب قدرت نے ہمارا تشخص جدا جدا رکھا ہے تو اس کا یہ اثر لازمی ہے کہ ہم میں۔ میرا اور تیرا سے متصف ہوں اور یہ میں اور میرا و تیرا ہماری طبائع ہی کا ایک خاصہ یا ہماری سرشت کا ایک لازمہ ہو۔ دیکھو ہر شخص کی میں جدا ہے۔

ہر شخص کہتا ہے کہ میں ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں میں یہ پسند کرتا ہوں یا پسند نہیں کرتا جب ہر شخص کی میں جداگانہ ہے تو میں ہی کا اثر میرا ہے اور میرا کے مقابلہ میں تیرا ہے دونوں لازم ملزوم ہیں جہاں میرا ہے وہاں کسی دوسرے رنگ میں تیرا بھی ہے اور جہاں تیرا ہے وہاں میرا بھی ہے۔

جب میں یہ کہتا ہوں کہ یہ میرا ہے تو اس کا مطلب دوسرے الفاظ میں یہ ہوگا کہ میں اسے چاہتا ہوں یا یہ کہ میری (میں) اس کی حامی یا اس کی خواہاں ہے اور جب کسی کو کہا جاتا ہے کہ یہ تیرا ہے تو بالفاظ دیگر اس کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ میری (میں) تو اس کی داعی اور حامی نہیں تیری میں اس کی مدعی اور خواہاں ہوگی۔

یہ کہنا کہ رفتہ رفتہ انسانی جماعتوں میں میرا اور تیرا شروع ہوا ہے ایک غلطی ہے اور اس کے متعلق جس قدر روایات اور شہادتیں پیش اور بیان کی جاتی ہیں اُن سب کا مطلب اور مفہوم ایک مبالغہ سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ جب جانوروں اور لاالعقل حیوانات میں اپنے اپنے رنگ میں اس میں۔ تو یا میرا اور تیرا کا وجود پایا جاتا ہے تو انسانی طبائع میں بدرجۂ اولیٰ اس کی ضرورت ثابت ہے۔

یہ کہنا کہ بعض زمانوں میں عورت کی بابت اسقدر غیرت نہیں پائی جاتی تھی جسقدر اب پائی جاتی ہے یہ ایک کمزور نا دلیل اور قریب وہ تصریح ہے کہ یہ بات شروع ہی سے چلی آئی ہے اگر بعض ملکوں میں ایک عورت کے دو تین مرد خاوند رہے ہیں تو اس سے اُس انسانی تمیز کا ازالہ نہیں ہوسکتا ہے جو قدرت نے اُس کی طبیعت میں رکھ چھوڑا ہے

اب دنیا میں ہر ایک قوم میں چور اور رہزن بھی پائے جاتے ہیں کیا اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ خدانخواستہ انسان فطرتاً ہی چوری اور رہزنی کا حامی ہے بعض وقت بعض غلطیاں اور فروگذاشتیں چند مقامی سبقوں کے تحت سرزد ہوتی ہیں انھیں ایک فطرتی قانون نہیں بنایا جا سکتا اگر پہلی بات درست ہے تو پھر یہ بھی کہا جائے گا کہ انسان شروع میں تمام گناہوں کا عادی تھا لغتہ رفتہ قوانین اور سوسائٹی کے ڈر کی وجہ سے وہ ان کی برائی سے آگاہ ہوا ہے یا یہ کہ انسان فطرتاً گناہ کا حامی ہے حقوق کا مسئلہ انسان کی طبیعت ہی کا خاصہ نہیں ہے بلکہ دیگر حیوانات کی طبیعت کا بھی خاصہ ہے نہ صرف حیوانات کا ہی بلکہ نباتات اور جمادات میں بھی بہ مختلف صور یہ خاصہ ایک حد تک پایا جاتا ہے۔ دیکھو جب ہم ایک بڑے درخت یا بڑے تنے کے نیچے زراعت یا گلزار یا کوئی چھوٹے قد کا درخت بوتے ہیں تو وہ ایک آزادی سے سرسبز نہیں ہوتا اس سے یہ ثابت ہے کہ ہر پودہ اور ہر درخت دوسرے کے مقابلہ میں اپنا حق فائق جانتا ہے ذرا غور سے دیکھو گے تو تمھیں پتہ لگ جائے گا کہ قدرت نے ہر شے کو یک تشخص بخش رکھا ہے اور اس تشخص کی بدولت ہر شے اپنی ہستی قائم رکھنے پر بہ مختلف اجیل راغب رہتی ہے۔ مسئلہ تنازع للبقاء یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو اس مبحث پر کافی روشنی ڈال سکتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں تنازع للبقاء کا مطلب یہی ہیں۔ تو اور میرا تیرا یہی ہے۔ جب ایک ہستی یہ چاہتی ہے کہ میں کسی دوسری ہستی کے مقابلہ میں قائم اور ثابت رہوں تو بالفاظ دیگر اس کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ میں اور وہ قائم رہے یعنی جو میرا ہے وہ مجھے ملے اور جو کسی اور کا ہے وہ اُسے ملے جہاں میرا اور تیرا آئے گا وہیں دوسرے الفاظ میں تنازع للبقاء کی بحث چھڑ جائے گی۔

ہر ہستی کی مقدم غرض یہ ہے کہ

وہ قائم رہے یعنی میرا یا میرا حق قائم رہے۔

سب سے پہلے میں یا میرا کی بحث چھڑتی ہے جب اس کا فیصلہ ہو لیتا ہے تو پھر تیرا

یا نکی قیمت آتی ہے اگرچہ اس میں۔ تو اور میرا تیرا کی بدولت دنیا میں بہت کچھ خرخشے اور فساد نغو و نما پا رہے ہیں اور دنیا کے معاملات کا یہ فی صدی ۵۵ حصہ ہے لیکن اگر چشم بصیرت سے دیکھو گے تو ساتھ ہی یہ بھی پاؤ گے کہ اسی کی بدولت دنیا کی یہ رونق اور سرسبزی بھی ہے دنیا کے بڑے اہم مسائل میں سے حقوق کا مسئلہ ہے اور حقوق کی تقسیم اور تفصیل اسی میرا اور تیرا پر جا کر ختم ہوتی ہے جہاں میں۔ تو اور میرا و تیرا نہیں ہے یا جہاں ان الفاظ کا دور ختم ہو جاتا ہے وہاں دین و دنیا کا کام ہی ختم ہو جاتا ہے دیکھو جب انسان اس دنیا سے گذر جاتا ہے تو ابھی اُس کی نعش چارپائی کے اندر ہی پڑی ہوتی ہے کہ اُسکا دور ہی ختم ہو جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے اس واسطے کہ اُسکی میں اور میرا کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور اُنکی جگہ کوئی اور شخص لے لیتا ہے۔

ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت

رفت منزل بدیگرے پرداخت

جب تک میں اور میرا رہتا ہے تب تک تو تیرا اور تو بھی زیر بحث رہتا ہے لیکن جب میں اور میرا نکل جاتا ہے تو ایک خاص شخص کے مقابلہ میں تیرا اور تو بھی نہیں رہتا اُس کا بھی مقابلتاً خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اب اگر ہم یوں کہیں کہ در اصل یہ دنیا یا اس دنیا کا کارخانہ اس دنیا میں۔ تو اور میرا و تیرا ہی کا دوسرا نام یا عکس ہے تو شاید یہ کچھ مبالغہ نہ ہوگا بعض فقیر منش کہا کرتے ہیں میاں میں مارو گے تو دل کا تزکیہ ہوگا وہ سچ کہتے ہیں یہ میں ہی سب شرارتوں سب تکلیفات سب مقدمات سب بکھیڑوں اور سب جھگڑوں کی موجب ہے اور دوسری طرف یہی پر دنیا کی ہر ایک قسم کی ترقی اور رونق کا مدار بھی ہے اگر یہ نہ ہو تو کچھ بھی نہیں بعض لوگ کہتے ہیں کہ میں مار کر انسان ریاضت میں پورا اُترتا ہے میں کہتا ہوں میں کو ثابت اور قائم کرکے ہی انسان انسان ہوتا ہے میں ایک تشخص ہے اور ہر تشخص قدرت کی جانب سے ہے اور جب تک ہر شخص باعتبار ایک تشخص کے اتقا اور سیرت صحیحہ کی صورت میں اپنا تشخص قائم اور ثابت نہیں رکھ سکتا تب تک وہ صحیح بھی نہیں اُتر سکتا اور یہ نہی

صورت میں ہو سکتا ہے کہ

جب مَیں کو بحیثیت ایک صحیح العزم اور صحیح الغرض مَیں کے فطرتی مراتب پر ثابت اور قائم رکھا جائے۔ غلط طور پر مَیں کو مار دینا ایک خودکشی ہے اور خودکشی مذہب اور عقل میں حرام یا ایک بڑا گناہ ہے کیونکہ کوئی شخص ناجائز اسباب کے تحت اپنی جان لینے کا حق نہیں رکھتا جان لینا صرف خدا ہی کا حق ہے کیونکہ وہی اس کا خالق بھی ہے۔ جب کوئی مذہب یا کسی مذہب کے صوفیائے عظام یہ کہتے ہیں کہ مَیں کو مار دو تو اس کا مطلب یہ نہیں لینا چاہیے کہ مَیں کو مار دو بلکہ یہ کہ مَیں کی آلودگیاں دور کر کے اُسے ایک صحیح اور اصلی مرکز پر قائم کرو۔ خودداری نہ چھوڑو۔ خودداری دونوں جہاں میں کام کی شے ہے۔

اسلام میں کہا گیا ہے۔

لا رھبانیۃ فی الاسلام

اُس کا یہی منشا ہے کہ اس مَیں کو ایک ناجائز طریق سے نہ ہلاک کرو اسے باقی رکھکر اس کا تزکیہ کرو ایک شخص خودکشی کر کے یہ نہیں حق رکھتا کہ اُسے ایک مجاہد اور مرتاض کہا جائے بہادری اور شجاعت تو یہ تھی کہ وہ خود کو زندہ رکھکر ہی مغبوحات دنیا سے آزاد رکھتا یا اُن کا ایک صحیح طریقہ سے مقابلہ کرتا۔ مگر تو ہر شخص مغبوحات دنیوی اور رزائل زندگی سے رہائی پا سکتا ہے۔ فافھم

سلطان احمد

فیشن

انگلستان کے فلاسفر ہربرٹ اسپنسر کا قول ہے۔ کہ ابتدائے آفرینش میں جو چیزیں انسان نے ایجاد کیں۔ وہ محض ضرورت کی خاطر تھیں۔ مگر چونکہ حضرت انسان بالطبع حسن پرست ہیں۔ رفتہ رفتہ ہر ایک شے کو موزوں اور خوب صورت بنانے کی کوشش ہونے لگی۔ حتیٰ کہ باورچی خانہ کے برتنوں سے لے کر بدن کے لباس تک اور مکان کے فرنیچر سے لے کر گورستان کی قبروں تک کوئی شے ایسی نہیں ہے جہاں فیشن کا خیال سب سے پہلے ملحوظ نہ کیا جاتا ہو۔

فیشن ایک اندھی تقلید کا نام ہے جس پر عموماً بلا لحاظ اس امر کے کہ اس کی موزونیت پر غور کیا جائے۔ عملدرآمد ہوتا ہے۔ فیشن کی بدولت صدہا بیماریاں ہزارہا مصیبتیں۔ لاکھوں تکلیفیں بنی آدم کو گھیرے رہتی ہیں۔ مگر وہ فیشن کو چھوڑنا ناپسند نہیں کرتا۔ فیشن کی غلامی اہل چین کو مجبور کرتی ہے۔ کہ وہ اپنی لڑکیوں کے پاؤں آہنی جوتوں میں مسوس کر بڑھنے نہ دیں۔ خواہ اس میں کیسی ہی تکلیف ہو۔ اور اسی کی تعمیل میں چینی مرد لمبی لمبی چوٹیاں اپنی پشت پر لٹکاتے ہیں۔ کیا یہ محض فیشن کا خبط نہیں کہ ہندوستانی عورتیں اپنے کانوں کو سوراخوں کی کثرت سے چھلنی بنا لیتی ہیں۔ اور کسی ہندوستانی عورت میں اتنی جرأت نہیں ہے۔ کہ اپنی ہمجنسوں میں نکّو بننا پسند کرے۔ اور پیدائش کی قدرتی حالت پر رہنے دے یعنی نتھ لٹکانے کی خاطر سوراخ نہ کرے۔

فیشن کی غلامی میں ہماری نئی روشنی کے نوجوان صاحب لوگوں کی دیکھا دیکھی موسم گرما میں بھی گرم کپڑے زیب تن کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کی برداشت وہ مشکل کر سکتے ہیں۔ مگر کمبخت فیشن کی قید سے رہائی نہیں پا سکتے۔ کیا ہمارے دیسی صاحب لوگ ایسا کرنے کی جرأت رکھتے ہیں کہ پیٹنٹ لیدر کے بوٹ بغیر گزارہ کر سکیں۔ کیا اپنے ملک کی سخت گرمی میں جب کہ پسینہ کی شدت سے جلد لال ہو رہی ہو۔ وہ پتلون کو پہن کر

دھوتی یا تہ بند یا ہلکا پاجامہ پہن سکتے ہیں؟ فیشن کی غلامی میں برسات کے جانکاہ حبس میں بھی وہ شام کو فلالین کا کوٹ پہن کر ٹینس کھیلنے کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔ لندن اور پیرس میں فیشن کی اس قدر حکومت ہے۔ کہ کوئی لیڈی یا جنٹلمین اسکی اطاعت سے سرکشی نہیں کرسکتا۔ لوگ سرکاری قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اخلاقی اور مذہبی قواعد کو توڑتے ہیں۔ مگر فیشن کے اٹل حکم کی تعمیل سے کوئی سر نہیں پھیرتا۔ اور لطف یہ ہے کہ ہمارے ہاں فیشن سالہا سال کے بعد بدلتا ہے۔ اور وہاں ہر مہینے بلکہ مہینے میں دو بار تبدیل ہو جاتا ہے۔ آج ایک کوٹ بڑے شوق سے سلایا جاتا ہے جس کی فیشن ایبل تراش اور سلائی کی اجرت درزی کو ۵ پونڈ دی گئی ہے۔ دو ہفتہ بعد وہ قطع اوٹ آف فیشن ہوگئی۔ چلیے اب نئی وضع کا شوق دامنگیر ہوا۔ اور پھر نئے سرے سے کتر بیونت شروع ہوئی

اگرچہ فیشن کے خبط سے مہذب سے مہذب اور وحشی سے وحشی کوئی بنی نوع انسان خالی نہیں ہیں۔ وحشی اور جنگلی آدمی بھی اپنے بدن انواع واقسام کے رنگوں سے رنگ لیتے ہیں۔ اور جانوروں کی ہڈیوں اور مور کے پروں سے اپنے جسموں کو زینت دیتے ہیں۔ مگر جہاں تہذیب صاحب جلوہ افروز ہیں۔ وہیں فیشن کی زیادہ حکومت ہے جو قومیں آزادی کے خمار میں سرشار ہیں۔ وہی زیادہ تر فیشن کی سلاسل میں گرفتار ہیں۔ اگر بغور دیکھیں تو فیشن بت پرستی کی دوسری صورت ہے۔ جسمانی آراستگی اور وضع وقطع کی تراش میں حد سے زیادہ مصروف ہونا انسان کو روحانی ترقی سے باز رکھتا ہے فیشن کی پرستش نے انسان کی یہ حالت کردی ہے۔ کہ تقریباً اب ہر ایک شخص کی زندگی کا یہی مقصد ہوگیا ہے۔ کہ جس طرح ہو۔ جائز یا ناجائز وسائل سے وہ اس قدر سرمایہ حاصل کرے۔ کہ فیشن ایبل مکان فیشن ایبل لباس فیشن ایبل سواری مہیا کرسکے فیشن کی ہوس پوری کرنے کے لیے خونریزیاں ہوتی ہیں۔ چوریاں کی جاتی ہیں۔ رشوتیں لی جاتی ہیں۔ دغا اور فریب ہوتے ہیں۔ جھوٹے اشتہار دیے جاتے ہیں۔ مگر اے بیوقوف انسان۔ تیرا یہ اصلی مقصد نہونا چاہیے۔ تو خداوند عزوجل کا نائب اور خلیفہ اس دنیا میں ہے۔ تجھکو اشرف المخلوقات کا معزز لقب دیا گیا ہے۔ تیرا درجہ بہت بلند ہے۔ تو حقیقت میں

بہشتی پر ہے۔ اس فانی دنیا کی جھوٹی اور نمائشی نعمتوں سے صرف بقدر ضرورت مستفید ہو اور اپنے فرائض کا خیال کر۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ سے کچھ نہ ہوگا۔ نمائشی لوازمات سے تجھے سرور نہ ملے گا۔ خانۂ دل کو آراستہ کر اور بجائے جسم کے دماغ کے سجانے کی کوشش کر کیونکہ روحانی قوتوں کو ترقی دینا ہی روح کی بڑی فتح ہے۔ ایک صاحب لکھتے ہیں کہ بہت سی انگریزی عادتیں ہم لوگوں نے انگریزوں کے ساتھ تعلق رکھنے کے باعث اختیار کر لی ہیں۔ ورنہ انگریز خود ان سے گھبرائے ہوئے ہیں۔ ایک صاحب کو ایک مرتبہ موسم گرما میں انگریز دوست کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ اندر جا کر کیا دیکھتے ہیں۔ کہ صاحب بہادر خاصے کا ایک ستھلا پاجامہ اور ململ کا کرتہ پہنے پنکھے کے نیچے براجمان ہیں۔ ہندوستانی صاحب کو دیکھ کر فرمانے لگے۔ دیکھو ہمیں کیسی آفت بھگتنی پڑتی ہے۔ اگر کوئی انگریز آج آئے۔ تو مجھے یہ کپڑے بدل کر اس سے ملنا پڑتا ہے۔ اس لیے میں کسی کو یکایک اندر آنے نہیں دیتا۔ تم تو ہندوستانی ہو ململ کے لطف سے واقف ہو۔ دیکھو فیشن کی غلامی میں ہم لوگ تکلیف اٹھا رہے ہیں لیکن مجھے تمھارے بہت سے بھائیوں پر افسوس ہے۔ جو بلا ضرورت خود بخود اس غلامی میں آتے جاتے ہیں۔

وہی صاحب لکھتے ہیں۔ کہ مسٹر گلیڈسٹون صاحب جالندھر میں کمشنر مقرر ہو کر تشریف لائے۔ وہ تمام انگریزوں کی طرح بند مکان میں نہیں سوتے تھے۔ ہمیشہ آسمان کے نیچے پلنگ بچھا کر خواب استراحت فرماتے تھے۔ لیکن اس وقت کتنے کالے صاحب لوگ ایسے ملیں گے جو گرمیوں اور برسات کی راتوں میں اپنی پیاری نیند کو دو تین تین پنکھا قلیوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ خیال کیا کرتے ہیں۔ کہ اس قسم کی تقلید سے انگریزوں کی جفاکشی اور استقلال کے اوصاف ہم میں آ گھسیں گے۔ آج ملک میں ہر طرف لوگ دھڑا دھڑ ترقی کر رہے ہیں۔ شادیوں کا فضول خرچیوں کا انسداد ہوتا ہے۔ پردہ بہت کو تند و تیز ایام کا حق انتخاب کم کرو۔ عورتوں کے زیور تخفیف کرو۔ مگر ایک طرف کی کفایت دوسری طرف صرف ہو رہی ہے۔ ذاتی اسراف کی طرف کسی کا خیال نہیں ہے۔ ہم سوڈا واٹر اڑانے والے بابوؤں سے پوچھتے ہیں۔ کہ تمھارے پاس اس قدر دولت ہی کہاں ہے۔ کہ مستحقین کو

کچھ دو گے فیشن کی غلامی نے تمھیں اس لائق ہی کب رکھا ہے۔ کہ زیور بناؤ۔ یا کسی کو کچھ دو۔ کہتے ہیں۔ کہ شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں ایک آدمی پانچ آنے ماہوار میں گزارہ کر سکتا تھا۔ جیسا کہ اب پندرہ روپیہ میں ہوتا ہے۔ اس تفاوت کو بہت کچھ گرانی سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن غور سے دیکھیں۔ تو گرانی ایک حصے اور فیشن صاحب دس حصے اس انقلاب کے ذمہ دار ہیں۔

ش - د

کلام اکبر

جسے حکومت کا نشہ ہو گا فلک سدا اُس سے کد کریگا
جو صبر و طاقت سے کام لیگا خدا اسی کی مدد کریگا

اب حدیث لیڈری ہے عمر راوی ہو چکی
آفتِ ارضی کی شدت ہے سماوی ہو چکی
بندے کو نواعباداللہ اخوانا کی خوب
ووٹ بازی پر مگر یہ بنا۔ حاوی ہو چکی

لوگ دنیا میں خوش اعمال بداعمال سے ملے
لیکن اس فکر میں سب تھے کہ کہیں مال ملے
حسن دنیا کے فریبوں نے کیا عیش کو تلخ
زلفوں والے جو ملے جان کے جنجال ملے
عیش دنیا میں بہت ہے کہ مصیبت ہے بہت
اُس سے پوچھو جو کوئی پیر کہن سال ملے

دل جس سے ترا بڑھے وہ تمہید اچھی
اچھا ہو جو ہم اُس کی تائید اچھی
ہر چند گناہ گار ہوں اے اکبر
رکھتا ہوں مگر خدا سے اُمید اچھی

قوتِ ایماں سے کہدو سب کو سمجھاتی رہے
نیکیاں کثرت سے ہوں مغلوبیت جاتی رہے

کل واقعاتِ دہر کہاں ہسٹری میں ہیں
فوٹو ہے صرف سطح پہ پیش نگاہ کا
وہ بھی فقط خیال مصنف بہ قید خود
کیا بن سکے چراغ صداقت کی راہ کا

عبدالرحیم خان خاناں پر ایک نظر

کو طاقت آنکہ بہ ایں جاذبۂ شوق
رخسار ترا بینم و بیتاب نہ گریم

شاہانِ سلف اور مشاہیر کی سوانح عمریاں عموماً اور اُن کے حلم و عفو اور فیاضیوں کے قصے خصوصاً نہایت بصیرت افزا اور خرد پرور ہوتے ہیں ان کے مطالعہ سے دل و دماغ پر ایک خاص اثر پڑتا ہے۔ چال چلن درست کرنے اور انسانی عادات و خصائل کے سنوارنے میں بعض اوقات جو کام اسلاف کے روشن کارنامے اور اُن کے بے مثل اور لائق توصیف و ثنا اخلاقی فضائل کیا کرتے ہیں وہ کسی خارجی یا داخلی تحریک سے ہرگز ممکن نہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ سوانح عمری کے بعض فقروں نے یک بیک خیال و دماغ پر قبضہ کر لیا اور پڑھنے والا بے ساختہ ایک آہ کھینچ کر کھڑا ہو گیا۔ خیالات کی دنیا میں ایک انقلاب آگیا۔ نہ وہ طبیعت رہی نہ وہ باتیں نہ وہ چلن رہے نہ وہ عادتیں۔ دل میں ایک آگ لگ گئی طبیعت میں جذبہ پیدا ہو گیا۔ آن کی آن میں ہوا پلٹ گئی نئے ارادے جوش مارنے لگے۔ چنانچہ لوتھر کے دل میں جو غیر معمولی اور زلزلہ انگیز تحریک پیدا ہوئی اور بنجمن فرنکلن نے نہایت پست حالت سے اعلیٰ درجہ تک ترقی پائی اور شہرت حاصل کی اس کا بڑا سبب یہی بیوگرفی یا سوانح عمری کا مطالعہ تھا۔ در اصل بیوگرفی علم الاخلاق سے زیادہ منفعت رساں اور فائدہ انگیز ہے۔ کیونکہ علم الاخلاق سے صرف نیکی و بدی کی ماہیت معلوم ہوتی ہے لیکن بیوگرفی سے اکثر نیک کام کرنے اور افعال ذمیمہ سے محترز رہنے کی ایک زبردست تحریک دل میں پیدا ہو جاتی ہے اور اسلاف کے اعلیٰ و ستودہ کام کرنے کا شوق و شغف دل میں پیدا ہوتا ہے۔ ایک مشہور انگریزی آتھر کا مقولہ ہے۔ کہ بیوگرافی چیخ چیخ کر اور سمندر کے طوفان کی طرح شور و غل مچا کر یہ آواز دیتی ہے کہ جاؤ تم بھی ایسا ہی کرو۔" غرض یہ ایک تازیانہ ہے جو خواب غفلت سے بیدار کرتا ہے مسلمانوں کی قوم آجکل

اقوام عالم میں ایک مفلس و تنزل یافتہ قوم ہے۔ ہر طرف ادبار و انحطاط کا بادل چھایا ہوا ہے۔ بائیس۲۲ کروڑ نفوس میں کم ایسے نکلیں گے جن پر خوش حالی و بے فکری قسمت وری کے چند ہالہ ہی ہوگی۔ عیش و مسرت کا سایہ ہوگا۔ بداخلاقی و بے حسی عالمگیر وسعت پکڑ گئی ہے۔ اور فی الحقیقت اخلاق ہی کے بگڑ جانے نے اس حالت کو پہنچا رکھا ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ مشاہیر اسلام اور اکابر ملت کے جاں بخش تذکرے عمدہ اور دلنشین پیرایہ میں ان کے سامنے دہرائے جائیں اور اُن کے فضائل و اخلاق کے قصے بیان کر کے مسلمانوں کے بے حس و حرکت وجودوں میں تازہ اور غیر فانی روح پھونکی جائے۔ اور ایک بار پھر ترقی و عروج کے بام پر جلوہ آرا نظر آئیں۔ اس مقصود کو مد نظر رکھ کر آج ہم ایک زبردست اور مایۂ روزگار اسلامی ہیرو عبدالرحیم خان خاناں کے مختصر و مجمل حالات حوالۂ قلم کرتے ہیں خان خاناں کا دربار فیاضیوں اور علم پروریوں میں شاہان عالم کے درباروں پر چشمک زنی کرتا تھا۔ اس کے محامد و اوصاف اخلاق و عادات نہایت سبق آموز اور ہمت افزا ہیں وہ بہت سی زبانوں میں درجۂ کمال رکھتا تھا اور عربی زبان میں یہ مہارت و ترتیب حاصل تھی کہ عربی تحریر کو اصل عبارت پڑھے بغیر نہایت روانی کے ساتھ ترجمہ کرتا چلا جاتا تھا اور یہ تمیز نہ ہوتی تھی کہ ترجمہ کیا جا رہا ہے یا اصل عبارت پڑھی جاتی ہے۔ ایک بار شریف مکہ نے شہنشاہ اکبر کو خط لکھا اور اُس میں نہایت عبارت آرائی سے کام لے کر بڑے بڑے مغلق اور دقیق الفاظ بھر دیے۔ اکبر نے خان خاناں فتح اللہ شیرازی اور ابوالفضل کو ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ ابوالفضل اور فتح اللہ شیرازی تو اس خیال سے کہ لغت سے امداد لینے کی ضرورت ہوگی تحریر کو ساتھ لیگئے۔ مگر خان خاناں نے وہیں خط کو شمع کے سامنے لے جا کر پڑھنا شروع کیا اور ترجمہ بھی نہایت بے تکلفی سے ساتھ ہی ساتھ کرتا گیا۔

ترکی و فارسی اس کی مادری زبانیں تھیں۔ انشا پردازی میں تبحر حاصل تھا۔ فارسی زبان میں تزک بابری اُس کی تصنیف موجود ہے جسے اُس نے اکبر کی فرمائش پر زبان ترکی سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کتاب کی فارسی نہایت صاف اور شستہ ہے چونکہ اکبر کی سلاطین یورپ سے مراسلت رہتی تھی اس لیے اکبر نے خان خاناں کو

یورپین زبانیں سیکھنے کا حکم دیا تھا اور اُس نے بہت کچھ مہارت پیدا کر لی تھی وہ دنیا کی اکثر زبانوں میں بات چیت کر سکتا تھا۔ گو غزلیات و اشعار بہت ملتے ہیں لیکن دیوان کا پتہ نہیں چلتا۔

خان خاناں کا ایک بے نظیر کتب خانہ تھا جس میں کثرت سے علمی ذخیرہ مہیا کیا گیا تھا۔ ظہوری، شکیبی، نظیری، عرفی نے اپنے دیوان خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر اس کتب خانہ میں داخل کیے تھے۔ اس کتب خانہ کی ترتیب و تنظیم کے لیے بڑے بڑے اہل کمال کا ایک عملہ مقرر تھا۔ جو تمام نسخوں کی تکمیل کرتے تھے تصویریں اور شبیہیں کھینچتے تھے۔ مرقع تیار کرتے تھے۔ کتب خانہ کے اسٹاف کے مشہور ممبر مُلا محمد مومن، عنی ہمدانی، مُلا عبدالرحیم عنبریں قلم، مُلا محمد امین جدول ساز تھے۔ ملا محمد امین ازبکوں کے حملے کے سبب خراسان سے نکلے اور خان خاناں کے دربار میں آکر بمشاہرۂ چار ہزار روپیہ ملازم ہو گئے کتب خانہ کی اکثر کتابیں ان کی طلاکاری سے مزین تھیں۔ ابری کا کاغذ بھی ان ہی کی ایجاد ہے۔

یہ اس قدر فیاض اور علم پرور و دیار تھا کہ اس زمانے کے نامور و مشہور زماں شعراء بجز دو ایک کے سب کے سب خان خاناں یا ابوالفتح گیلانی کے پروردہ اور تربیت دادہ ہیں تمام زبردست اور نادر روزگار شعراء عرفی، شکیبی، حیاتی، ظہوری، ملک قمی، محتشم کاشی، نظیری نیشاپوری، رسمی، نوعی شیرازی اس دربار کی رونق بڑھاتے تھے۔ خان خاناں کی فیاضیوں کا یہ حال تھا کہ نوعی شیرازی کو سونے میں تُلوا دیا۔ ایک دفعہ حج سے واپس آنے پر نظیری نیشاپوری کی زبان سے نکل گیا کہ میں نے ایک لاکھ روپیہ کا ڈھیر نہیں دیکھا خان خاناں نے اُسی وقت روپیہ کا ڈھیر لگوا دیا۔ نظیری نے شکریہ ادا کیا خان خاناں نے اس پر سب روپیہ نظیری کے گھر پہنچا دینے کا حکم دے دیا۔ خان خاناں بے وجہ بھی شعراء و علماء کو صلے اور انعام دیتا تھا کہ ادب و انشا میں ترقی ہو۔ رفتہ رفتہ ان فیاضیوں کے چرچے عرب و عجم تک پہنچ گئے شکیبی اصفہانی حج کو جاتے ہوئے جب عدن پہنچا تو دیکھا کہ گیت گا رہے تھے کہ خان خاناں آیا جس کی بدولت کنواریوں نے

شوہر پائے تاجروں نے اسباب بیچے بادل برسے جل تھل بھر گئے شکیبی بے ساختہ رو پڑا۔ اور اُسی وقت یہ رباعی موزوں کی ؎

زیں دانہ کہ از نام نکو کاشتۂ ۔۔۔ از اختر سعد خرمن افراشتۂ

داں گونہ جہاں بجود انباشتۂ ۔۔۔ کز مور کفاف دانہ برداشتۂ

خان خاناں خود ایک زبردست نقاد سخن تھا شعر کی آپ تربیت کرتا تھا۔ گاہے گاہے کلام میں اصلاح دیتا بہت سے دیوان خان خاناں کی توجہ سے شائع ہوئے چنانچہ عرفی نے مرتے وقت اپنے دیوان کا مسودہ جو کاٹ پھانس سے نہایت ابتر تھا اس کے پاس بھیجا۔ یا خان خاناں نے محمد قاسم کو اسکی درستی کا کام سپرد کیا جس کی سال بھر کی شبانہ روز محنت و جانفشانی سے دیوان صاف ہو سکا۔ خان خاناں غایت درجہ مسرور ہوا اور بہت کچھ انعام و اکرام سے محمد قاسم کو مالا مال کیا۔ یہی وہ وسائل ترغیبی اور باعث خلوص تھے کہ بادشاہ کی مدح میں تحریر کیے گئے ہوئے قصائد اور خان خاناں کے مدحیہ قصائد میں بیّن فرق متمائز ہے یہاں شاعر جوش اور اخلاص سے لبریز اور بادۂ کرم کے نشے سے چور نظر آتا ہے۔ ہر ہر لفظ سے دلی تشویق و تخلیص ٹپکتی ہے۔ اور گہرے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔

ایک مخصوص صفت اور لائق صد ہزار گونہ مدح و ستائش خصوصیت اس نادرۂ روزگار ہستی میں یہ تھی کہ باوجود اس جاہ و جلال سطوت و اقبال کے حسن اخلاق اور شگفتہ طبعی کا مجسم نمونہ تھا جب خان خاناں کا خطاب ملا ہے۔ جذبۂ شکر و اخلاص سے مغلوب ہو کر چند نصیحت انگیز فقرے ایک کاغذ پر تحریر کرکے ملازمین کو دیدیے۔ کہ وقت غیظ و غصہ میرے سامنے پیش کر دیا کریں۔ چنانچہ کاغذ کے پیش ہوتے ہی انتہائی غضب و غصہ میں بھی ٹھنڈا پڑ جاتا۔ ایک دفعہ ہجوم عام میں ایک ملازم کا پاؤں اُس کے زخمی پاؤں پر پڑ گیا اور زخم پھٹ گیا سخت تکلیف ہوئی۔ لیکن نوکر کو کوئی سزا نہ دی بلکہ کہدیا کہ یہ ایک امر اتفاقی تھا اس کا قصور نہیں۔ اللہ اللہ کیا لوگ تھے کیسی خلق مجسم ہستیاں تھیں۔ اپنے لواحقین کا کس درجہ خیال رہتا تھا۔ تیراندازی میں کمال دسترس حاصل تھی جب مظفر پر گجرات میں فتح حاصل کی ہے تو ایک دفعہ میدان میں گیند کھیلتے ہوئے

ایک کوّا دیکھا جو ہوا میں اُڑتا جارہا تھا۔ خان خاناں نے پے در پے اُسکے چاروں طرف تیروں کا دائرہ بنادیا چنانچہ بارہ تیر مارے اور تیرھویں تیر میں مار کر گرادیا۔ ایکبار ایک شیر کی پیشانی پر تیر مارا کہ سوفار تک اُتر گیا۔ اکثر بھیڑیوں کو تلوار سے مار ڈالا۔ خان خاناں نے تین جہاز بھی طیار کرائے تھے جن کا نام رحیمی کریمی سلالاری تھا۔ یہ جہاز صرف غربا کو مفت حج کو لے جایا کرتے تھے۔ حمام کو عمومیت خان خاناں نے ہی دی تھی ورنہ اب تک حمام اُمرا اور روسا کے مکانات میں ہوا کرتے تھے سب سے پہلے خان خاناں نے گجرات میں محمد علی معمار کے زیر اہتمام حمام بنوا کر وقف عام کردیا۔ اُسوقت سے حمام کا عام رواج ہوگیا۔ خان خاناں نے بڑے بڑے مقامات دہلی۔ آگرہ۔ لاہور میں باغ، مکانات نہایت شوق سے تعمیر کرائے۔ ہندوستان محض ایک زراعتی ملک ہے جسقدر اعلےٰ قسم کے پھل اور میوے آج اس ملک میں پیدا ہوتے ہیں سب مسلمانوں کے لائے ہوئے ہیں۔ سیب ناسپاتی انگور خربزہ کی پیداوار کا فخر خان خاناں کو حاصل ہے۔ ہندوستان میں خربزہ ایران و خراسان سے آتا تھا سب سے پہلے خان خاناں نے تخم منگوا کر بلکوادہ علاقہ گجرات میں آب ہوا کی مناسبت کے لحاظ سے ایک قطع منتخب کرا کے اس کی کاشت کرائی دو تین سال میں ایسے خربوزے پیدا ہونے لگے جو ایرانی و خراسانی خربزوں کا مقابلہ کرتے تھے۔ جرأت و دلیری میں خان خاناں چمن اکبری کا نہایت نکہت بیز پھول ہے۔ اسکے جنگی کارنامے گجرات اور سندھ کے فتوحات ہیں۔ غرض جب کہ ہم اس ممتاز اسلامی ہیرو کی اس مختصر بیوگرفی پر نظر غائر ڈالتے ہیں اور غور و تعمق سے اسکے کارناموں پر ریویو کرتے ہیں تو ایک غرابت انگیز اور عجیب النوع منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور ایک جدید بصیرت حاصل ہوتی ہے عقل کے دروازے کھلنے لگتے ہیں طبیعت پر ایک خاص اثر ہوتا ہے۔ جس وقت اُس کا حلم و عفو اُس کے جود و کرم کے تابناک تذکرے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس درجہ با اقتدار و جاہ سردار جس کی زندگی کا ہر حصہ ممتاز ہر پہلو نمودار تھا ہر ادا جاں نواز ہر طور دلکش ہر کارنامہ بے نظیر ہے۔

جس کی کلاہ تفاخر پر چند در چند آفتاب کی روشنی سے جگمگا اُٹھنے والے طرّے نازو نازش کے ساتھ لگے ہوئے بصارت نوازیاں کر رہے ہیں۔ جس کے دلفریب و موثر اخلاق اُس کے جاں پرور تذکروں کی سبز روشنی میں عجیب ادائے دلبری سے چمک رہے ہیں جس پر بہادری و جانبازی قربان ہو رہی ہے جس کی علمی قدر دانیوں نے دربار کو شاہی دربار بنا دیا ہے۔ جس کی اولوالعزمی اور بلند ہمتی کا یہ عالم ہے کہ غنیم یورش آرا ہے میدان کارزار میں فوج لیے پڑا ہے۔ خطرات و خدشات کی گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ لیکن خود بصد طمانیت خاطری و فراغت قلبی شطرنج میں مشغول ہے افواج غنیم بڑھ رہی ہیں دم بدم قریب ہوتی جاتی ہیں۔ یہانتک کہ گولے ڈیرے میں آ کر گرتے ہیں۔ ہر جانب پریشانی و تشویش پھیل جاتی ہے مگر یہ فولادی قلب والا سردار مسکراتا ہوا اُٹھتا ہے اور قلیل تعداد سے غنیم کی بیشمار والتعداد فوج کو ہزیمت پر مجبور کر دیتا ہے۔ جس کے اخلاق کی یہ درخشاں کیفیت ہے کہ فرط رافت و عالی ظرفی سے کبھی کسی ماتحت کی خطا اور ملازم کے قصور پر نکتہ چینی نہیں لیتا۔ یہاں تک کہ جب نوکر کے پاؤں پڑ جانے سے زخم پھٹ کر باعث مزید کرب و الم ہوتا ہے۔ درد و دکھ میں ترقی ہوتی ہے اُسپر بھی وہ تصویر رحم مرقع کرم نمونۂ حلم مجسمہ اخلاق اظہار ناراضی سے مجتنب رہتا ہے کوئی سزا نہیں دیتا۔ بلکہ ایک اتفاقی امر سمجھ کر معاف کر دیتا ہے اور ایسی روشن و پاک زندگی بسر کر رہا ہے۔

ہم کو درحقیقت جسقدر یہ واقعہ اخلاقی متاثر کرتا ہے اتنا اور کسی امر کا نہیں ہوتا ہم جب اس خلق و انکسار کی کیفیت پر غور کرتے ہیں تو بے اختیار منھ سے تحسین و آفرین نکلتی ہے۔ یہی اخلاقی فضائل تھے جن سے ہمارے اکابر و مشاہیر متصف ہو کر منازل عروج و ترقی طے کرنے میں کامیاب رہے حقیقتاً اخلاق ہی ایک وہ چیز ہے جس سے حیوان و انسان میں نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے۔ اور آدمی آدمی ہو کر رہتا ہے۔ دنیا کی تمام عبادات و ہدایات اور عالم کی جمیع نصائح کا نتیجہ و ملخص یہ ہے کہ انسان کے اخلاق درست ہوں۔ عادات و خصائل میں

تہذیب پیدا ہو۔ اگر یہ نہیں تو باوجود صد ہزار فضائل و محامد کے انسان وقعت حاصل نہیں کر سکتا۔ اور نہ عیش و عافیت کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اور شگفتہ مزاجی اور خوش طبعی سے وہ لازماً محروم رہے گا۔ اسلام کے نمایاں خد و خال اُس کے حاملین کے اخلاقی کوائف ہیں اور یہی وہ محیر العقول اور حریت میں ڈالنے والے بواعث تھے جن پر اسلامی تحیر خیز عاجلانہ ترقی کی تابناک اور استوار بنیادیں قائم ہوئیں پر یوں حسن اخلاق مسلمانوں کی ممتاز خصوصیت رہی۔ جب اخلاقی حیثیت سے گر سے تمام ترقیاں مسدود جملہ فضائل جدا ہو گئے نہ وہ اسلام رہا نہ وہ مسلمان۔ آج یہ حالت ہے کہ ایک ادنیٰ فرد بھی کم از کم ممبران خانہ سے ہی اپنے غضب و اقتدار کا اظہار کر لیتا ہے اور حتی الامکان خفیف سی فرد گذاشت بھی بعد معذرت کے عفو نہیں کی جاتی۔ بزعم خود گویا ہم اسوقت تک شہریار عالم ہیں اور صد حیف کہ اس دور تاریک میں اخلاق کے معنی کمزوری و ضعف خیال کیے جاتے ہیں۔ ہم کو مشاہیر سلف کے کارناموں سے عموماً اور اُن کے اخلاق سے خصوصاً ایک دلنشین سبق لینا چاہیے۔ کہ باوجود آسمان مرتبت پر فائز ہونے کے وہ اپنے ماتحتیں و متوسلین سے کس نوعیت کا سلوک و برتاؤ روا رکھتے تھے۔ ممکن ہے کہ چشم بینا وا ہو اور خجالت و ندامت کچھ نتیجہ پیدا کرے

گاہے گاہے باز خواں این دفتر پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

مراد - مارہروی

ضروری گذارش: "تمدن" بلا طلب جن حضرات کی خدمت میں نمونۃً یا کسی معزز دوست کی تحریک سے پہنچے براہ کرم فوراً اپنے ارادۂ خریداری سے مطلع فرمائیں، ورنہ خاموشی رضامندی سمجھی جائے گی اور دوسرے ماہ میں ان کا نام درج رجسٹر کر کے تیسرے ماہ کا پرچہ بذریعہ وی پی بھیجا جائے گا۔ جس کا وصول کرنا ان کا قومی اور اخلاقی فرض ہوگا۔ **مینیجر۔**

یاس

عموماً یاس کو لوگ افسردہ دلی کا باعث سمجھے ہوئے ہیں۔ مگر غور کیا جائے تو یاس اکثر مواقع میں امید سے زیادہ مفید ثابت ہوتی ہے کوئی اس کا خیال نہیں کرتا۔

خود غرضی کے توقعات اکثر و بیشتر نقصان پہنچا کر کام نکالنے کے منصوبوں پر منحصر ہوتے ہیں۔ اگر ان منصوبوں پر پانی پھر جاتا ہے تو غرض مند مغموم ہوتے ہیں کف افسوس ملتے ہیں مایوسی اُن کے دلوں کو پژمردہ کر دیتی ہے۔ مدتوں اُلجھنوں میں مبتلا رہتے ہیں اگر عقل سے کام لیں تو یاس اُن کے لیے باعث راحت ہو۔ کیونکہ بُرائی سے کا دبراری کا نتیجہ تکلیف و ایذا میں مبتلا کرنے کا سبب ہوتا۔ جب یاس کی بدولت واقعی تکلیف سے نجات مل جائے تو کیوں نہ خوش ہوں۔ کیا اپنی صلاح و فلاح کے لیے دوسروں کو تکلیف میں مبتلا کرنے کا کوئی اچھا نتیجہ ہے؟ ہرگز نہیں ؎ از مکافاتِ عمل غافل مشو" کا ادب آموز ہر بدکردار کو آنکھیں نکال نکال کے ڈراتا رہتا ہے کہ دیکھ جیسی کرنی ویسی بھرنی ؎

راحِ راحت نیست در جام غم انجام طمع
کاش یاس از کف منہ کا لیاس احدی الراحتین

ل کے اُبھارنے سے خواہش نفس کے نکالنے کے لیے اکثر لوگ ایک دوسرے کی آبروریزی پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور نتیجہ نکلنے تک اس پر غور نہیں کرتے کہ ہم کس کام پر تُلے ہوئے ہیں امید بر آئی تو دوسروں کے ساتھ اپنی آبروریزی بھی ہوئی۔ خوش قسمتی سے مایوسی نصیب ہوئی عزت بچی۔ مگر اس حفظ عزت کا خیال نہ کرکے مایوسی کا رنج کرتے ہیں۔ اگر غور و فکر کریں یسے طول امل سے محترز رہیں۔ مغموم ہونے کی جگہ مسرور ہوں اور آئندہ کی توقع راحت یمنان خاطر کا باعث ہو۔

اے یاس! راحت کی وجہ اطمینان کا سبب افعال شنیعہ کی امیدوں کی جگہ تو نہیں ہو چا۔

اے یاس! جن نفسانی خواہشوں کی مخالفت میں تونے ساتھ نہیں دیا عزت گئی تباہی آئی نام کو بٹا اور دامنِ عفت پر دھبا لگا افسوس ہے اُن پر جو تیری وجہ سے رنجیدہ ہوں۔ تیرے احسان کو نہ سمجھیں نہ مانیں۔

اے یاس! تونے نیکیوں کی مخالفت میں جس کی طرفداری کی وہ رسوا ہوا ذلیل ہوا اور برائیوں کے خلاف میں تو جن لوگوں کے دلنشین ہوگئی وہ لوگ اخیار ہوئے ابرار ہوئے زاہد و پرہیزگار ہوئے۔ ترک خواہش نفسانی کوئی آسان بات نہ تھی۔ مگر اے یاس تجھ پہ آفریں ہے کہ احرار کے دلوں میں تونے جگہ پائی برائیوں کی لذت کو جو لوگ باعث مسرت سمجھے انھیں دھوکا ہوا۔ مگر افسوس ہے کہ مزہ چکھنے پر بھی تلخ و شیریں کی تمیز نہ کرسکے اور دھوکے ہی میں بعض تو مدتوں اور اکثر مرتے دم تک رہے۔ وہی لوگ اچھے رہے جنھوں نے برائیوں کی ظاہری لذتوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ اور برائیوں سے یاس موجب راحت سمجھے جو فی الواقع ہے بھی۔ یہ اخیار ہیں ان کے افعال بُروں کے مقابلہ میں اعجاز و کرامت سے کم نہیں۔

نیکوں کے پاس برائیوں سے یاس راحت، مسرت، عزت کا سبب ہے اور بُرے لوگ ہیں کہ بُرائی کی وجہ سے صدمات و تکالیف اُٹھانے پر بھی نہیں چوکتے۔ اُمید و یاس کی خوبی کی تمیز نہیں کرتے۔ ہر امید کے برآنے کو باعثِ مسرت اور مایوسی کو موجب غم سمجھتے ہیں لطف یہ کہ بہت سی اُمیدیں باعث زحمت ہوتی ہیں اور بہت سی مایوسیاں موجب راحت ہوتی ہیں۔ خدا نیک و بد سمجھنے کی توفیق دے۔ عسیٰ ان تکرہوا شیئاً وھو خیر لکم۔

ذہین

تمدن بک ایجنسی

اسلام اور موجودہ تمدّن

اگر کوئی مذہب صحیح دعویٰ اس امر کا کرسکتا ہے کہ اُسکے اصول عقل کے موافق بلکہ عین عقل ہیں تو وہ اسلام ہی ہے کہ جس نے اصول انسانیت کو مدون کرکے حیاتِ انسانیہ کو مکمل اور مستقل بنادیا۔ انسان کو جسمانی ظلمت کے قعرمذلت سے نکال کے اس روحانی اوج ترقی پر پہنچادیا کہ جس پر کسی قوم وملت کا دسترس آج تک نہو سکا۔ ایک ضعیف انسان کو اپنی حمایت میں لے کر ایک قوی تر انسان کے اُن تمام حقوق میں مساوی کردیا جو انسانی تمدن سے تعلق رکھتے ہیں۔ محمود و ایاز کو ایک صف میں لاکر کھڑا کردیا۔ قومگی اور بندہ نوازی کے تمائز کو بالکل اُٹھادیا۔ کیا دنیا میں بجز اسلام کے علاوہ کوئی اور بھی ایسا مذہب ہے جو اس امر کا عملی ثبوت تو درکنار دعوے بھی کرسکے کہ اُس نے ہر قسم کے باہمی تمائز کو یک قلم اُٹھادیا۔

وہ اوصاف جو انسانی قدرت سے بالاتر ہیں اُن میں تو البتہ تمائز رہا (کیونکہ خود طبیعت اسی کی مقتضی تھی) ورنہ اُن کے علاوہ بڑے سے بڑے تعتبارات میں بھی اسلام سب کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے۔

ذہانت، ذکاوت، طباعی، علم، تقویٰ، پرہیزگاری، اعمال صالحہ ان اوصاف میں چونکہ انسانی دخل نہ تھا اس لیے فطرت نے بھی اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ[1] اور لَا فضل لعربی علی عجمی الا بالتقوی[2] کے دستور العمل سے اس تمائز کو قائم کردیا ورنہ اسلام کے پیشوا نے اپنی لخت جگر بیٹی کے لیے واللّٰہ لو ان فاطمۃ بنت محمد[3]

---

[1] خدا کے نزدیک تم میں بزرگ ترین وہ شخص ہے جو سب سے زائد پرہیزگار ہو۔

[2] کسی عربی النسل کو کسی عجمی النسل شخص پر بجز اپنی پرہیزگاری کے اور کوئی فضیلت نہیں۔

[3] خدا کی قسم اگر محمد (صلعم) کی بیٹی (میری بیٹی) فاطمہ (علیہا السلام) چوری کریں تو میں اُنکے بھی ہاتھ کاٹ ڈالوں۔

سرقت لقطعت یدہا کا حکم جاری کرکے بخدا فطری مساوات کو اس کمال تک پہنچا دیا کہ جس کے بعد بجز انحطاط کے ترقی کی گنجائش ہی نہیں۔

یہ روشن اصول مساوات ہیں کہ جن کو خیال کرکے کلیجہ پھٹا جاتا ہے اور یہی وہ معتمد لعل ہے جس کی قربانگاہ پر چڑھنے کے لیے ہر سچے مسلمان کا دل شوخی کرتا ہے۔

ایک بطلِ اسلامی ارکانِ اسلامی کے منتشر اجزاء کو یکجا کرکے جب حبل المتین کی مثال قائم کرنا چاہتا ہے تو یوں ارشاد فرماتا ہے ایّہا الناس قد ولیت علیکم ولست بخیرکم فان احسنت فاعینونی وان اسأت فقومونی الضعیف فیکم قوی عندی حتی اخذ لہٗ حقہ والقوی ضعیف عندی حتی اخذ منہ الحق اطیعونی ما اطعت اللّٰہ ورسولہ فان عصیتہما فلا طاعۃ لی علیکم

اس ملکوتی صفات ذات نے ایسا کیوں کیا محض اس وجہ سے کہ اسلامی خوبیاں اسکے دل پر اثر کر چکی تھیں اس کے محاسن اسکے رگ و پے میں سرایت کر گئے تھے اور اسکے اصول اس پر مستولی ہو چکے تھے۔

جب کہ ایک مذہب کا دستور العمل ہی ان ہی اصول عدل و مساوات اور ان امور پر مبنی ہو کہ جن سے دنیا و آخرت دونوں کی فلاح و بہبود متصور ہو تو پھر کیوں نہ ایسی ملت کے ایک شیدائی کے خیالات اس قسم کے اصول میں ڈوبے ہوئے نظر آئیں۔

اسلام دیگر مذاہب کی طرح وہ جھوٹے شیدائی نہیں پیدا کرتا جو مذہب کی آڑ میں خود اسی کو اپنی قربانگاہ پر چڑھا کر ان تمام افعال شنیعہ کو جائز اور مستحسن کریں کہ جن کی

ﻟﮧ حضرات میں آپ کا حاکم مقرر کیا گیا ہوں حالانکہ میں آپ سے افضل نہیں پس اگر میں اچھے کام کروں تو میری مدد کیجیے گا اور اگر برے کام کروں تو میری اصلاح کیجیے گا آپ میں جو شخص ضعیف ہوگا وہ میری نظروں میں قوی رہے گا تاوقتیکہ میں اسکا حق اس کو نہ دلوا دوں اور جو قوی ہے اس کو میں اس وقت تک ضعیف سمجھوں گا جب تک کہ میں کمزور کا حق اس سے چھین نہ لوں آپ لوگ میری پیروی کیجیے جب تک کہ میں خدا اور اسکے رسول کی اتباع کروں اور جب میں انکی نافرمانی کرنے لگوں تو آپ لوگوں کو ہرگز میری اطاعت نہ کرنا چاہیے۔

تاید کسی فطری مذہب کی طرف سے ممکن ہی نہیں۔ اسلام ہی اکیلا وہ مذہب ہے جس نے اپنے انوار ساطعہ اور تعلیمات صحیحہ کے باعث انسان کو اُن گمراہیوں اور توہمات سے نکالا جو اُن کی قومیت اور ذہنیت کو دیمک کی طرح چاٹے جاتے تھے۔ شرک کو مٹا کر وحدانیت کاملہ کی تعلیم دی، تعدد آلہہ کو حرام کر کے تعدد ازدواج کو ترقی دی، اخلاق سیئہ کا تخلیہ کر کے اخلاق حسنہ سے آراستہ کیا، اوہام پرستی سے ہٹا کر عبادات و قیام پر قائم کیا غرض کہ سالہا سال کی ظلمانیت کو دور کر کے اپنے انوار ساطعہ کو اُن کے قلوب پر منعکس کیا کہ جس کی بدولت وہ اپنی حیوانی اور ہیولانی زندگی سے نکل کر آج اس انسانیت کاملہ کی معراج پر نظر آتے ہیں۔

وہی قومیں جو پہلے جنگلی اور وحشی تھیں اسلام کی تعلیم پا کر مہذب اور پاکیزہ بن گئیں اصلاح عقائد کی بدولت اُن میں عنایت اور مہربانی نمودار ہو گئی کہ جس سے نورِ ہدایت کی جھلک اُن میں پائی جانے لگی۔ اُن کی وہ کند اور بیکار عقلیں جن پر بُرے اخلاق خراب تربیت اور توہمات پرستی کا زنگ لگ گیا تھا اسی مستقل اور عام مذہب کی حقانیت کے صیقل سے صاف اور کار آمد ہو گئیں۔ ناحق شناس یورپ کو اسلام کا ممنون ہونا چاہیے کیونکہ اسلام ہی اُن کو اُس جہالت اور تاریکی سے نکالنے کا باعث ہوا ہے کہ جس میں وہ صلیبی جنگوں کے قبل تک پھنسے ہوئے تھے۔ یورپ کی اُس جہالت کے تاریک سمندر میں اسلام نے لائٹ ہوس کا کام دیا اور اُن کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو اس زور سے ٹھوکر لگائی کہ وہ کنارے جا لگی کہ جس سے اُن کی اُکھڑی ہوئی سانس منضبط اور باقاعدہ ہو کر چلنے لگی اور آخر میں اُن کی حیات اور روحانیت کا باعث ثابت ہوئی۔ اسلام کا سا معلم اُن کو ملا جس نے اُن ایسے وحشی اور غیر مہذب متعلم کو اپنی تربیت میں لے کر اپنے علوم و حقائق سے مستفید کر کے ایک کامل اور شائستہ انسان بنا دیا۔

اگر اسلام کی روشنی اہل یورپ تک نہ پہنچتی تو یقیناً اُن کی ہستی کی وہ ڈگمگاتی ہوئی کشتی اُسی تاریکی کے سمندر میں کب کی غرق ہو گئی ہوتی وہ اپنی قومیت کو بالکل فنا

کر چکے ہوتے اور اُن کی جگہ پر اس وقت ہم کو کوئی دوسری نئی قوم ایکٹ کرتی ہوئی نظر آتی۔

ہمارے علوم و فنون سے یورپ کا ابتدائی اکتساب اس امر پر کافی روشنی ڈالتا ہے کہ اسلامی علماء و فلاسفر کو ہر امر میں یورپ پر سبقت حاصل ہے اور اُس کے مہذب و متمدّن بنانے میں ایک بڑا حصہ اسلام کا ہے۔ پھر اخلاقی سیاسی ادبی تالیفات اسلامی کی طرف اُن کی موجودہ احتیاج اور بھی ہمارے دعوے کو مستحکم کرتی ہے۔

ساتھ ہی اس کے ہم یہ اظہار کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتے کہ جہاں اُنھوں نے اس قسم کے فوائد اسلام سے حاصل کیے وہاں علوم اسلامیہ کی اُسی حد تک اصلاح بھی کی کہ جس کا استداد زمانہ مقتضی تھا چنانچہ یورپ کے علماء نے جب سالہا سال کی تاریکی سے سر نکالا تو اُن کو فضائے عالم میں ایک روشنی نظر آئی جو اسلام کی روشنی تھی کہ جس کو انھوں نے غنیمت سمجھکر اُس سے پوری طرح فائدہ اُٹھایا۔ چنانچہ اسلامی علوم کو حاصل کرکے اپنی ملکی زبانوں میں اُن کے ترجمے کیے اور جب کل علوم و فنون اور موجودہ اکتشافات میں پوری ترقی کر چکے تو اُن اسلامی اصول کی اصلاح کی جو تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف تھے۔

اسلام اور اُس کے پیرو متعصب اور احسان فراموش نہیں ہیں کہ وہ یورپ کی اُس اصلاحی فضیلت کا انکار کریں بلکہ ہم نہایت آزادی اور خلوص کے ساتھ کہتے ہیں کہ اُس اسلامی جہالت اور استبداد کے زمانہ میں اگر یورپ ہمارے علوم و فنون کو نہ سنبھالتا تو تمام اسلامی علوم مندرس ہو جاتے اور اُن پر جہالت غالب آجاتی۔ مغربی علماء نے اُس وقت ہمارے علوم کو سنبھالا اُن کو ضائع ہونے سے بچایا اور اس طرح جہاں اُنھوں نے ہم سے صدہا فوائد حاصل کیے وہاں اس اصلاح و محافظت سے ہم کو بھی مستفید کیا۔

بہر حال وہ ہر طرح سے ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں اور اس لیے ہم اس اصلاح کے ہر موقع پر اُن کا شکریہ ادا بھی کرتے رہتے ہیں۔

یورپ کے پاؤں سے جہالت کی بیڑیاں کس نے کاٹیں اُس کی گردن سے تقلید کا

قلادہ کس نے دور کیا اس کا سبب اسلام کے پاکبانہ پیشرو اور اس کی سچی کتاب کے علاوہ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔ اخلاقی انحطاط اور مادی تنزل کے باعث جو پردے اہلِ مغرب کی آنکھوں پر پڑ گئے تھے کیا اُن کا اُٹھانے والا اسلام کے علاوہ کوئی اور تھا۔

ہم اپنے گذشتہ بیان سے اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ اسلام ہر ملک کے تمدّن کی روح ہے اور کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا کہ جس میں کوئی ملک بھی اس سے بہتر تمدّن پیش کر سکا ہو اور نہ آئندہ اس کی اُمید ہے۔

میرے ان خیالات کو کوئی شخص میرے مذہبی تعصب پر محمول نہ کرے کیونکہ کتب تاریخ کی ورق گردانی کرنے سے یہ دعاوی روز روشن کی طرح صاف اور نمایاں نظر آتے ہیں اور یہی نہیں کہ صرف ہماری ہی تاریخیں اس کی شہادت دیتی ہوں بلکہ خود اہلِ مغرب کی تاریخیں اور اُن کے بیانات بھی کافی طور سے ان مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔

اگر تفکرات زمانہ نے مہلت دی تو میں آئندہ کسی موقع پر مغربی حکماء کے نقطۂ نظر سے اسلام کو پیش کروں گا اور بتاؤں گا کہ وہ اسلام کے متعلق کس قسم کے خیالات رکھتے ہیں۔

الیاس قرشی

غزل

کوئی فریاد رس مظلوم کا ہوتا تو کیا ہوتا
جو ظالم کچھ مرا بھی آسرا ہوتا تو کیا ہوتا

جب اتنی نارسائی پر فلک کا دل ہلاتا ہے
کہیں نالہ اگر میرا رسا ہوتا تو کیا ہوتا

تم اٹھلاتے ہو رفتار سے دشمن کے گھر پہنچے
اگر اک حشر برپا ہو گیا ہوتا تو کیا ہوتا

لحد پر بیٹھ کر میری عبث تم رنج کرتے ہو
ذرا سوچو کہ میں جیتا رہا ہوتا تو کیا ہوتا

جب اس حالت میں جینا کر دیا دو بھر خدائی کا
خدا ہی جانے وہ بت گر خدا ہوتا تو کیا ہوتا

جب اتنے پاس ہونے پر بھی سکو ڈھونڈتے ہیں ہم
خدا جانے اگر کچھ فاصلا ہوتا تو کیا ہوتا

تصوّر میں کسی کے محو تھے ہم رات دن افسر
اگر ایسے میں کوئی آ گیا ہوتا تو کیا ہوتا

افسر میرٹھی

عورت کا ضعف

عورت ابتدائے خلقت سے مردوں کے زیر اثر رہی مردوں نے جس وقت جس طرح جس طرف چاہا۔ متوجہ کر دیا۔ اور وہ متوجہ ہوگئیں۔ جیسا چاہا حکم دیدیا تعمیل کرنے لگیں مگر یہ کیوں۔ اس وجہ سے کہ وہ ضعیف ہیں؟ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہزاروں تالیفات جو مرد کے قوت و جبروت کی معترف اور قائل ہیں کیوں اس بات کو تسلیم کرتیں۔

بیشک مرد قوی اور غالب ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ عورتوں نے کبھی اپنی قوت مدافع سے مرد کے مقابلہ میں کام نہیں لیا۔ اگر وہ برابر ہوتیں تو ضرور ایک نہ ایک دن ایسا کرتیں۔ جیسا کہ دو متساوی القوت عامل کی شان ہے۔

یورپ کی عورتیں اس قدر آزاد ہیں۔ لیکن اُن کی آزادی کا سبب کون ہوا؟ مرد اگر یہ نہ چاہتے تو وہ کبھی نہیں آزاد ہوسکتی تھیں۔ ایک قوی اپنے ضعیف پر جس طرح چاہے حکم کرسکتا ہے اور جب چاہے اُن کا بار ہلکا کر دے۔

وہ جسماً ضعیف ہیں۔ لیکن کہا جاتا ہے۔ کہ مردوں کے جبر نے ایسا کر دیا۔

انسان کو چھوڑیے۔ حیوانوں کو دیکھیے۔ نر اور مادہ میں کیا فرق ہے۔ کیا مردوں کی طرح نر حیوانوں نے ان پر سختی کی۔ نہیں خود خالق عزوجل نے یہ تفریق کردی ہے اُن کے ضعف کے مناسب اُن کا فرض جدا۔ اور اُن کے ضعف کے موافق اُن کا [illegible] مقرر کر دیا ہے۔

لیکن ہمارا یہ ثابت کرنا کہ مرد جسماً قوی ہیں۔ اس بات کی تفسیر نہیں کرتا کہ قوت میں [illegible] کی دلیل ہے۔ نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وحشی۔ انسان [illegible] اور یقیناً اُس کے وجود کو دنیا سے نیست و نابود کر دیتے۔

دنیا [illegible] نوع [illegible] قوی ہیں لیکن باوجود اس کے [illegible] نوع انسان کو کوئی نقصان [illegible] نہیں [illegible] اس کا سبب یہ ہے کہ مرد اپنے [illegible]

تفکر و ادراک سے غالب رہا۔ لیکن اب ہم کو اُن کی ادراکی حیثیت کا مقابلہ کرنا پڑا کیا عورت مردوں سے ادراک کا ضعیف ہے؟ ہاں ضعیف ہے۔

ہمارے اس قول کی تائید موجودہ، گذشتہ زمانہ کرتا ہے۔ شواہد عینی شاہد ہیں۔ کہ جتنے بڑے بڑے کام ہوئے۔ مردوں کے ہاتھوں سے کسی عورت نے حصہ نہیں لیا۔ اور اگر کوئی کام کیا۔ تو معمولی جس کی کوئی وقعت نہیں۔ نہ اُن کی کوئی اہمیت ہے اگر کوئی شخص کہے کہ یہ واقعہ ہے۔ لیکن ہم اسکو نہ بھول جائیں گے کہ ہمارے ظلم نے ایسا کیا کہ اُن کو تعلیم سے محروم رکھا۔ اُن کو دقائق امور پر غور و خوض کرنے کا موقع نہ دیا لیکن خط مستقیم اس قول کا متعارض ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ مدرکہ انسانیہ مبادی علوم اساسیہ کی تعلیم پر موقوف ہیں۔ اس کے لیے اس کے ساتھ عمل اور کوشش اور مادہ کی ضرورت ہے۔ اور وہ اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے۔ جب تمام باتوں سے قطع تعلق کر لیا جائے اور صرف اسی کا ہو کر رہے

مگر کیا عورتیں مردوں کی طرح ہر کام میں دخیل ہو سکتی ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو اُن کی زندگی کا تمام دور اُن کے راستہ میں ایک رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ مرد۔ مدرسہ سے لے کر عمل کی حالت تک پھر معاملت، تجارت۔ صناعت، وغیرہ میں اپنے معلومات کو وسیع کرتا رہتا ہے بخلاف عورت کے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتی اُن کا زمانہ حمل، وضع، ارضاع، تربیت تدبیر منزل اُن پر جبر کرتی ہیں کہ وہ اپنی زندگی کے بڑے حصے کو اس کام کے لیے وقف کر دیں اور حصول معاش کی فکر سے دور رہیں اس بنا پر یہ محال ہے کہ وہ مردوں کی طرح اپنی معلومات وسیع کریں اگر ہم اسے تسلیم کریں کہ اُن میں اور مردوں میں معلومات کے قبول کرنے کی استعداد برابر برابر ہے اور وہ مردوں کی طرح سب کر سکتی ہیں لیکن درحقیقت مردوں کی زندگی میں اُن کی شرکت مردوں کو کس قدر فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ اگر ہمیں ان رسالوں نے دھوکا نہیں دیا جو یورپ اور امریکہ کی عورتوں کا طبیعی اور فلکی علوم میں معراج کمال پر پہنچ جانا بتلاتے ہیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ اُن کے اس درجہ پر پہنچ جانے سے ہمیں کیا فائدہ ہوا۔

اُنھوں نے اپنی حالت پر سخت ظلم کیا۔ کہ قانون قدرت کے خلاف شادی کرنے سے اپنی عمر کے ایک بڑے حصے بلکہ موجودہ عمروں کے لحاظ سے آخری حصے تک انکار کردیا۔ اُنھوں نے اپنے وطن کو کوئی نفع نہیں پہنچایا بلکہ اپنی صالحہ ذریات سے محروم کردیا۔ اگر وہ تعلیم کے حصول میں اس درجہ منہمک نہ ہوتیں۔ اور جوانی کی عمر میں شادی کرلیتیں تو وہ پانچ عالم ایسے پیدا کرسکتی تھیں جو اُن سے دونا فائدہ اپنی قوم اور ملک کو پہنچانے اور قوم اُن کا شکریہ ادا کرتی۔

اس لحاظ سے متمدّن عالم کی وہ عالمہ جس نے اپنے طبعی فرائض کو چھوڑکر جس کے لیے پیدا کی گئی تھی دوسرا کام اپنی شان سے بعید اور مطلب سے دور اختیار کرلیا ایک عالم کی نظر میں وہ سخت گناہ گار بن گئی۔

اب رہا یہ امر کہ پینتالیس۴۵ برس کے بعد جب اپنے علم کی تکمیل کرچکیں تب شادی کی۔ اس کے متعلق فرانس کا ایک رسالہ لکھتا ہے۔ کہ کیا ایسی امید رکھی جائے گی کہ وہ اس سن میں کوئی بچہ پیدا کرسکینگی نہیں اُن میں تو یہ صلاحیت ہی نہیں رہی۔

اب غور کیجیے کہ طبعی یا سیاسی علوم کے اندر پڑکر اُنھوں نے اپنے وطن کو کس قدر ظلم کیا اور بجاے اسکے کہ وہ کوئی فائدہ پہنچاتیں نقصان پہنچادیا۔ یعنی ممکن تھا۔ اُن سے کوئی بچہ ایسا پیدا ہوتا۔ جو فلسفہ میں جون لیمان کی طرح۔ طبیعات میں ہکسلے کی طرح عمرانی میں اسپنسر کی طرح ہوتا جس سے شیّہ ملک کو فائدہ پہنچتا۔ مغربی مرد شکایت کرتے ہیں کہ وہ ایسے کام میں شریک ہوگئیں۔ جن سے دور رہنا چاہیے تھا۔

فلسفہ کا جید عالم جون لیمان کہتا ہے کہ ہم اس سے خوش نہیں ہوتے کہ ہماری بیوی ڈاکٹر ہے۔ ہم کو خوشی اس سے ہوتی ہے کہ وہ عورت عورت کی طرح ہے۔ اُسکی ڈاکٹری ہمکو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

سحبان۔

تاثرات

عبرت کی کس بیرسی ہے محو دادخواہی — اے چشم خوش تماشا تو اور غلط نگاہی؟
محشر سے پہلے اکدن برپا کرے گی محشر — تیری جفا نوازی میری وفا پناہی
بس منھ کہیں چھپائے رنگ سفید کاری — اظہار سرخروئی ہے وجہ روسیاہی
بالیدہ روح کو کرے غم کی گرم جوشی — افسردگی فزا ہے راحت کی عمر کاہی
وہ چشم نشہ آگین کب بات پوچھتی ہے — ساقی کا منھ بہ حسرت دیکھا کرے جماہی
اک مدعی کی کشتی راحت نصیب ساحل — اور اک مرا سفینہ پروردۂ تباہی
اے غیرۂ ستم کیوں رنج بہانہ جوئی — خود معترف ہے مجرم کیا حاجت گواہی
ہمسا بھی کوئی ہوگا محروم دین و دنیا — رد کردہ ادا مرحسرت کشتۂ مناہی
رہن ہوس فروشی وقف محال سنجی — سر ہے کہ عین سودا دل ہے کہ محض واہی
شوخی مجاز کی خود پردہ اٹھا رہی ہے — جلوے کی اب حقیقت کھلنے کو ہے کماہی
گلچیں سمجھ خدارا راز نسیم و شبنم — یہ گریۂ شبی ہے وہ آہ صبح گاہی
جو ظلم ہو بجا ہے میری یہی سزا ہے — اک عیب جاں نثاری اک جرم بیگناہی
اے بخت خفتہ دیکھا اک خواب کا سماں تھا — وہ اقتدار شاہی وہ شان کج کلاہی
وقتی کرشمہ نکلا نیرنگ آسماں کا — جمشید بارگاہی افراسیاب جاہی
اے دور گریۂ خوں اب بھی کہیں ہیں پیدا — وہ بزم کے رنگیلے وہ رزم کے سپاہی
میرا فسانۂ غم مصداق ناتمامی — میری شب مصیبت مفہوم لاتناہی

کچھ صحت آفریں ہے آب و ہوائے دور
آزار رعب کی بھی تدبیر اب الٰہی!

ابوالصواب رعب قریشی انصاری

آرزوئے خام یا عشق ناکام

محبت کے فدائی۔ الفت کے شیدائی۔ عشق کے بندۂ اسیر، دل فروشی پر ہر وقت آمادہ، نصرت نے آخر والدین کے اصرار اور اُن کے احکامات پر طوعاً کرہاً گردن اطاعت خم کر دی، بلبل آزاد پر نغمۂ بلبل کو تاہل کے دام میں پھنسا دیا۔ لیکن دل میں پُرسوز پُرارمان دل میں یہ خلش پنہاں ہمیشہ کہ زندگی آنے والی زندگی میں کبھی نہ کبھی اس قید تاہل سے سبکدوش ہو۔ اور کسی کا ہو رہے یا کسی کو اپنا کر رکھے۔ آنے والی مسرت خیز ساعتیں ایسی ہوں کہ انتخاب کا سہرہ اپنے ہی سر رہے۔ یہ ایک ایسی خواہش بیجا۔ اور جذبات امید افزا تھے کہ بعض اوقات اپنے بس میں نہیں رہتا۔ اسی ہجوم جذبات انھیں آلام و افکار میں اسقدر منہمک کہ مہینوں اپنے شریک حیات۔ نشاط زندگی سے غافل کہ گھر میں گویا کوئی اُس کا منتظر اُس کا ہمدرد، اُسکا چارہ ساز دل بیقرار ہے ہی نہیں، رات دن اسی دیوانہ سری اسی تلاش عبث میں کوئی گوشہ کوئی کونہ ایسا نہ ہوگا کہ جہاں اس نے اپنی دریوزہ گری کے ثبوت میں نقش قدم نہ چھوڑے ہوں، لیکن منزل مقصود کا پتہ نہیں ساحل مراد کو کوسوں دور پاتا۔ کیونکہ اس کا مطمح نظر کوئی ایسا کام تو نہ تھا کہ وہ فوراً اپنے مقصد حیات میں شادکام ہوتا۔ لیکن نصرت نے اپنی سعی تلاش محبت میں برابر جاری رکھی اور یہ سمجھکر کہ وہ جس محبت آمیز الفت ریز زندگی کا خواہاں ہے ایک نہ ایک دن ملے گی ضرور ملیگی۔

ایک دن جبکہ اپنی مدت کی صحرا نوردی سے تنگ آکر آبلہ پائی کی تنقیح کرنے میٹھا تو اُسکا دل نہایت پُریاس تھا کہ آہ ہنوز وہ کسی کے زلف شبگوں کا اسیر نہیں ہوا۔

محبت کی داستانیں پڑھتا حسن عشق کی کہانیاں سُنتا۔ اور اُس میں اسقدر محو ہوجاتا اور سمجھتا کہ شاید ان ہی قصوں۔ ان ہی افسانوں میں اُس کا مطلوب۔ محبوب، چھپا ہو۔ عجب نہیں کہ پردۂ مستورسے نکل آئے اور جمال جہاں آرا سے دیدۂ دیدار طلب کو تسکین پہنچائے۔ وہ گھنٹوں اسی انتظار میں رہتا دیکھتا کہ جلوۂ لیلےٰ کا پتہ نہیں تو اس محویت سے

بیدار ہوتا اور ایک آہ پُر درد سینۂ محزوں سے کھینچتا۔ اور اپنی حسرت و مایوسی پہ زار زار روتا۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ وہ کسی تصویر کو جو اپنے لیے جاذب نظر سمجھتا اٹھا لیتا اور ایک پرستش طویل ایک سکون منجمد سے پرستش کرتا اسقدر پرستش کرتا کہ وہ تصویر اُسکی نظروں میں حرکت کرتی اور بولتی دکھائی دیتی اور وہ اُس سے اپنے اوہام باطلہ اپنے تخئیلات نادرہ کا نغمہ غایت الحاح نہایت تضرع قلب سے اُن الفاظ میں کہ جنہیں کسی کے تسخیر کرنے کا اثر پاتا چھیڑتا۔ یہ استغراقی کیفیت اسوقت تک مستولی رہتی جب تصویر ہاتھ سے گر ایک ہلکی سی صدا سے اُسے بیدار کرتی اور وہ سمجھتا کہ آہ یہ بھی میرے تخیل کا ایک ادنی سا کرشمہ تھا۔ پر وہ نہایت ہی متالم اور المناک ہوتا یہ صرب اُسکے دل حزیں کے لیے بُری ہوتی اور ایک ہلکی سی چیخ سے دل ہی دل میں مقید رہنے والی آہوں کو آزاد کرتا۔

اگر چہ نصرت کا سرمایہ ہستی، مونس تنہائی اس قابل تھا کہ دنیائے محبت و الفت کا پُتلہ وفا ہمدردی کا مرقع۔ لیکن نصرت اُسکی طرف مطلق التفات نہیں کرتا۔ اُسکی سچی محبت کو نفرت کی نظر سے دیکھتا۔ اُسکے جذبات کو ناقابل تسخیر سمجھتا۔ مگر وہ وفا سے عہد کا نمونہ کبھی اپنی خدمت گذاریوں میں کوتاہی نہ کرتا۔

ایک دن نصرت کے یہاں کچھ تقریب تھی اور احباب و عزیز و اقارب کا اچھا خاصہ مجمع تھا۔ نصرت موقع کا طالب کہ آج کسی نہ کسی کو اپنا دل نذر کردے۔ اسکا جنون اسقدر ترقی پذیر ہوا کہ بغیر سوچے سمجھے خواہ مخواہ اسیر الفت ہو گیا۔ اور آئندہ کامیابی کی دلخوش کن نداہیر میں مصروف۔ قسمت کہیے یا اتفاق وقت کہ وہ بھی کسی قدر اسکی جانب مائل دکھائی دیا۔ یہ ایسا امید افزا مسرت انگیز سین تھا کہ دل پر گہرا مرتسم ہوکر رہا۔

اب فکر یہ لاحق ہوئی کہ مجمع تو دو ایک روز میں پریشان ہو جائیگا نمعلوم کہ آئندہ کن کن مصائب سے دست و گریباں ہونا پڑے۔ ریگزاروں میں کہاں کہاں کی ٹھوکریں نصیب ہوں عشق کے کرتب مشہور ہیں یعشق میں اثر کیمیائی ضرور۔ مجمع تو پریشان ہو گیا لیکن نصرت کا گل سرسبد نصرت کا نخچیر لاغر چند سے نصرت کا ادمہمان رہگیا۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر نصرت نے اپنی بے سود کوششیں شروع کیں کہ آہوے رم خوردہ رام ہو۔ اگرچہ وہ تغافل شعاریاں جو جنس لطیف کی جان ہیں

دیکھتا لیکن راہ گم کردۂ محبت، نصرت اسی کو مدعائے کامیابی خیال کرکے برابر وصال کی شوق افزا تمناؤں میں محو رہنے لگا۔ آیندہ زندگی کی خیالی خوشنما عمارتیں بنانے میں وہ ایک فرد تھا۔ آخر کب تک وہ بھی کہ جس پر نصرت مٹا ہوا تھا دوسرے کا شریک حیات تھا اپنے گھر چل دیا۔ اگرچہ یہ صدمہ نہایت سنگین۔ دل شکن ضرور تھا لیکن فریب خوردۂ امید نے ضبط سے کام لیا۔ روزانہ دیدار دوست میں کوئے جاناں کے چکر اپنا وسیلۂ کامیابی سمجھا۔ مگر اتنا ضرور ہوا کہ روزانہ کی آمدورفت سے نصرت پہروں خریدار دل کے کاشانۂ دسلے میں گھنٹوں بیٹھکر اپنے رفیق کیسے یا محافظ حسن و عشق سے گفتگو کیا کرتا لیکن جب کبھی غور کرتا تو ساحل مراد کو اپنے سے دور پاتا مگر بندۂ امید نے مایوسی کو کبھی اپنے دل میں بھولے سے بھی جگہ نہیں دی اور دل کو یہی کہہ کر سمجھایا کہ ایک نہ ایک دن شاہد مقصود کنار تمنا میں ضرور جلوہ افروز ہوگا۔ اور ادائے دلربا یانہ سے مست الست بنائے گا۔ نصرت کی جنوں خیزی خبط کے انتہائی نکتہ پر نظر آنے لگی بعض اوقات اسکی زبان سے ایسے الفاظ نکل جاتے کہ جس میں اپنے آلام عاشقانہ اپنی حیات معاشقہ کا پہلو نمایاں طور پر دکھائی دیتا۔ نصرت جو بخت برگشتہ کا مترادف یا ہم جنس ہے عین اس عالم میں جب کہ اسکے داعیات مدحی اسکے لیے بزعم خود پیام آور قلب محزوں تھے نصرت کے رقیب کو شبہہ سا ہوا اور اس نے ایک دن صاف صاف کہدیا۔ بہتر ہوتا کہ آپ اپنے پائے طلب کو کوتاہ کرتے۔ عنان ہمت کو موڑتے۔ فرس محبت کو لگام دیتے۔ نہایت تمناک تھا وہ نظارہ نہایت اندوہناک تھا وہ سین جب کہ غریب نصرت لاچار نصرت لاعلاج ہوکر سرد آہیں بھرتا ہوا بادل ناخواستہ "بہت بے آبرو ہوکر ترے کوچہ سے ہم نکلے" کہتا ہوا واپس ہوا ادھر نصرت کا سرمایۂ انتہائی جبکہ اسنے نصرت کی بے التفاتیاں حد سے زیادہ گذرتی ہوئی دیکھیں تو اپنے والدین کے گھر چلا گیا۔ یہ جانا ایسا تھا کہ جس میں تمنائے دلکی نقش برآب۔ یا عمارت ہوائی۔

بیچارہ نصرت گئے دونوں جہان کے کام سے "ہم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے" کہکر مایوسانہ زندگی میں اپنے بقیہ حیات کے دن بسر کرنے شروع کیے

محمد عبد الرزاق بسمل حیدرآبادی
(دار العلوم)

خمسہ

تجھ کو جو مری الفت اے رشکِ قمر ہوتی   سیدھی ہی رہا کرتی۔ ترچھی نہ نظر ہوتی
بے درد۔ رسا میری تقدیر اگر ہوتی   آہِ دلِ پُر حسرت ممنونِ اثر ہوتی
تو رات کو آجاتا۔ دن کو نہ خبر ہوتی

اندوہ و مصیبت سے بیخودی میں ہو جاتا   دلسوزی و کلفت سے بیخودی میں ہو جا
اس کرب کی حالت سے بیخودی میں ہو جاتا   فرطِ غمِ فرقت سے بیخودی میں ہو جاتا
مجکو نہ خبر ہوتی اُن کو تو خبر ہوتی

تاثیر میں گر کامل افسونِ نظر ہوتے   اُس چشمِ فسوں گر کے مفتونِ نظر ہوتے
آنکھوں میں سما جاتے مرہونِ نظر ہوتے   دل اور جگر دونوں ممنونِ نظر ہوتے
کچھ درد ادھر ہوتا کچھ ٹیس ادھر ہوتی

مجکو دمِ آخر وہ صورت تو دکھا جاتے   دیدار کے جلوے سے بیخود تو بنا جاتے
جاگا ہوں بہت دن کا اب مجکو سلا جاتے   اے کاش وہ مقتل میں اس شان سے آجاتے
منھ میری طرف ہوتا خنجر پہ نظر ہوتی

کہتے ہیں محبت کو یہ باعث کلفت ہے   آفت ہے مصیبت ہے زحمت ہے قیامت ہے
پوچھے جو کوئی مجھ سے یہ باعث راحت ہے   عشقِ بتِ بیگانہ اے شیخ غنیمت ہے
یہ غم نہ اگر ہوتا کس طرح بسر ہوتی

قربان میں ہو جاتا اُس قامتِ موزوں کے   صدقے ہی میں ہو جاتا اُس چشمِ پُر افسوں کے
کہنے میں نہ میں آتا ہرگز دلِ محزوں کے   ٹکڑے ہی میں کر دیتا جامِ مے گلگوں کے
گر میری طرف باسط ساقی کی نظر ہوتی

میرا گھر

(۱)

صبح وطن از شام غریباں خوشتر سوز وطن از سبزی بستاں خوشتر
باغ وطن از روضۂ رضواں خوشتر حب وطن از ملک سلیماں خوشتر (ارشد)

حب الوطن من الایمان۔ حب وطن ایک عالمگیر جذبہ ہے، کوئی دل و دماغ اس جذبہ سے خالی نہیں، جس قدر انسان اپنے وطن سے دور ہوتا جاتا ہے، اُسی قدر یہ جذبہ بڑھتا جاتا ہے، گھر بیٹھ کر ہم حب وطن کی لذت و سرور سے لطف اندوز نہیں ہوتے اور نہ اُسکی ماہیت ہی سے متکیف ہو سکتے ہیں، وطن کی دوری کے ساتھ ہی اس جذبہ کی گہرائی اور وسعت بڑھتی جاتی ہے۔ جو لوگ وطن میں غیر بیگانے معلوم ہوتے تھے وہی پردیس میں آکر عزیز رشتہ دار معلوم ہوتے ہیں، جب انسان وطن سے بہت ہی دور چلا جاتا ہے، تو شیدائے وطن کی محبت اسقدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ اپنے ملک کا جانور یا پودا دیکھتے ہی تڑپ اٹھتا ہے اور اُس کی آنکھیں پُر نم ہو جاتی ہیں۔ ؎

چوٹ سی دل پہ لگی آنکھ میں آنسو بھر آئے
جب کبھی عالم غربت میں وطن یاد آیا

پنجاب میں رہتے ہوئے ہر شخص اپنے ضلع یا گاؤں کو ہی پیارا وطن تصور کرتا ہے لیکن وہ شخص بنگال جانے پر سارے پنجاب کو وطن سمجھتا ہے، جاپان جا کر سارا ہندوستان اپنا وطن معلوم ہوتا ہے امریکہ یا یورپ جا کر ایشیا اپنا وطن معلوم ہوتا ہے، اور جب آدمی خیال کے ہوائی جہاز میں سوار ہو کر کسی اجرام فلکی میں پہنچتا ہے تو اُسے ساری زمین ہی وطن معلوم ہوتی ہے اور جب نظام شمسی سے نکل کر کسی پڑوس کے دوسرے کرہ کی

سیر کرتا ہے، جہاں سے ہم تک روشنی پہنچنے کے لیے صرف تین سال کا عرصہ لگتا ہے تو وہ اپنے نظام شمسی کو ہی اپنا وطن کہتا ہے، اور اُسے یہ کُل سال زمین ایک جھونپڑی سے زیادہ نظر نہیں آتی !۔

انسان کو ہفت اقلیم کی بادشاہت کیوں نہ حاصل ہو جائے، اُسکو سر بفلک رشکِ رضواں محلوں پر تسلط کیوں نہ مل جائے، پھر بھی وہ اپنے وطن کے لیے بے چین رہتا ہے، تڑپتا رہتا ہے، اس کی کیا وجہ ہے ؟ وطن کیوں پیارا اور دلکش معلوم ہوتا ہے؟ وہ کون سی چیز ہے جو اسکو مجنونانہ طور پر وطن کے لیے تڑپاتی رہتی ہے ؟

سب جانتے ہیں یہ اللہ ہی چیز گھر ہے ۔

(۲)

چیونٹیاں سارا دن خوراک کی تلاش میں گھومتی رہتی ہیں، شام کے وقت اُن کا کہاں کا عزم ہے ؟ پرندے سارا دن اُڑتے چُگتے پھرتے ہیں، شام کو وہ کس طرف جلد جلد جا رہے ہیں ؟۔ گھر کو، ہم بذاتہ خود گھر سے باہر نکلتے ہیں، تمام دن گھر کے لیے باہر کام کرتے ہیں شام کو پھر گھر کی طرف لوٹتے ہیں ہماری ساری جد و جہد کا مرکز گھر ہے' بیا ئیں ہیں جو ہمیں گھر کے لیے بیتاب رکھتی ہیں " والدین کی محبت اور شفقت' بہن بھائیوں کا پیار' الفت' بچپن کی یادگاریں جوانی کی تمنائیں' بڑھاپے کے سہارے' ہمسایوں کے لطف' بال بچوں کی رونق وغیرہ بے گھر ہونا بڑی ذلت اور محرومی خیال کی جاتی ہے، پردیس میں جاکر اس حقیقت کا راز کھلتا ہے، جب دُکھ درد کے وقت کوئی دو آنسو بہانے والا نہیں ملتا، جب ہمارے غم و کرب نہ کسی کے دل کو ٹھیس لگتی ہے اور نہ ہی کوئی ہماری خاطر اپنے عیش کو منغّص کرتا ہے ۔ گھر ہی میں عزت، امن، قرار اور

حفاظت ہے، گھر محبت۔ اُلفت۔ اُنس۔ ہمدردی۔ اتفاق۔ اتحاد۔ امن امان کا ایک مضبوط قلعہ ہے جہاں ہم دنیا کی کشمکش حیات کے نامساعدت حملوں سے بچنے کے لیے پناہ گزیں ہوتے ہیں۔

(۳)

جس طرح ہم گرمی۔ سردی، برسات، آندھی، طوفان اور چوروں سے بچنے کے لیے کچی پکی چار دیواری کے گھر بناتے ہیں۔ اسی طرح ہم شبہ۔ شک۔ پریشانی بیقراری شہوت و غضب وغیرہ سے محفوظ رہنے کے لیے ذہنی یا خیالی گھر تیار کرتے ہیں خیالات کی بڑی بڑی عمارتیں کھڑی کرتے ہیں۔ ان کو شاعری کے جذبات، دلائل کے چراغ سے منور کرتے ہیں۔ افکار دنیا سے تنگ کر چور ہو کر انھیں خیالی گھروں میں وقتاً فوقتاً پناہ لیتے ہیں فلسفے کے نشہ میں مدہوش ہو کر اپنی فکروں اور اندیشوں کو بھول جاتے ہیں۔ انسان اور حیوان میں بڑا فرق یہی ہے کہ حیوان انسان کی طرح ذہنی عمارتیں تعمیر نہیں کرسکتا۔ گو وہ انسان کی طرح خاکی گھر بنا لیتا ہے۔

کسی ملک کو عالیشان محلوں اور بے نظیر شہروں سے اصلی عظمت حاصل نہیں ہوتی، بلکہ ملک کی بزرگی اور عظمت کا سبب اعلےٰ خیالات ہیں، قوتِ خیال کے آگے تمام مادی طاقتیں بیکار ہیں۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ خیال کے بغیر آدمی قدرت کا غلام ہے، لیکن قدرت یا خیال آدمی کے گھر کی لونڈی ہے۔

(۴)

پرندے جب تک زندہ رہتے ہیں۔ اپنے گھونسلوں کو نہیں چھوڑتے، اسیطرح دوسرے جانور بھی، اپنے بلوں اور گھروں سے عمر بھر نباہتے ہیں۔ لیکن انسانی زندگی، حیوانی زندگی نہیں، دونوں کے مقاصد میں زمین و آسمان کا فرق ہے، خداوند تعالےٰ نے آدمی کو ایک محدود احاطہ میں بند رکھنے کے لیے پیدا نہیں کیا، یہ جادو کا پُتلا

ذرۂ زمین پر کھڑا ہو کر اپنی ننھی ننھی آنکھوں سے اجرام فلکی اور دیگر سیاروں کی سیر ہی نہیں کرتا بلکہ اُن کی پیمائش کرتا ہے، ان کو اپنے دماغ کی لیبورٹیری (کیمیا خانے) میں لے جا کر وزن کرتا ہے، ان کے اجزا کو الگ الگ کر دیتا ہے۔

جوں جوں انسان کے دائرۂ خیالات میں وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے توں توں اسکو گھر کی زندگی ایک نقطہ سی معلوم ہونے لگتی ہے، جو پہلے کئی طویل سالوں سے مرکب نظر آتی تھی، اس کا دائرۂ معلومات اسقدر وسیع ہو جاتا ہے کہ وہ کرہ زمین کو قدرت کے سلسلوں میں شبنم کا ایک قطرہ سمجھتا ہے تب کہیں جا کر اس راز کا انکشاف ہوتا ہے، کہ یہ مٹی اور پتھر کے گھر بہت ہی عارضی اور ناپائدار ہیں، یہ رہنے کے گھر جسم کے گھر ہیں، جسم اور گھر دونوں ناپائدار اور فانی ہیں، لیکن روح غیر فانی ہے اسطرح انسان گھر میں بیٹھا ہوا بھی بے گھر ہو جاتا ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ گھر میرا نہیں ہے رین بسیرا ہے، ؎

بھروسا کیا کروں دنیا کا میں اک شب کا مہماں ہوں
مسافر میں ہوں اور یہ ہے سرائے عالم فانی (قمر)

(۵)

سچا گھر تو وہی ہے جہاں ہمیشہ قیام، قرار اور امن ہے، مٹی کے گھر کا اور ہمارا چند روزہ ساتھ ہے، آخر کوچ ہے، اسی طرح ذہنی اور خیالی گھر بھی پائدار نہیں، ان گھروں میں بھی ہم سدا نہیں رہ سکتے۔ گہری نیند کا ایک جھونکا ہمیں ان گھروں سے باہر نکال دیتا ہے، جس طرح جسم کے سبب ہمارا مٹی کے گھروں سے تعلق ہے اسی طرح ذہن کے ذریعے سے ہمارا خیالی گھروں کے ساتھ رابطہ و واسطہ ہے، جب ذہن حالت خوابیدگی میں چلا جاتا ہے یا تھک جاتا ہے، یا کسی صدمہ کے باعث اپنی طاقت کھو بیٹھتا ہے تو ہم خود آ خیالی دُنیا سے خارج ہو کر بے گھر ہو جاتے ہیں۔

ان خالی گھروں سے جب انسان کی تسکین نہیں ہوئی تو وہ اس گھر کی طرف منعطف ہوتا ہے جو اس کا وطن حقیقی اور مرجع اصلی ہے، جو ہمیشہ سے ہمارا ہے جس سے ہم باہر نہیں نکالے جاتے، جہاں سدا امن، قرار، قیام اور حفاظت ہے۔

یہ سچا گھر "روحانی گھر" ہے، میرا اصلی گھر ہے، یہ صرف میری واحد ملکیت نہیں بلکہ ساری کائنات کا گھر ہے، سب ارواح اسی گھر کے اراکین ہیں جو زمانہ کی بندش، مربع مستطیل اور سطح کی صورت سے معرا، گرمی سردی خزاں اور باد و باراں کے خوف و خطر سے محفوظ، گویا تمام مادی قفس کے عارضی دھندوں سے پاک ہے
یہ گھر نور ہے۔ سرور ہے۔ آب حیات ہے۔ اطمینان ہے۔ پاکیزگی ہے۔ ابدی ہے۔ ازلی ہے
یہاں فنا کا خوف نہیں، موجِ حوادث کے خوفناک تھپیڑوں کا ڈر نہیں، شک و شبہ کا خدشہ نہیں، پراگندہ خیالات کا کھٹکا نہیں، جس نے اس گھر کو تلاش کر لیا وہ اصلی مسرت سے فائز المرام ہو گیا۔

شہید (امرتسر)

غزل

شکریہ آپ نے تصویر جو بھجوائی ہے — دل کے بہلانے کی صورت تو نکل آئی ہے
نہ کسی نے تجھے دیکھا نہ شناسائی ہے — جس کو دیکھو وہ ترے نام کا شیدائی ہے
حق تو یہ ہے مری آنکھو نہیں کچھ موقوف — ذرہ ذرہ تری قدرت کا تماشائی ہے
یاد آیا ہے عدم میں وہ مسیحا مجھ کو — راہ مرقد سے نکلنے کی نکل آئی ہے
بتکدہ دیکھ لیا اب تو پہنچ جاؤں گا — کعبہ جانے کے لیے راہ نکل آئی ہے

اے وفا آئینہ رہتا ہے مقابل اسکے
اچھی صورت بت کافر کو پسند آئی ہے

وفا صدیقی

تقریب

حضرات 'اسکول' اور کالج کی زندگی 'جیسی کچھ بھی ہے 'بس ہے ' یہاں اس پر رد و قدح کی ضرورت نہیں ' لیکن اس میں شک نہیں کہ روحانی جذبات سے تو بلاشک یکسر خالی ہوتی ہے '

حالانکہ ہم مسلمانوں میں اگر خصوصیت تھی تو صرف یہی تھی کہ غیر مادی و روحانی قوا کبھی مادیات سے مغلوب و مقہور نہ ہونے پاتے تھے ' غیر زبانوں اور اجنبی علوم کو بھی حاصل کرتے تھے ۔ تو اس سے بھی تکمیل مدنیت کے ساتھ اللہ کی رضا جوئی مقصود ہوتی تھی '

آج کل یہ خیالات آنے والی نسلوں میں اگر ہیں تو خال ۔ خال ۔ حالانکہ ساری قوم کو اسی مذاق و رنگ میں سترابور ہونا چاہیئے تھا ۔

بات یہ ہے کہ پہلے روحانی بزرگوں کی صحبتیں عام تھیں ۔ علوم دینیہ کا ہر مسلم گھر ایک مدرسہ تھا ' اب یہ بات نصیب نہیں جسقدر روحانی صحبتیں عہد حاضرہ میں ہیں انمیں بھی سلف کے آثار تصرف و فیوض نادر ہیں

پس اس کمی کو دیکھکر میرے محترم دوست سید ظفر احسن صاحب نے آئندہ نسلوں کو صالحین سلف کی صحبتوں سے قریب تر کرنے کیلیئے جدید مذاق کے موافق سید ابو صالح عبد القادر جیلی رح کے حالات کو مختصر اً جامع طریقہ سے پیش کیا ہے اور ان حالات کو چھوڑ دیا ہے جنکا تعلق خرق عادات سے تھا ' قابل مولف کی یہ سعی جمیل لائق تشکر و تبریک ہے ' طالب علم جماعت کی جانب سے میں مولف کا شکر گذار ہوں کیونکہ جانتا ہوں کہ جواہر ریزوں کو جمع کرکے ایک درجہ یاقوت بنانا کسقدر محنت کا کام ہے ۔ دوستو اس مختصر تحریر کو پڑھو اور سمجھو کہ اس کوزہ میں کسقدر بڑے بڑے سمندر متموج ہیں ' ابو المعالی خلیقی دہلوی

اذ رایت بی طالبا فکن لہ خادما

مقدمہ

برادران ملت! کتب بینی نہایت شریف و حکیمانہ مشغلہ ہے، جمیع علوم و فنون مطالعہ کتب سے وابستہ ہیں۔ خیالات میں روشنی اور علم و عقل میں بلندی اسی ایک شغل سے پیدا ہوتی ہے لیکن روح کو غذا پہنچانے والا عادت کو درست کرنے والا غیر محسوس اور یقینی طور پر شرافت نفس تک پہنچانے والا' صرف ایک علم تصوف ہے۔ اس علم میں جس قدر غور و خوض کیجیے اسی قدر عجیب و غریب اسرار منکشف ہوتے جاتے ہیں' اور اس فن کی ابتدا صوفیائے عظام کے حالات و کلمات سے ہوتی ہے۔ رب العزت نے ارشاد فرمایا ہے" وکلا نقص علیک من انباء الرسل ما نثبت بہ فوادک (ہم پیغمبروں کے حالات اور قصے تم کو سناتے ہیں کہ انکے حالات سے واقف ہوکر تمہارے دل میں ثابت قدمی و تقویت پیدا ہو) بس اس لحاظ سے میں نے نوجوان طلبا کے دلوں میں اللہ کی محبت کا شعلہ بھڑکانے کے لئے انہیں کے مذاق و تخیل کے موافق سیدی ابو صالح عبد القادر جیلی رضی اللہ عنہ کے حالات جو کچھ لکھے تھے پورے اختصار کے ساتھ جدید طالبانہ نگاری کے طرز پر اس کتاب میں جمع کر دیئے ہیں' اور حضرت رضی اللہ عنہ کے (۲۵) مواعظ کا خلاصہ جو درحقیقت مختلف مسائل و علوم کے سوانح ہیں' درج کیا ہے' اور سوانح نویسی کے اس طرز کو قصداً چھوڑ دیا ہے جو بزرگان دین کے حالات لکھنے میں قدما نے برتا ہے کیونکہ میرے مخاطب نئی تہذیب والے ہیں کہ جنکے دل سے ممکن تھا قدیم طرز کو زیادہ پسند نہ کرتے۔

اگر یہ کتاب کچھ لائق رکھنے والوں کی سینہ تک پہنچ گئی تو بدوں اثر چھوڑے نہ رہے گی۔ اگر ایسا ہو گیا تو میری خوش نصیبی ہے۔

سید ظفر احسن علوی

ابو صالح

فان لم تکن منہم فی حبہم لہم تشبہ و ود القوم کل مودۃ

(اگر تو ان میں سے نہ بھی ہو تو ان کی محبت میں ان جیسا بن اور اس طبقہ کو جان و دل سے دوست رکھ)

شجرہ نسب ولادت و وفات مزار

(۱)

[illegible]

عبد القادر جیلی کنیت ابو صالح ۴۷۱ سنہ میں پیدا ہوئے ۵۶۱ سنہ ہجری میں انکا وصال ہوا۔ بغداد میں آسودہ ہیں مزار زیارت گاہ عالم ہے۔

(۲)

ایام رضاعت میں روزہ

ان کی والدہ کا بیان

آپ کی ولادت رمضان المبارک سنہ ۴۷۱ ہجری میں ہوئی۔ قدرتاً آپ دن بھر دودھ کو منہ نہ لگاتے تھے۔ جب افطار کا وقت ہوتا تب خود ہی پیتے تھے۔ یہ بات شہر اور برادری میں عام طور پر مشہور ہو گئی تھی کہ سیدوں میں ایک بچہ پیدا ہوا ہے۔ وہ دن بھر دودھ نہیں پیتا۔ افطار کے وقت جب سب لوگ روزہ افطار کرتے ہیں تو وہ بھی پیتا ہے۔ اکثر عورتیں انکو دیکھنے آتی تھیں۔

دوسرے سال

عجیب اتفاق ہوا۔ ابر آسمان پر محیط تھا۔ اہل شہر رمضان کا چاند دیکھنے نکلے بہت کوشش کی کہیں نظر نہ آیا۔ سب کو تردد تھا کہ کل روزہ رکھنا چاہیے یا نہیں شب کو کوئی فیصلہ نہ ہوا اور نہ کہیں دوسرے مقام سے رویت ہلال کے

متعلق خبر آئی، صبح کو بھی یہی تردد رہا، اور شام تک کوئی فیصلہ نہ ہو سکا، غروب سے قبل کچھ لوگ میرے پاس آئے، کہ تم اپنے بچہ کا حال سناؤ، میں نے کہا کہ اس قدر تو کہہ سکتی ہوں کہ آج عبدالقادر نے، لیکب پہر رات سے دودھ نہیں پیا، سننے والوں نے اظہار تعجب کیا بعد کو حالات معلوم ہوئے کہ واقعی اس روز اور مقامات پر رویت ہلال کی بنا پر روزہ ہوا،

(۱۲)

مدرسہ

علمی بزرگی اور اشغال

مختلف علوم میں ید طولانے حاصل تھا، اپنے قایم کردہ مدرسہ میں صبح سے دوپہر تک، تفسیر، حدیث، فقہ، کلام کا طالب علموں کو مروجہ طریق پر درس دیا کرتے تھے، دوپہر کے بعد، تفسیر، حدیث، فقہ، کلام کے علاوہ اصول، نحو، قرآن مجید سبعہ کے ساتھ پڑھایا کرتے تھے،

فرمایا کرتے تھے کہ جو مسلمان مرد میرے مدرسہ کے دروازہ میں ایک دفعہ داخل ہو جائیگا۔ امید ہے کہ خدا قیامت میں معاملہ کے اندر نرمی برتے،

امام شافعی رضی اللہ عنہ اور امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کے مذہب پر فتوے دیا کرتے تھے،

ہمعصروں پر تفوق

علمائے عراق، کے سامنے جب ان کے فتاوے پیش ہوتے تو وہ حسن فہم اور اسلوب اجتہاد و قوت استدلال و فیصلہ پر حیران رہجاتے تھے،

ایک دفعہ

ان کے پاس ایک سوال آیا، کہ ایک شخص نے تین طلاق کی قسم کھائی ہے، کہ اس کو ایسی عبادت کرنا ضرور ہے، یا وہ ایسی عبادت کریگا کہ جس وقت

عبادت کا تعین

وہ عبادت کرے تو اس وقت دنیا کا کوئی شخص بھی وہ عبادت نہ کرتا ہو، پس جواب میں بتلایا جائے کہ وہ کون سی عبادت کرے،

اکثر کیا قریب قریب تمام معاصرین اس کے جواب سے اپنے آپ کو عاجز پاتے تھے، عبادت کا تعین نہیں کر سکتے تھے، انہوں نے جواب لکھدیا وہ شخص مکہ معظمہ چلا جائے، اور اپنے لیے طواف کی جگہ کو خالی کرائے اور تنہا سات طواف کرے، قسم اتر جائیگی

اس فرزانہ جواب پر اہل علم حیران رہ گئے، واقعی قسم کی شرط سن لینے کے بعد ذہن خاموش ہو جاتا ہے، تاوقتیکہ خاص طور پر ذہن کو منتقل ہو جانے کا ملکہ نہ ہو، خیال آسانی سے ادھر رجوع ہی نہیں ہوتا، (از ابن فضل اللہ)

(۴)

ابتدائی حالات

(۱)

مجاہدات

خود انہیں حضرت کا بیان ہے،

کہ ابتدا میں مجھ پر بڑی بڑی کڑیاں پڑی ہیں، اور اس قدر بھاری بھاری بوجھ ڈالے گئے ہیں، اگر پہاڑوں پر ان کو ڈالا جاتا تو وہ پھٹ جاتے، جب میں زیادہ ماندہ ہوتا تھا، تو پہلو کے بل زمین پر پڑ جاتا تھا اور "فان مع العسر یسرا ان مع العسر یسرا" پڑھا کرتا تھا، تھوڑی مشکل کے ساتھ آسانی ہو بلکہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے، دیر میں جب سر اٹھاتا تھا تو اپنے رب کا فضل شامل حال پاتا تھا، جو مشکل ہوتی تھی وہ باقی نہ رہتی تھی، اب تک بھی اکثر ایسا ہی ہوتا ہے،

(۲)

کوئی دکھ اور مصیبت ایسی نہیں جس کا میں مہمان نہ رہا ہوں'

(۳)

ایک اون کا جبہ اور سر پہ چھوٹا سا خرقہ اوڑھے رہتے تھے' پاؤں بھی برہنہ رہتے تھے' جن کی تواضع ہمیشہ کانٹے اور ذک دار پتھر کرتے رہتے تھے جب بھوک معلوم ہوتی تھی' تو تھوڑے' سوکھے ساگ پات' اور ندی کنارے کی گھاس میرے لیئے کافی ہو جاتے تھے' یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ کی جانب سے میرا حال درست کیا گیا'

(۴)

مجھ پر کبھی یہ حالت بھی وارد ہوتی تھی' کہ میں بے تاب ہو کر چلاتا اور غل شور مچاتا تھا' اور جدھر منہ اٹھ جاتا تھا ناک کی سیدھ بھاگتا پھرتا تھا

(۵)

مجھ کو ضرورت کبھی گونگا کر دیتی تھی کبھی بہرہ' لوگ مجھ کو بہرہ سمجھکر شفاخانوں میں لے جاتے تھے' میں دیوانوں کی طرح رہتا تھا۔

(۶)

ایک دفعہ

ایسی حالت وارد ہوئی کہ لوگوں نے مجھ کو مردہ یقین کر لیا' غسال بھی کفن آ گیا' غسل کے لیے مجھکو تختہ پر لٹا دیا گیا' کہ یکایک مجکو ہوش آیا' اور میں اٹھ بیٹھا'

(۷)

ایک مرتبہ کئی دن سے کچھ کھانے پینے کا اتفاق نہیں ہوا تھا' ایک شخص سے ملاقات ہوئی۔ اس نے مجکو ایک تھیلی دی اسمیں چند درہم تھے' میں نے وہ لے لی اور فوراً چند میدہ کی روٹیاں اور کچھ روغن کا حلوہ خریدا' اور کھانے

بیٹھا ہی تھا، منہ تک ہاتھ نہ گیا تھا، کہ ہوا سے ایک پرچہ اڑتا ہوا مرے آگے آپڑا، اسمیں یہ تنبیہہ تحریر تھی،

تنبیہی تحریر

اللہ تعالیٰ نے اپنی بعض آسمانی کتابون میں ارشاد فرمایا ہے، کہ خواہشیں تو میں نے اپنے مخلوق میں کمزوروں کیلیے بنائی، تاکہ طاعتون میں ان سے مدد لیں، جو زور آور ہیں، ان کو خواہشوں سے کیا واسطہ؟ چنانچہ میں کھانے سے دست بردار ہوگیا۔

(۸)

عراق کے میدان اور کھنڈر

انہی کا بیان ہے، کہ پچیس سال تک جنگلون اور غیر آباد مقامات ویرانون میں پھرا ہون، نہ مجھے کوئی خبر ہوتا تھا نہ میں کسی سے واقف ہوتا تھا، مردان غیب، اور جنوں سے ملاقات ہوسکتی تھی، جب میں پہلے پہل عراق کے میدانوں میں پہنچا تو خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، میں ان کو پہچانتا نہ تھا، موافقت اس بات پر ٹھہری کہ میں ان کی مخالفت نہ کروں، میں نے اقرار کرلیا، ایک جگہ مجھکو بٹھلا گئے، اور یہ کہگئے کہ میں جبتک نہ آؤں یہاں سے نہ اٹھنا، چنانچہ میں سال بھر تک وہیں بیٹھا اور حاضر رہا، حضرت ایک سال بعد تشریف لائے، میں نے کہا کہ آپ بہت جلد آگئے، چنانچہ وہ سال میں ایک دفعہ اسی مقام پر آیا کرتے تھے، اور ہر دفعہ یہ کہ جاتے تھے، کہ جب تک ہم نہ آئیں یہاں سے نہ اٹھنا، اپنی جگہ پر بیٹھے رہنا، چنانچہ پورے تین سال اسی حال میں مجھکو وہیں گذر گئے،

(۹)

مداین کے کھنڈروں میں تین سال

انہیں کا بیان ہے، ایک سال مداین کے کھنڈروں میں مجاہدت سے اپنے نفس کو درست کرتا رہا، دوسرے سال، خیمہ کی سبزی کھائی پانی ترک کردیا تھا۔

دوسرے سال صرف پانی پیتا تھا اور کچھ نہ کھاتا تھا'
تیسرے سال نہ کچھ کھاتا تھا نہ پیتا تھا'

۱۰

موسم سرما کی ایک رات

خدا جانے کس تقریب اور کس وقت ایک دفعہ آپ ایک امیر کے محل میں شب باش ہوئے' احتلام ہو گیا آپ اٹھے اور دریا پر غسل کرائے پھر یہیں آئے اور سو گئے' پھر بدخوابی ہوئی پھر اٹھے اور نہا آئے' یہاں تک کہ پورے چالیس دفعہ یہی واقعہ گذرا' پریشان ہو گئے' کہ الٰہی یہ کیا غلبہ ہے آخر فرط خوف سے مکان کی چھت پر بقیہ رات ٹہلتے رہے'

(۱۱)

کثرت عبادت

ابو الفتح ہروی رح کا بیان ہے کہ میں ۴۰ سال تک شیخ عبد القادر جیلی کی خدمت میں رہا' ہمیشہ یہی دیکھا کہ برابر عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھتے تھے' یہ بات عادت میں داخل تھی کہ جب وضو ساقط ہوتا' فوراً اس کو قائم کر لیتے تھے اور دو دو رکعتیں صلٰوۃ الوضو پڑھا کرتے تھے' عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر اپنی خلوت میں چلے جاتے تھے' صبح نمودار ہوتی تو جماعت کی نماز میں شامل ہو جاتے تھے' ایک دفعہ مجھ کو ان کی خلوت میں حاضر رہنے کی عزت حاصل ہوئی میں نے دیکھا کہ اول حصہ میں تھوڑی نماز پڑھتے تھے' تہائی رات گذرنے کے بعد ذکر میں مشغول رہتے تھے جب رات کا دوسرا ثلث شروع ہوجاتا' تو نماز میں قرآن کی تلاوت کرتے' اور سجدے بہت طویل کیا کرتے تھے گھنٹوں سر نہ اٹھاتے تھے' پھر تیسرے ثلث میں صبح تک مشاہدہ و مراقبہ میں مصروف رہا کرتے تھے' دعائیں بہت ہی عاجزی کرتے تھے' بے حد گڑگڑایا کرتے تھے

تلاشِ عیش

(سلسلے کے لیے اکتوبر نمبر ملاحظہ ہو)

بلقیس:- جب تم ہر بات کا اسقدر اثر لینے کے لیے تیار ہو تو اس سے بدتر حالت ہوگی۔ آخر یہ کیا تمھارے لیے ہر چیز آفت کیوں ہو جاتی ہے۔

حسینہ:- میں کیا جانوں۔ یہی تو میں کہتی ہوں کہ ہر چیز میرے لیے مصیبت کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔

بلقیس:- جس چیز کو آدمی چاہے مصیبت سمجھ لے۔ ورنہ مصیبت کی کون سی بات ہے۔

حسینہ:- پیٹ بھرا بھوک کی تکلیف کیا جانے۔ تم پر میری ایسی گذرتی تو تم کو معلوم ہوتا۔

بلقیس:- ایک بھوک کی تکلیف ہوتی ہے۔ دوسرے ندیدہ پن کی کہ جو چیز سامنے آئی اُسکو دل چاہنے لگا اور تڑپنے لگے۔ میں ہمیشہ سے کہتی ہوں کہ تمھیں عیش کی بے انتہا خواہش ہے اسی لیے اس کے نہ حاصل ہونے سے اسقدر تکلیف ہے۔ جس قدر عیش کی تلاش کم کروگی اسی قدر تکلیف کم ہوگی۔

حسینہ:- یہ خوب کہا۔ زیادتی کمی کا تو اُس وقت ذکر ہو جب کوئی شے موجود ہو جب سرے سے وہ ہے ہی نہیں تو پھر اس کا کیا کہنا۔ زندگی بھر میں کون گھڑی میری عیش میں گذری۔ میرا دل یہ معلوم ہوتا ہے کہ خالی ہے۔ مجھے نہیں معلوم میں کیا چاہتی ہوں عیش یا مصیبت۔

بلقیس:- اچھا جو کچھ ہوا اپنے دل کی خالی جگہ ان خیالات سے نہ بھرو تمھیں یاد نہیں کہ چچا جان سے تم نے کہا تھا کہ مردوں کے ظلم کا میں مقابلہ کروں گی کیا مقابلہ اسی طرح کروگی ایک کی لونڈی نہ بنیں دوسرے کی بن جاؤگی۔

حسینہ:- دوسرے کی کس کی؟

بلقیس:- جن کے واسطے بیتاب ہو رہی ہو۔ یہی تو ہم عورتوں کی کمزوری ہے کہ مرد کا

ذرا رجحان اور محبت کی نگاہ دیکھی اور ہم بیتاب ہو گئے۔

حسینہ :- مرد تو عورت کا رجحان نہیں بھی دیکھتے جب بھی بیقرار ہو جاتے ہیں۔ آخر انھوں نے میرا کیا رجحان دیکھا۔

بلقیس :- تم پر تو عشق کا بھوت چڑھا ہوا ہے۔ تم سے کون تقریر کرے۔ اگر یہی بات ہے تو مقابلہ کرنے کا نام اب نہ لینا۔

حسینہ :- عشق وشق نہیں۔ مَیں یہ سوچتی ہوں کہ بڑے میاں سے طلاق ہو جائے تو وقار سے مَیں شادی کر لوں۔ یہ مجھے چاہتے بھی ہیں خوب چین سے گذرے گی۔

بلقیس :- یہ ہی تو مَیں کہتی ہوں کہ چین عیش پر تمھاری اسقدر کیوں رال ٹپکتی ہے اسکے پیچھے کیوں مری جاتی ہو۔ اور پھر کوئی بات دل میں نہیں رکھ سکتیں منھ سے کہہ دینا ضرور ہے۔

حسینہ :- پھر ایسے قصے کیوں چھیڑتی ہو۔ تم جانتی ہو جو میرے دل میں آتا ہے وہ بغیر کہے نہیں رہ سکتی۔

بلقیس :- اچھا تمھارا دل ہے۔

حسینہ :- تو اسے مَیں کیا کروں۔ کیا تمھارے دل میں کوئی ایسی باتیں ہیں جو تم نے کسی سے نہیں کہیں۔

بلقیس :- سیکڑوں ہزاروں ایسی باتیں ہیں۔ دل اپنے قابو میں ہے یا ہم دل کے قابو میں۔

حسینہ :- اچھا جو حالت آج کل میری ہے ویسی تمھاری حالت کبھی ہوئی تھی؟

بلقیس :- تم سڑن ہو اللہ نے مجھے ہوش وحواس دیے ہیں میری یہ حالت کیوں ہونے لگی تھی۔

حسینہ :- تمھیں کسی سے آج تک محبت نہیں ہوئی؟

بلقیس :- ہوگا۔ مجھ سے سڑن پن کی باتیں نہ کرو۔ اچھا حسرت کی وہ غزل تو گاؤ۔

بام پر آنے لگے وہ سامنا ہونے لگا   اب تو اظہار محبت برملا ہونے لگا

حسینہ نے اس غزل کے دو تین شعر قوالی کی دُھن میں گائے۔ اس کا گلا نور کا بنا ہوا تھا۔ جو چیز گاتی تھی کلیجہ معلوم ہوتا تھا کھینچے لیتی ہے۔ اپنی عادت کے موافق یکایک گانا چھوڑ کے کہنے لگی "میں حسرت کی عاشق ہوں۔

بلقیس:۔ اگر حسرت کی عاشق ہو تو اُن کی جاں فروشی اور ایثار بھی تو سیکھو۔ اس قدر دُھن کا پکا کون ہوگا کہ صرف اپنے ایک خیال کے پیچھے قید کی سختیاں برداشت کر رہے ہیں۔ تم تو فقط مُنہ سے کہتی ہو میں بیشک حسرت پر عاشق ہوں مجھے اُس عورت پر رشک آتا ہے جو اُس کی بیوی ہے۔

حسینہ:۔ تمھارے میاں تو حسرت کے بہت خلاف ہیں۔

بلقیس:۔ وہ تو اس لیے خلاف ہیں کہ اُس کو انگریزیت ناپسند ہے اور آزاد طبیعت رکھتا ہے۔ تمھارے شوہر صاحب تو انگریزیت کے دلدادہ ہیں وہی اُن کا قبلہ ہے اور وہی اُن کا کعبہ اس کے سوا نہ اُن کا کوئی اُصول ہے اور نہ کوئی دین و مذہب

باتیں کرتے کرتے دونوں عورتیں کچھ چپ ہوئیں بلقیس کو اپنے میاں کا خیال آیا اس کی حرکتوں پر غور کرنے لگی حسینہ کے دل میں کوئی خیال نہ تھا وہ تھک کے خاموش ہو گئی تھی۔ جذبات کی گرمی بھی انسان کو تھکا دیتی ہے دس پانچ منٹ تک کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ اسی حالت میں دونوں بیٹھی تھیں کہ یکایک اکبر اندر آئے آتے کے ساتھ ہی اپنے کپڑوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ بلقیس کو بیگم کہا کرتے تھے بولے "بیگم تم آدمیوں سے اچھی طرح کام نہیں لیتیں۔ مسز ریڈ کو دیکھو ان کے آدمی اشارے پر کام کرتے ہیں مہینہ بھر ہو گیا میرے کپڑوں کو ہوا نہیں دی گئی۔ ڈرسنگ گاؤن معلوم نہیں کس طرح رکھا ہے۔ اسموکنگ جیکٹ پر برش میں نے دیکھا تھا نہیں کیا گیا۔ یہ کلام پوری طرح ختم بھی نہیں ہوا تھا اور منہ سے جواب بھی نہ دینے پائی تھی کہ یکایک زور سے آواز دی "بوائے" باہر سے جواب آیا "صاحب" (انگریزی لہجہ میں) دیکھو ایسی غلطی مت کیا کرو یہ پہلی خطا تھی اس لیے معاف کر دی گئی۔ پھر ایسی غلطی ہو گی تو سخت سزا دی جائے گی"

بلقیس:۔ کیوں کیا ہوا۔ آج بیرا پر عتاب کیوں ہے۔

اکبر:۔ آج اُس نے غضب کیا۔ مسٹر ریڈ مجھ سے ملنے آئے۔ سگار میں نے جو مانگا تو مدراس کے لغو سگار لاکر سامنے رکھدیے۔ ایک بکس ان سگاروں کا منگوا لیتا ہوں کہ ہندوستانی آدمی آتے جاتے ہیں ان کو دیا کروں۔ یہ کمبخت انگریز کے سامنے وہی لے کر چلا آیا حالانکہ ہیک ہیوانہ اور اسپاٹلڈ ڈاگ کثرت سے رکھے ہوے ہیں۔ مجھے سخت ذلت ہوئی۔

بلقیس کا دل جل کے خاک ہو گیا۔ چونکہ ابھی اسی قسم کا ذکر ہو رہا تھا اور اکبر کے چھچھورے پن پر وہ غور کر رہی تھی اس لیے بلقیس کے دل پر اس گفتگو نے خاص طور پر بُرا اثر پیدا کیا۔ کہنے لگی " تمھارا بس نہیں ہے نہیں تو تم اپنا نام اور اپنی ولدیت تک بدل دیتے اور یوروپین بن بیٹھتے۔ اس ذلت کی کوئی انتہا ہے کہ خود اپنے آپ کو کوئی ذلیل سمجھے۔

اکبر:۔ یہ کیا معنے۔

بلقیس:۔ تم ہندوستانی کو ذلیل سمجھتے ہو حالانکہ خود ہندوستانی ہو۔ تمھارے ذلیل سمجھنے سے ہندوستانی تو ذلیل نہو گا البتہ اپنی ذلت کا تم اقرار کر لیتے ہو۔ تمھاری ان باتوں سے مجھے سخت نفرت ہوتی ہے۔ خدا کے واسطے میرے سامنے آکر تو ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ دیکھو تمھاری ضد میں میں میموں سے ملنا جلنا ترک کر دوں گی تمھیں معلوم ہے میرا قصد ہے کہ دیسی چیزوں کے سوا کوئی غیر ملکی چیز جہاں تک ممکن ہو نہ استعمال کروں

اکبر:۔ یہ بیہودہ خیال تمھارے دماغ میں کس نے بھر دیے۔ خیر میں تم سے پالیٹکس پر بحث کرنے نہیں آیا تھا۔ میں دو دن کے لیے باہر جا رہا ہوں شکار کے واسطے۔ میری چیزیں درست کر دو۔

اکبر اس قسم کی باتوں کو ہمیشہ پالیٹکس کہا کرتے تھے۔ اور کسی انگریز کی بُرائی کو بغاوت سمجھتے تھے۔

جب اکبر چلے گئے تو حسینہ نے بلقیس سے کہا " تم اپنے میاں کو سخت سُست کہہ لیتی ہو مگر وہ تمھیں اتنا چاہتے ہیں کہ بُرا نہیں مانتے جواب تک نہیں دیتے"

بلقیس:۔ (جھنجھلا کے) ان کو اپنے چاہنے سے کب فرصت ہے کہ دوسرے کو چاہیں گے۔

حسینہ :- مجھے تو ان کی باتیں بہت اچھی لگتی ہیں - خود چین سے رہتے ہیں بیوی کو چین کراتے ہیں - سب سے ملنا جُلنا - بیوی کو ملانا - سیر تفریح کرانا - ہر طرح کا لطف اور عیش یہ ہی زندگی کا مزا ہے -

بلقیس :- بالکل تمہاری ایسی طبیعت ہے تمہیں کیوں نہ اچھے لگیں گے تم ان کی بیوی ہوتیں تو تم سے خوب بنتی - اچھا اب مجھے خوب یاد آیا تم کو وقار بھائی سے جو محبت ہے اُس کو اپنے دل سے نکال ڈالو وہ اس منش کے آدمی نہیں ہیں عیش پرستی تو ان میں چھو نہیں گئی ہے میں جانتی ہوں کہ وہ دھوکے میں ہیں تمہارے سمجھنے میں انھوں نے غلطی کی - تم کو وہ اگر جان جائیں تو تمہاری طرف رُخ بھی نہ کریں -

حسینہ :- تو میری قسمت سے وہ بھی بڑے میاں کے ایسے بپا نہیں وہ ایسے نہوں گے

بلقیس :- اچھا انھیں آلینے دو - میں اس معاملہ کو صاف کر دوں گی -

(۱۰)

وقار حسینہ کی صورت ہی پر عاشق تھا - اس کے مزاج اور طبیعت سے اس کو بالکل واقفیت نہ تھی - حسینہ کے حُسن اور دل آویز شوخی نے اُس کے دل پر غیر معمولی اثر ایسا ڈالا تھا کہ وہ اپنے اصلی رجحان طبیعت کو بھول گیا تھا - وہ محبت میں گرفتار نہ تھا بلکہ ازخود رفتہ سا ہو گیا تھا حُسن کی چمک دمک نے اس کی آنکھوں کو اس درجہ چکا چوند میں ڈالا کہ وہ کچھ دیکھ نہ سکا - اس اثر کے زائل ہونے سے قبل چونکہ وہ چلا آیا تھا اس لیے نقش دل پر وہی قائم رہا اور یہ ہی اُسے بے چین کیے ہوئے تھا - وہ صرف یہ ہی جانتا تھا کہ حسینہ ایک حسین عورت ہے اس کی ذات کا وہ شیدا نہ تھا صرف حُسن کا شیدا تھا - دو مہینے بیچینی کے اُس نے بمبئی میں کاٹے رخصت ختم ہونے پر وطن واپس آیا - بلقیس کے گھر بلقیس سے سمجھو یا حسینہ سے ملنے گیا - اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں ایک کا ذکر آیا - اُن کے انداز اور طریقوں سے اپنی نفرت کا اظہار کیا - کسی عورت کا ذکر بلقیس نے کیا جس کی عادتیں ہُو بہو وہی تھیں جو حسینہ کی تھیں - وقار نے سخت ناپسندیدگی ظاہر کی - بلقیس نے یہ ذکر حسینہ کو سُنانے کے لیے کیے تھے کہ وقار کی طبیعت کو اچھی طرح

وہ جانچ نے بلقیس کو تعجب ہوا۔ کہ حسینہ کی طبیعت ان باتوں سے ہٹی نہیں بلکہ برخلاف اس کے اس نے یہ اندازہ کیا کہ حسینہ کے دل میں وقار کی عزت کچھ زیادہ ہو گئی۔

دو تین روز بعد وقار سے تنہائی میں بلقیس نے حسینہ کے سب حالات بیان کیے اس کے مزاج کی کیفیت اس کی خواہشات رجحان طبیعت وغیرہ کوئی بات اس نے چھپائی نہیں من و عن کہہ دی۔ کہنے کے بعد اس نے جانچنا شروع کیا تو یہ معلوم ہوا کہ اس پر مطلق اثر نہ ہوا۔ حسینہ کے نام سے وہ ہی بحالی اور بشاشی اس کے چہرہ پر آیا کی۔ گفتگو ختم ہونے کے بہت دیر بعد اس نے بلقیس سے کہا "مجھے ایک بات یہ بتلاؤ کہ میرے ساتھ حسینہ کو کچھ اُنس ہے"۔

بلقیس:۔ اُنس تو ضرور ہے بلکہ مجھے تعجب ہے تمہاری طبیعت کی کیفیت سن کے بھی وہ کچھ گھبرائی نہیں حالانکہ تمہاری طبیعت اسکے مزاج کے بالکل خلاف ہے۔

وقار:۔ وہ محبت کی بھوکی ہے جو کچھ بُرائیاں اس میں ہیں وہ صرف اس وجہ سے ہیں کہ اس کا کوئی چاہنے والا نہ تھا اور وہ کسی کو نہیں چاہتی تھی۔ محبت جانور کو آدمی بنا دیتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایسی حسین عورت بُری کیونکر ہو سکتی ہے۔

بلقیس:۔ خیر یہ تو تمہاری حماقت کی باتیں ہیں حسن سے اور مزاج و طبیعت سے کیا تعلق ہاں محبت کو جو کہا اسکو میں نہیں جانتی ممکن ہے ایسا ہی ہوتا ہو۔

آٹھ دس روز کے اندر حسینہ کی حالت میں ایسا تغیر ہوا کہ کوئی دیکھتا تو کبھی نہ کہہ سکتا کہ یہ وہی شخص ہے۔ نہ اس میں وہ شوخی اور تیزی باقی رہی تھی نہ بیباکی۔ یکایک ایک سنجیدہ اور بردبار عورت ہو گئی جسم کی آراستگی کی پرواہ اُسی وقت ہوتی تھی جب وقار آتا تھا وہ بھی اسی قدر کہ اگر وقار کی نظر پڑے تو صورت بھنگم نہ معلوم ہو اب وہ پہلے کی طرح دروازہ کے پاس آکر اس سے گفتگو بھی نہ کرتی تھی البتہ یہ ضرور کرتی تھی کہ اپنی صورت وقار کو کسی نہ کسی طرح دکھلا دیتی تھی یہ بھی اس وجہ سے کہ جس دن وقار اُس کو نہ دیکھتا تھا تو بہت ملول واپس جاتا اور اس کو ناخوش کرنا وہ گوارا نہ کر سکتی تھی دوسرے

یہ کہ خود بھی دل چاہتا تھا کہ اپنے چاہنے والے سے آنکھیں دو چار کر لیا کرے۔

وقار کو یہ معلوم کر کے کہ حسینہ کے مزاج میں تغیر ہوا ہے اس بات کا یقین ہو گیا کہ اس کو میرے ساتھ محبت ہے۔ کیونکہ وہ بلقیس سے کہہ چکا تھا کہ محبت جانور کو آدمی بنا دیتی ہے۔ انسان تو پھر انسان ہے۔ اس کو اب حقیقی طور پر حسینہ سے محبت ہو گئی جس طرح دنیا کی ہر حقیقت کی توضیح کرنا ایک امر ناممکن سا ہے اسی طرح اس بات کی وجہ بتانا کہ فلاں شخص کو فلاں کے ساتھ کیوں محبت ہو گئی سخت دشوار ہے کہنے کو تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ وقار حسینہ کے حسن پر فریفتہ ہوا اس لیے محبت ہو گئی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیوں فریفتہ ہوا بہت سے اس کے عزیزوں نے اس کو دیکھا تھا۔ بہتوں کی صورت اچھی بھی معلوم ہوئی ہوگی مگر کوئی از خود رفتہ نہ ہو گیا۔ اس کے حواس کیوں جاتے رہے حالانکہ یہ پڑھا لکھا سمجھدار دنیا کی اونچ نیچ دیکھنے والا اوروں سے زیادہ تھا۔ علم النفس کے ماہرین نے سب کچھ کیا مگر یہ راز اسی طرح اب بھی سربستہ ہے جیسے پہلے تھا۔ وقار کی یہ حالت ہے کہ کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ حسینہ کا نام آ جاتا ہے تو قلب کی حرکت دوگنی ہو جاتی ہے۔ چہرہ بشاش ہو جاتا ہے۔ دن بھر اس کے خیال میں ہزارہا منصوبے باندھتا ہے۔ کمرہ میں اکیلا لیٹا ہے سوچنا شروع کیا فوراً حسینہ کی صورت سامنے آ گئی۔ اس سے عالم خیال میں کہا "کیا میری زندگی اسی طرح کٹے گی تو میری نہ ہو گی" وہ شرما گئی۔ بار بار پوچھا کوئی جواب نہ ملا۔ خفا ہو کر منھ پھیر لیا۔ یہ اس پر گراں ہوا بے اختیار اس نے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے اور ایک رخ سے چہرہ سینہ پر رکھ دیا۔ آنکھیں چار نہ کیں۔ اور جواب اب تک نہ دیا۔ پھر اصرار سے پوچھا۔ جھنجھلا کے بولی آخر کیا چاہتے ہو اور کس طرح تمھاری ہو جاؤں۔ اسی نتیجہ پہنچنے کے لیے پھر دوسرا خیال بندھتا ہے۔ اسی طرح تیسرا چوتھا غرض کہ ایک سلسلہ لامتناہی ہے کہ ختم نہیں ہوتا۔

غور سے دیکھو تو یہ بھی ایک عجیب تماشا ہے بلا وجہ ایک اچھے خاصے ذی عقل و ذی فہم شخص کو ایک دوسرے شخص کی صورت حسین معلوم ہوئی اپنی ذات کو اس پر قربان کرنے لگا یہ تو ایک بات ہوئی دوسرا تماشہ یہ کہ سلسلۂ محبت قائم ہونا تھا کہ یہ معلوم ہوا کہ دونوں کے

قالبوں میں بجلی کی بیٹریاں رکھ دی گئیں اور ایک دل دوسرے سے براہ راست پیام سلام کرنے لگا۔ ادھر وقار بیقرار ہوا اُدھر حسینہ کا دل بےچین ہونے لگا۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ یہاں تک کہ حسینہ کی طبیعت ناساز ہوئی اس کا فوراً اثر وقار پر بھی ہوا وہ بھی بیمار ہو گیا۔ اس سے انکار کرنا مشکل ہے کہ انسانی بلکہ کہنا چاہیے جوانی دماغ میں ایک دوسرے کے درمیان ایک رابطہ ہے جس کی تحقیق اسیقدر ضروری ہے جتنی کہ دوسری معلوم کی ہوئی قوتوں کی۔

بلقیس بھی بیٹھے بیٹھے ان تماشوں کو دیکھتی تھی اور زیادہ متعجب اور حیران حسینہ کی کایا پلٹ سے تھی۔ مُنھ سے نہ بولتی تھی مگر دل ہی دل میں کہتی تھی کہ واقعی مرد کا اثر عورت پر بہت قوی ہوتا ہے شاید عورت کا اثر مرد پر اتنا زوردار نہ ہوتا ہو۔ ممکن ہے کہ بلقیس کا یہ خیال صحیح ہو لیکن اثر زیادہ تر اثر لینے والے کی اہلیت اور استعداد پر منحصر ہے۔ حسینہ میں اثر قبول کرنے کی استعداد بدرجۂ کمال موجود تھی۔ وہ بقول وقار "محبت کی بھوکی تھی" شوخی بیبا کی یا عیش پرستی انسانی چال چلن کا اتنا استوار جز نہیں ہے کہ بڑے بڑے اثرات کا مقابلہ کر سکے۔ دیگر جذبات کے وفور میں اس کا دب جانا یا فنا ہو جانا غیر ممکن نہیں ہے۔

کون ہے جس کو عاشقوں کی نیرنگیوں کا تماشا اچھا نہ معلوم ہوتا ہو۔ بلقیس بھی ان عاشق معشوقوں کی کیفیات سے بیحد دلچسپی لیتی تھی۔ چونکہ حسینہ اب اپنی حالت کو چھپاتی تھی۔ اس لیے اب اس کے متعلق اس سے وہ گفتگو نہیں کرتی تھی بیٹھے بیٹھے خالی سیر دیکھتی تھی۔ ایک روز ایک نظارہ بہت پُرلطف تھا۔ وقار کمرہ میں تھا حسینہ باہر صحن میں لیٹی تھی۔ بلقیس کمرہ کے مقابل والے دالان میں تھی۔ وقار دروازے کی دراز سے دیکھ رہا تھا حسینہ کی نظر بھی اُسی پر جمی ہوئی تھی ہر ایک کی نگاہ پوشیدہ آرزوؤں کا دفتر تھی۔ بلقیس کو دل لگی سوجھی پھیر کھا کے کمرے میں اس طرح چپکے سے گئی کہ دونوں میں سے کسی کو خبر نہ ہوئی۔ آہستہ آہستہ دبے پاؤں جا کے وقار کے عین سر پر کھڑی ہو گئی۔ وقار کو مطلق خبر نہ ہوئی۔ حسینہ کا سامنا تھا اس کو اشارا کیا اس نے مسکرا کے مُنھ پر ہاتھ رکھ لیا۔ وقار اب بھی کچھ

نہ سمجھا۔ دو ایک منٹ اسی حالت میں گذر گئے۔ آخر حسینہ کو تاب نہ ہوئی بے اختیار ہنسنے لگی۔ اب وہ چونکے تو دیکھا بلقیس سر پر کھڑی ہے کہنے لگی کیوں بھائی صاحب اب آپ چوروں کی طرح جھانکا کرتے ہیں۔ یہ شرط کہ میں مولوی صاحب سے کہدوں یہ کہہ کر ادھر تو وقار جھینپے اودھر حسینہ شرما گئی۔ بلقیس نے کہا: محبت میں آدمی بہت ذلیل ذلیل باتیں کرنے لگتا ہے" وقار اس وقت مذاق کی طرف مائل نہ تھا ممکن تھا جس طرح مذاق میں بلقیس نے کہا تھا وہ بھی اسی طرح کوئی جواب دیتے لیکن بجائے اس کے وہ بالکل سنجیدہ ہو کر لجاجت سے کہنے لگے: میں کیا کروں حسینہ کو دیکھ کر میرے حواس بجا نہیں رہتے۔ میں مجبور ہوں" یہ بات اس قدر فریاد کے لہجے میں کہی کہ بلقیس کو ترس آگیا زیادہ اس نے نہ چھیڑا وہ بھی سنجیدہ ہو گئی اور کہنے لگی آخر آپ سوچتے نہیں کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ میں آپ دونوں کا حال دیکھ کے پریشان ہوں۔ اگر اس کی خبر مولوی صاحب کو ہو گئی تو سب سوچتی ہوں میرے واسطے کیا ہوگا پہلے ہی مجھ پر الزام کیا کم تھا اس حالت میں تو منہ دکھانے کے لائق نہ رہونگی۔

عالت عشق میں مرد عورت سے زیادہ عاجز و مجبور رہتا ہے وقار نے جواب دیا "تو تمہیں بتاؤ میں کیا کروں"

بلقیس:- تو آپ ہر مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں حسینہ کا مولوی صاحب سے طلاق لینا اور آپ سے شادی کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

وقار:- اس میں کیا شک ہے مگر میں ہر کام کے واسطے تیار ہوں۔

بلقیس:- اگر آپ کسمسائے تو پھر آپ سے زیادہ ذلیل کوئی شخص نہ ہوگا۔

وقار:- تم نے مجھے کیا سمجھا ہے۔

بلقیس:- اچھا میں حسینہ کو بھی جانچ لوں اور پکا کر لوں تو آپ سے کہوں گی

آپ سمجھ لیجیے جو کچھ میں کروں گی جان پر کھیل کے کروں گی۔ اگر آپ لوگوں میں سے کسی نے کچھ بھی پہلوتہی کی تو سمجھ لیجیے زندگی بھر میں صورت نہ دیکھوں گی۔

وقار:۔ تم تو اس طرح کہہ رہی ہو کہ معلوم ہوتا ہے کہ تمھارا کام ہے تم میرا کام کروگی میں یا حسینہ ایسے کمینے ہو جائیں گے کہ تمھیں پھنسا کر خود نکل جائیں گے۔

(باقی آیندہ) عبدالوالی

غزل

نہ سمجھو رند بلا نوش و بادہ خوار مجھے
مئے محبت ساقی کا ہے خمار مجھے

ستم ہے روکے وہ کہتے ہیں لاش دشمن پر
ملے گا اب نہ کوئی تجھ سا جاں نثار مجھے

پلائی پیر مغاں نے مئے محبت دوست
رہے گا حشر تک اس نشے کا خمار مجھے

نہ لے کے جاؤں غم خلق دل میں اے ساقی
پلا شراب فقط وقت احتضار مجھے

بُرا ہو عشق کا دونوں کو کر دیا برباد
نہ صبر یار کو اب ہے نہ ہے قرار مجھے

عدو کا ہو گیا جب تو تو کیا ہو زیست کا لطف
اجل کا شام و سحر اب ہے انتظار مجھے

بہار باغ جوانی ہے تیرے حُسن کی عید
دکھا دے شکل ذرا اے سمن عذار مجھے

قفس میں میں کوئی دم کا ہوں میہماں صیاد
دکھا دے آخری اس باغ کی بہار مجھے

مسیح وقت ہو آجاؤ پرسش غم کو
ستا رہا ہے بہت قلب بے قرار مجھے

گِلہ جو اُن سے کیا داغ دل کا یہ بولے
دکھا تو آج ذرا قلب داغدار مجھے

نہ دفن یار نے کی میری لاش قتل کے بعد
کہو کہ ڈھانک دے اب خاک روزگار مجھے

قمر خدا سے دعا ہے یہ بار بار مری
دکھا دے خواجۂ اجمیر کا مزار مجھے

قمر گیاوی

غزلیات

حضرت حسرت موہانی

جذبۂ شوق کدھر کو لیے جاتا ہے مجھے ۔۔۔ پردۂ راز سے کس نے یہ پکارا ہے مجھے

اُس جفا کار سے ملنے کی تمنا ہے جسے ۔۔۔ اب بھی میں کچھ نہیں کہتا یہی کہنا ہے مجھے

التفاتِ نگۂ یار کے لائق میں کہاں ۔۔۔ مجھ سے بیگانہ رہیں وہ یہی اچھا ہے مجھے

مرحبا آپ پہ کون آپ نے یہ بھی نہ سمجھا ۔۔۔ آپ کی جان سے دوست آپ سے شکوا ہے مجھے

قوت شوق بھی کیا ہے کہ ہوکر مایوس ۔۔۔ جب کبھی گرنے لگا ہوں میں سنبھالا ہے مجھے

تجھ سے ملنے کی یہ راہیں کہیں ہوجائیں نہ بند ۔۔۔ خوف رہ رہ کے یہی وہم سے آتا ہے مجھے

مجھ سے بیکار وہ ظاہر میں خفا ہیں حسرت
جب میں چاہوں گا منا لونگا - یہ دعویٰ ہے مجھے

حضرت دل شاہجہانپوری

مٹ گیا جب مٹنے والا پھر سلام آیا تو کیا ۔۔۔ دل کی بربادی کے بعد اُنکا پیام آیا تو کیا

پیر گئی بخت عاشق ٹھہرہ گئی شامِ فراق ۔۔۔ چرخِ نیلی فام پر ماہِ تمام آیا تو کیا

چھٹ گئیں نبضیں دیا جملہ اُمیدوں نے جواب ۔۔۔ اب اُدھر سے نامہ بر لے کر پیام آیا تو کیا

کاش اپنی زندگی میں ہم یہ منظر دیکھتے ۔۔۔ یوں سر تربت کوئی محشر خرام آیا تو کیا

ساقیِ توبہ شکن کی اک نظر درکار ہے ۔۔۔ تشنہ کاموں کی طرف لبریز جام آیا تو کیا

آنکھ اُٹھا کر کون دیکھے خاک میں دل مل گیا ۔۔۔ اب کوئی خورشید وش بالائے بام آیا تو کیا

اے دلِ ناشاد مٹ جا آج کوے یار میں ۔۔۔ تو مری ناکامیوں کے بعد کام آیا تو کیا

دیکھنا ہے آخر کار اس حسرت کا مآل ۔۔۔ اُس طرف کا جانے والا شاد کام آیا تو کیا

ساتھ آتا ساتھ رہتا ساتھ لاتا یار کو
بعد مدت نامہ بر لے کر پیام آیا تو کیا

دیر سے کعبہ میں پہنچی غیب سے آئی صدا
ٹھوکریں کھا کر سوئے بیت الحرام آیا تو کیا

سانس ٹوٹی آس ٹوٹی چھا گیا جب رنگ یاس
نامہ بر لایا تو کیا خط میرے نام آیا تو کیا

دل کا پیمانہ تو چھلکا ہے یہی کیا کم سرور
بزم ساقی سے اگر میں تشنہ کام آیا تو کیا

وہ دلِ پُر شوق جس میں تھی کسی کی آرزو
کامیاب آنے سے پہلے آپ کام آیا تو کیا

بودِ کِ نالاں ہمیشہ کے لیے چُپ ہو گیا
اب ترحم کا خیال اے خوش کلام آیا تو کیا

حضرت بیخود موہانی

تو نے ازل میں دل پہ یہ کیسی نگاہ کی
اب تک ہے ذرّہ میں زمیں جلوہ گاہ کی

ہاں میں نے خطِ کاتبِ تقدیر پڑھ لیا
ہاں میں نے اپنی فردِ عمل پر نگاہ کی

موسیٰ کی بات ساتھ گئی ان کے اور ہم
پلکوں سے جھاڑتے ہیں زمیں جلوہ گاہ کی

ہاں یہ ترے خیال کے قابل نہیں رہا
اس دل میں رہ چکی ہے تمنا گناہ کی

ہے کچھ تو میرے دل میں مگر یہ خبر نہیں
توبہ کا ہے خیال کہ حسرت گناہ کی

مٹنے لگا ہے خوبیِ انجام کا خیال
کھلنے لگی ہے دل پہ جو لذت گناہ کی

تھا کیا ... نظر وہ ہر اک شے میں دل کا ...
جس چیز پر نگاہ پڑی میں نے آہ کی

اب ... کیا کہ گیا ہے کسی دل کا ٹوٹنا
... رہا ہوں صدا آہ آہ کی

... کو ... ہوں ... تھا
... ہیں وہ قسم مرے حالِ تباہ کی

ہر ذرہ ... ہے یاں کے ... اک ... طرح
تصویر تیری اور تری جلوہ گاہ کی

بیخود ... ہے ... ہر خیال پر
تصویر ... گئی ترے حالِ تباہ کی

حضرت بیباک شاہجہانپوری

بس کہ ہم مارے ہوئے تھے گردشِ تقدیر کے
وحشتِ دل نے حوالے کر دیا زنجیر کے

دیکھ اے محسن تماشا دوست کیا کرتا ترا
بجلیاں گویا ہیں ذرے خاک دامنگیر کے

لوں جفا پر تمہارے ضبط سے کیونکر نہ کام
اشک کے قطرے ہیں آئینے تری تصویر کے

اس سے بڑھکر ہوگا کیا جذبِ محبت کا ثبوت
ہیں نگاہِ یاس میں جوہر تری شمشیر کے

وہ کسی کے مُنہ کی گویا بات سُنتے ہی نہیں
ہو گئے جو لوگ دیوانے تری تقریر کے

ایک فعلِ اضطراری کا جو الفت نام ہے
پھر ہوئے دشمن وہ کیوں مجھ ناتواں دلگیر کے

وادیِ الفت میں ہمکو رہنما سے کیا غرض
ہم جو پیرو ہیں تو اپنی خاک دامنگیر کے

عاشقوں کو تو لباس عاریت سے عار ہے
رنگ یہ لائق تھے میرے پیکر تصویر کے

یوں خدا را اسکو لکر میان میں خنجر نہ رکھ
رحم کر اے بخشنے والے مری تقصیر کے

زخم جس کا بے نشاں ہے درد میں کا لادوا
ہم تو ہیں اے چارہ گر مارے ہوئے اُس تیر کے

اپنے ہاتھوں سے پہنائی ہیں جو اُسنے بیڑیاں
میری آنکھیں نگیں حلقے مری زنجیر کے

ظاہرا پایا نہ اُس تیر نظر کا کچھ لگاؤ
چارہ گر گو غور سے دیکھا کیے دل چیر کے

ہم کسی کو کچھ بھی اپنے مُنہ سے کہہ سکتے نہیں
ہیں یہ سب بگڑے ہوئے نقشے تری تصویر کے

ہوتی ہے ظلمت بھی ذرّوں کے لیے وجہ نمود
سب یہ جلوے ہیں اُسی اک حسن عالمگیر کے

جو ہیں اہلِ دل رہیں قائم اُسی بنیاد پر
ہیں ابھی کچھ داغ باقی حسرت تعمیر کے

اپنے دل کا خون کرتے تھا کچا غمخوارِ عشق
اب کہاں وہ سُننے والے نالہ شبگیر کے

گریۂ خوں بھی دمِ عرضِ تمنا ہے ضرور
خوب جب سمجھیں گے وہ مطلب مری تقریر کے

ہے یہی بیباک اپنا ترجمان شوقِ قتل
بزم میں کیونکر نہ صدقے جایئے گلگیر کے

حمید اللہ خان صاحب حمید بریلوی

دیکھیے جو تجکو اے بیتہ مے نوش آفتاب
بن جائے تیرے جام کا سرپوش آفتاب

مستوں کی طرح پھرتا ہے مدہوش آفتاب
شاید ہے اُسکی بزم کا مے نوش آفتاب

وہ تاب ہے کہ تاب نظارہ نہ لا سکا
دیکھا جو تجھکو ہوگیا بے ہوش آفتاب

چوتھے فلک پہ پاؤں جو رکھے وہ رشک مہر
بن جائے پاؤں چوم کے پاپوش آفتاب

اُس رشک مہ کے سامنے کیسے تو آئیگا
محشر میں دیکھنا ہے ترا جوش آفتاب

کچھ بھی نہیں ہے چہرۂ انور کے سامنے
میری نظر میں ہے تری پاپوش آفتاب

جلوے کسی کے حسن کے آفت ہیں قہر ہیں
دیکھے جو اک جھلک تو ہو بیہوش آفتاب

دن میں کبھی نقاب جو رخ سے اُلٹ دیا
مُنہ دیکھتے ہی ہوگیا خاموش آفتاب

ثابت ہوا یہ اُس کی شعاؤں کو دیکھ کر
آتا ہے تیرے آگے ذرہ پوش آفتاب

لازم ہے اُسکے رُخ کو غلامی کا خط لکھے
ہوجائے اپنے حق سے سبکدوش آفتاب

قسمت سے مدتوں میں ملی رات وصل کی
یارب سحر نہ ہو رہے روپوش آفتاب

دنیا و دیں کی کچھ نہیں ہوتی اُنھیں خبر
پی لیتے ہیں جو رندِ بلا نوش آفتاب

وہ بن سنور کے شام کو جاتے ہیں بام پر
غیرت سے جاکے ہوتا ہے روپوش آفتاب

روزِ فراق تونے جلایا غضب کیا
تا حشر یہ نہ ہوگا فراموش آفتاب

چہرہ ترا جو گیسوِ مشکیں سے کھل گیا
شرمندہ ہوکے ہوگیا روپوش آفتاب

ہر روز شام ہی سے لباس سیاہ ہے
ماتم ہے کس کا کیوں ہے سیہ پوش آفتاب

حیرت سے دیکھتا ہوں شبِ وصل یار یار
پہلو میں تم ہو یا ہے ہم آغوش آفتاب

چلمن سے باہر آکے وہ بیٹھے ہیں بے نقاب
کیوں ہو نہ جائے شرم سے روپوش آفتاب

قصہ جو دل جلوں کا قیامت میں چھڑ گیا
سُننے کو بن گیا ہمہ تن گوش آفتاب

جادو بھرا غضب کا ہے اُن کی نگاہ میں
ہو کیوں نہ دیکھ دیکھ کے مدہوش آفتاب

ساغر سمجھ کے ہاتھ بڑھائیں گے اے حمید
دیکھیں گے روزِ حشر جو مے نوش آفتاب

حبیب النبی خاں صاحب صولت (کلکتہ)

اُٹھا کہتا ہوا الحمد للہ جب قلم میرا — تو گویا دستِ رب خود بن گیا دستِ رقم میرا
شکارِ یاس کیوں ہونے لگا کارِ اہم میرا — نہیں کیا دستِ ہمت گیر خود دستِ کرم میرا
ہے پامالِ تغافل آج جو نقشِ قدم میرا — دلِ عالم میں گاڑے گا یہی اک دن علَم میرا
جدا ہونے لگے گا جب تنِ خاکی سے دم میرا — محبت بن کے ہر اک دل میں بس جائیگا غم میرا
فنا فی اللہ کی منزل سے بڑھ جائے قدم میرا — بقا میں مل کے خود معدوم ہو جائے عدم میرا
نمایاں جلوۂ توحید ہے ہر شعر سے اپنے — رہیں شانِ رحمانی ہے اندازِ رقم میرا
دمِ قطعِ منازل راہِ توحیدِ الٰہی میں — رہا منت کشِ شانِ رحیمی ہر قدم میرا
ہے مملو کی مری رشکِ شہنشاہانِ باہیبت — ہے مالک سروری بخشِ ملوکِ باحشم میرا
لبِ خاموش سعی دل کی ہر ساعت صدا یہ ہے — ترے ہی ہاتھ ہے اے چشمۂ رحمت بھرم میرا
تسلی آ کے پھر اے عاجزی دے ہمت دلکو — مقامِ صبر سے پھر ڈگمگاتا ہے قدم میرا
بجا ہے ہر ستم خانے میں گر ہو اک ستم برپا — ستم نا آشنا کے آگے روتا ہے ستم میرا
پئے چشمِ بصیرت نقشہ ہائے عبرت افزا کا — ہے اک آئینہ ہر ہر دیدۂ نقشِ قدم میرا
منقش ہے ھو اللہ احد اخلاص کے دل پر — نفاقِ غیر سے کب رتبۂ ایماں ہو کم میرا
بنے کیونکر نہ اے قرآں ترے فیضِ ہر آیت سے — صراطِ مستقیمِ سالکاں نقشِ قدم میرا
ادھر بھی اک توجہ اے عطائے شانِ ربانی — کہ دل ظاہر پرستوں سے ہے پامالِ ستم میرا
کرم سے بابِ رزقِ خیر اے فتاح وا کر دے — کہ ظاہر بیں نگاہوں میں بھی نقشہ جائے جم میرا
ڈبو دے مجھکو موجِ بحرِ رنگِ کبریائی میں — نہ کبرِ غیر کے آگے الٰہی سر ہو خم میرا
ثوابِ حجِ اکبر کیوں نہ اب حاصل ہو گھر بیٹھے — کہ ہے لطفِ تصور سے حریمِ دل حرم میرا
کبھی جو دل مرقع تھا تصاویرِ خیالی کا — تصور ہائے حق سے اب ہے وہ بیت الحرم میرا
حقیقت میں جفائے دوست اک ترکیب ہے ع — جفا کی دوست سے نسبت! ہے ایجادِ ستم میرا

کبھی پھسلا کبھی ٹھہرا کبھی جم جم کے پھر اٹھا	صراطِ عشق میں بڑھتا گیا لیکن قدم میرا
تنک ظرفی نے میری مجھکو رکھا دور منزل سے	رہا روزِ سفر سے ورنہ مقصد ہم قدم میرا
رہے یارب جہاں میں رہبر راہ وفا ہوکر	حفاظت میں تری رحمت کی ہر نقشِ قدم میرا
دعاے عجزِ دل اور چشمِ انصاف خداوندی	جہادِ نفس میں بس ہے یہ شمشیر دو دم میرا
لیے ہوں اک جہانِ انقلاب اپنے درونِ دل	نہ کیونکر اہل دل سمجھیں غنیمت دم قدم میرا
سنبھالے کاش فتح باب رحمت آکے پھر اسکو	شکستِ دل سے پھر کچھ لڑکھڑا آتا ہے قدم میرا
لیا درسِ محبت دل نے اُس کی پاک الفت سے[1]	رہے ظلِّ رحیمی میں بشیر محترم میرا

بشیر احمد کہ صولت میرا استادِ محبت تھا
رہے گا حشر کے دن بھی خلیل محترم میرا

حکیم محمد رفیق ابراہیم صاحب رفیقؔ لکھنوی

ہم کہ آئے تھے جیتی کے لیے	ہو گئے وقف بیخودی کے لیے
دل لیا تھا تو قدر بھی کرتے	یا کھلونا تھا دل لگی کے لیے
پڑکے عشقِ بتان پرفن میں	لگ گیا روگ زندگی کے لیے
غیر کے سامنے مرا شکوہ	کیا قیامت ہے بیکسی کے لیے
رہ نہ جائے کوئی جفا باقی	ننگ ہے یہ ستمگری کے لیے
اے فلک اسقدر ستم کیشی	رکھ اسے اور بھی کسی کے لیے
ہے تمناے رقیب وصل کی شب	چھیڑ اچھی ہے دل لگی کے لیے
ہے ازل سے دلِ حزیں اپنا	وقف تیری جفاکشی کے لیے

بعد مردن رفیق کچھ بھی نہیں
سب یہ جھگڑے ہیں زندگی کے لیے

---

[1] عزیزی بشیر احمد مبرور و مغفور کہ در عین جوانی وفات یافت ۔ رحمۃ اللہ تعالے ۔

کیا آپ کو پری جمال کی آرزو ہے

اور آپ نے اس کو اب تک نہیں دیکھا ہے تو آج ہی پیسہ کا کارڈ لکھ کر دیجیے۔

پری جمال صابن

حسن و خوبصورتی پیدا کرنے اور چہرے کی رنگت کو صاف کرنے میں بے نظیر ہے۔ صرف سات روز ملکر نہانے سے کالا رنگ کملایا ہوا چہرہ گلاب کی پتی کے مانند خوبصورت اور مخمل کے مانند ملائم ہو جاتا ہے۔ خاص حکیم صاحب کی ایجاد ہے۔ چہرے کے تمام مہاسے داغ۔ دھبے۔ چھائیاں دور کر کے چہرے کو خوشنما بنا دیتا ہے۔ اکثر نوابوں راجاؤں ورئیسوں اور ان کی بیگماتوں نے اسکو نہایت ہی پسند کیا ہے۔ بلحاظ خوبصورتی۔ خوشبو اور فوائد کے اپنی نظیر آپ ہے۔ فی بکس تین ٹکیہ مع ایک نمائش ایبل صابن دانی صرف عہ،

پری بہار ہیر آئیل

یہ سر میں لگانے کا خوشبودار تیل جو اپنی نفاست اور خوشبو فائدوں میں لاجواب مانا گیا ہے۔ بالوں کو خوشنما بنا دیتا ہے۔ اسکے استعمال سے بال لمبے اور ریشم کی طرح ملائم ہوتے ہیں۔ اس کی خوشبو لاجواب ہے۔ قیمت فی شیشی ۱۰ تولہ ایک روپیہ (عہ)

پتہ:۔ حکیم محمد یعقوب خاں دواخانہ نورتن دہلی

ہماری دہلی ہندوستان کا صدر مقام ہے

اور تجارت کی منڈی ہے۔ ہر قسم کی چیزیں یہاں سے دُنیا بھر میں جاتی ہیں۔

دہلی سے عمدہ و نفیس مال منگانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ جس چیز کی آپ کو ضرورت ہو۔ پتہ ذیل پر فرمائش روانہ کر دیجیے

ہر علم و فن کی چیزیں بلا تکلف طلب فرمایئے۔

عمدہ و نایاب کتابیں

یادگار دہلی

اس کتاب کے دیکھنے سے دہلی کے مفصل حالات مع نقشہ جات اور مشہور مقامات اور زیارت گاہیں اور جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں سب درج ہیں۔ فی جلد ۱۰/

کرکٹ گائیڈ مع کھیل ٹینس فٹ بال

اس میں کرکٹ وغیرہ کے عمدہ عمدہ قاعدے تحریر ہیں۔ ان کے موافق مشق کرنے سے چند روز میں کھیل آ جاتے ہیں۔ فی جلد مجلد ۶/

چاندی کے نفیس زیورات

بٹن چاندی کرتہ زنجیردار

چاندی کے چار بٹن مع ایک سنہری زنجیر لگے ہوئے بٹنوں میں ڈائمنڈ کٹ بنا ہوا ہے فی سٹ عہ/

بٹن چاندی قمیص یا کرتہ

چار بٹن پھولدار پاکیزہ بنے ہوئے فی سٹ عہ قمیص کے گلے و ہاتھوں کے ۸ بٹن پورا سٹ عہ

سونے کی ناک کی کیلیں

یہ کیلیں خالص سونے کی ہیں۔ نزاکت اور خوبصورتی میں لاجواب ہیں خاص حسن کا سنگھار ہیں فی عدد جڑاؤ نہیرا ۔ سادہ ۔ دوم

پتہ:۔ ایچ محمد یوسف خاں منیجر شہرت ایجنسی دہلی فراش خانہ

قیمتوں میں خاص رعایت

بتقریب سالانہ جلسہ آریہ سماج لاہور

ذیل میں صرف چند ادویات کے نام نمونۃً درج کئے جاتے ہیں۔ دیگر ادویات کی قیمتوں میں بھی ۵ اکتوبر ۱۹۱۷ء سے ۳۱ دسمبر ۱۹۱۷ء تک چار آنہ فی روپیہ کی رعایت ملے گی۔ مفصل "رعایتی فہرست" کارڈ لکھ کر منگالیں

نام دوائی	مختصر فوائد	مقدار پیکٹ	اصلی قیمت	رعایتی قیمت
۱ [illegible]	ازکار رفتہ مریضوں کے لئے جیون بوٹی - اُمرا کے لئے نادر تحفہ جسم میں بجلی بھر دیتا ہے۔	ایک ماشہ	[illegible]	[illegible]
۲ دوائے نامردی	شرطی دوا - ایک بکس سے آرام نہ آئے۔ تو اور دوا مفت دیجاتی ہے		[illegible]	[illegible]
۳ چندر کلا رس	جریان اور احتلام کے لئے اکسیر بے نظیر - ایک دفعہ ضرور تجربہ کرو	۱۰۰ گولی	[illegible]	[illegible]
۴ سپاری پاک	عورتوں کے مرض لیکوریا کی بیخ کنی کر دیتا ہے ہزاروں عورتیں از سر نو زندگی حاصل کر چکی ہیں۔	۱۶ تولہ	[illegible]	۱۲/
۵ پھلسوتن پراش	قلت حیض اور رحم کی عصبی خرابی کو دور کر کے عورتوں کو اولادِ نرینہ پیدا کرنے کے قابل بناتا ہے۔	۱۵ تولہ	[illegible]	[illegible]
۶ منوہر رسائن	مشہور کیمیا صفت چیز ہے۔ اعضائے رئیسہ کو طاقت دیکر دنوں میں کایا پلٹ دیتی ہے۔	۲۰۰ گولی	[illegible]	[illegible]
۷ ویجیٹیبل سارساپریلا	بہترین اور ارزاں ترین مصفی خون دوائی - خون کی ہر قسم کی خرابی کو دور کرتی ہے۔	۳۲ اونس	۱۲/	۹/
۸ چیون پراش	پرانی کھانسی کا بہترین علاج جسمانی کمزوری کو بھی دور کر دیتا ہے	۵۰ تولہ	[illegible]	[illegible]
۹ [illegible]	سوزاک کا مجرب الاثر علاج [illegible] اور پیپ کے آنے کو دنوں میں دور کر دیتا ہے۔	[illegible] ڈرام	[illegible]	[illegible]
۱۰ [illegible]	[illegible] دنوں میں [illegible] کر کے زہر کو بے اثر کر دیتا ہے	۱۰ تولی	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible] ہزاروں دفعہ کا آزمودہ علاج	۲۰ تولہ	[illegible]	[illegible]

کارخانہ ادویات [illegible] کمپنی لمیٹڈ [illegible] بازار لاہور تار کا پتہ:- رسائن لاہور

پچے اور اڑان ہوے سے بیش قیمت فولاد ہزار گونہ زیادہ کھلتا ہے۔

سرکار سے رجسٹری شدہ — **دودروگج کیسری** — داد کی بے خطا دوا

بلا جلن اور تکلیف کے داد کو جڑ سے دور کرنے والی اگر کوئی دوا ہے تو یہی ہے۔ **قیمت فی شیشی چار آنہ**
جس شیشی پر سکھ سنچارک کمپنی کا نام نہ لکھا ہو اُسے ہرگز نہ خریدیے۔ **سب سے قابل اطمینان خط**
مہاشے آپ کی دوا۔ دردوگج کیسری کا استعمال کیا گیا۔ داد اچھے ہوگئے دوا سودمند ہے۔
آپ کا راجہ سر رام پال سنگھ کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ راج کرسی سدولی ضلع رائے بریلی۔

بال سدھا اگر آپ کو اپنے بچے موٹے تازے اور تندرست بنانے ہیں اور روزہ کی بیماریوں سے انکا پیچھا چھڑانا ہے تو اس شیشی دوا کو منگا کر پلائیے ایک شیشی تقریباً ایک ماہ کو کافی ہے۔ **قیمت فی شیشی بارہ آنہ۔ ڈاک خرچ چھ آنہ۔**

آپ کو اپنی ضرورت کی کوئی چیز بھی درکار ہو تو پیشتر ہم سے دریافت کیجیے اور ہماری فہرست طلب فرما کر ملاحظہ فرمائیے۔

ملنے کا پتہ: سکھ سنچارک کمپنی متھرا۔

لوگوں کی رائے

اس بات کے لیے پختہ ہوگئی ہے کہ سکھ سنچارک کمپنی متھرا کا تیار کردہ سُدھا سندھو ہی سب سے سچی اور فوراً شفا بخشنے والی بے خطا دوا ہے باقی اسکی نقلیں ہیں یہی وجہ ہے کہ اس نایاب دوا کے فروخت کرنے کو **چوتھائی لاکھ** سے زیادہ ایجنٹ مہیا ہو چکے ہیں ۲۷ سال کی طویل آزمائش کے بعد یہ کامل طور پر یقین ہو چکا ہے کہ اس کمپنی کا سُدھا سندھو بلا کسی چیز کی آمیزش کے کف۔ کھانسی۔ دمہ۔ ہیضہ۔ ہرے پیلے دست، خونی دست، آنوں پیچش۔ قولنج۔ زکام۔ سردی۔ نزلہ وغیرہ امراض کو دفع کرنے میں اکسیر کا حکم رکھتی ہے یہ ایک خوش ذائقہ اور خوشبودار دوا ہے۔ قیمت فی شیشی آٹھ آنہ ڈاک خرچ ایک سے چھ شیشی تک تین آنہ۔

چند ہزار اسنادوں میں سے چند یہ ہیں:-

شری ونکٹیشور اخبار بمبئی ۲۱۔ فروری ۱۹۱۰ء سکھ سنچارک کمپنی متھرا کا سدھا سندھو بدہضمی اور اس سے پیدا شدہ ہیضہ وغیرہ امراض کی ایک بیخطا دوا ہے..... ابھیودے اخبار الہ آباد ۹ مئی ۱۹۰۹ء سدھا سندھو حقیقت میں امرت کا سمندر سُدھا سندھو ہی ہے جملہ خانہ داروں کو یہ دوا اپنے پاس رکھنا چاہیے کیونکہ یہ بہت قسم کے امراض میں مفید ہوتی ہے ہم نے ایک ۱۰۔۱۲ شیشی منگا کر فائدہ دیکھا ہے.... شری پنڈت مہابیر پرشاد جی دویدی ایڈیٹر سرسوتی الہ آباد۔ ہماری ضعیف والدہ جن کی عمر ۷۰ سال کی تھی کف اور کھانسی سے بیمار تھیں انکو ہم نے سُدھا سندھو کے دس قطرے دیے۔ دیتے ہی اس نے جادو کا اثر کیا..... ہماری دوا سب بڑے دوا بیچنے والے اور دیگر دوکانداروں کے پاس بھی ملتی ہے گر دھوکے سے دوسری مصنوعی دوا نہ خرید لیجیے گا چار رنگ کی تصویر اور تصویر دار بڑی فہرست سب کو بلا قیمت ملے گی۔

منگانے کا پتہ: سکھ سنچارک کمپنی متھرا

تمدّن

اگر مَیں مرد ہوتی

انسان ہونے کی حیثیت سے مرد اور عورت دونوں یکساں ہیں۔ وہ بھی انسان۔ یہ بھی انسان۔ خدا کی طرف سے ان دونوں کے کام کسیقدر مختلف ہیں مرد کے ہاتھ پاؤں زیادہ مضبوط اس لیے بنائے ہیں کہ وہ محنت و مشقت زیادہ کرے عورت کو کمزور اس لیے بنایا ہے کہ وہ صبر اور پیٹہ مارنے کی زیادہ عادی ہو یہ تو ظاہر کا فرق ہے۔ ان دونوں میں باریک فرق یہ ہے کہ مرد دماغ سے زیادہ کام لینے کے لیے بنایا گیا ہے اور عورت دل سے۔ اسلیے اگر مجموعی حیثیت سے انسان پر نظر ڈالی جائے تو یہ کہنا غالباً بیجا نہ ہوگا کہ مرد انسانیت کا دماغ ہے اور عورت دل۔

دنیا میں مردوں نے جو دماغ سے کام لیا ہے وہ ہر طرح تحسین و آفرین کا مستحق ہے۔ دنیا کا انتظام۔ پیشوں اور ہنروں کی ترقی۔ علم۔ نئی نئی ایجادیں

غرض جو کچھ ترقی کے نام سے منسوب ہو سکتا ہے وہ مردوں نے دماغ ہی کی بدولت کیا ہے۔ مگر اسکے ساتھ کچھ اُن میں ہما ہمی ایسی تھی کہ کسی نہ کسی بہانہ سے وہ ہمیشہ لڑتے رہے۔ شروع میں جانوروں کی طرح کھانے پینے کی چیزوں۔ پھر رہنے سہنے کے سامانوں۔ حتّٰی کہ عورتوں پر لڑتے رہے آگے بڑھے تو ملکوں کو فتح کرنے اور سچ یا جھوٹ مذہب کی طرفداری میں لڑتے رہے۔ شدہ شدہ موجودہ تہذیب کا آفتاب طلوع ہوا۔ اسمیں پہلی قسم کی لڑائیاں مذموم سمجھی گئیں مگر قومیت اور ملکیت کے خیال نے دماغوں پر تسلط کر لیا اور اب عرصۂ دراز سے بڑے بڑے ملکوں اور بڑی بڑی قوموں کے درمیان جو لڑائیاں ہوتی ہیں وہ انھیں وجوہ پر مبنی ہوتی ہیں۔ فلسفہ سائنس اور معمولی علوم نے جبقدر دماغ کو تیز کیا اسیقدر باریک بینی مصلحت اندیشی اور انسانیت سے لڑائیاں ہونے لگیں۔ غالباً سلسلہ اسی طرح چلا جائے گا اور اس سے یہ نتیجہ نکالنا غالباً غلط نہو گا کہ جبتک مرد کا دماغ بالکل آزاد ہے تب تک لڑائیاں بند نہوں گی۔ قدرت مرد کی اس خصوصیت سے واقف تھی اور اسی لیے اُس نے عورت کا جوہر لطیف مرد کی زندگی میں ملا دیا تھا۔ اگر ہر کام میں مرد کا دماغ اور عورت کا قلب شامل کر لیا جائے تو امید کی جا سکتی ہے کہ انسان کی زندگی امن اور آسایش سے گذرنے لگے۔

نہ مَیں یہ کہتی ہوں کہ مرد اور عورتیں ہر بات میں بالکل برابر ہیں نہ مَیں یہ طلب کرتی ہوں کہ عورتونکو بالکل وہی حقوق ملیں جو مردوں کو حاصل ہیں۔ مَیں تو صرف یہ کہتی ہوں کہ مرد تسلیم کر لیں کہ صرف دماغ بغیر قلب کی رہنمائی کے ہما ہمی اور اُسکے بُرے نتائج سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اُدھر عورتیں خوب اچھی طرح سمجھ لیں کہ ہم کاموں کے محرک۔ اصلی چلانے والے

(یعنی بنیڈیا بیل) اور خود مختار منتظم نہیں ہیں۔ بلکہ جسطرح دل کا کام دماغ کو نازک
اور نفیس پیرایہ میں مدد پہنچانا اور اُسکی تیزی اور خشک روی کو سمونا ہے اُسی طرح
عورت کا کام مرد کو عمدہ طور پر نرم باتوں اور نفاستِ مزاج۔ رحم اور عدل۔ درگذر
اور جود و سخا کی طرف مائل کرتا ہے۔ اگر ماں اپنے بچے میں یہ نفیس اثر نہ پیدا کرسکی
تو اُس نے اپنے فرائض کو پورے طور پر انجام نہ دیا۔ اگر بیوی اپنے شوہر میں
یہ پھلجھریاں نہ چھوڑ سکی تو اُس نے زندگی کے ایک بڑے مقصد کو پس پشت ڈالدیا
مردوں نے اگر عورتوں کے دل کے خداداد نفیس تبرکات کی قدر نہ کی اور اُن کو
سرآنکھوں پر نہ رکھا تو وہ ضرور خدا کے یہاں جواب دہ ہوں گے۔ اور دنیا
میں بھی اُن کی زندگی تلخ رہے گی۔ مردوں کو چاہیے کہ عورتوں کو اپنا
خالص اور خدا کی طرف سے مقرر کیا ہوا مددگار سمجھیں اور اُن سے مدد لیں۔
عورتوں کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اس مدد پہنچانے کا اہل ثابت کریں۔

یہانتک تو خشک بحث تھی اب میں یہ بتاؤں کہ اگر میں مرد ہوتی تو کیا
کرتی۔

سب سے پہلے میں ایک عجائب خانہ بنواتی اور اُس میں مختلف مزاجوں
اور مختلف شانوں کے مردوں کو علٰحدہ علٰحدہ پُرتکلف کمروں میں رکھتی مثلاً:۔
کمرہ ۱ اسمیں چھانٹ کر نمونے کے دو چار مرد ایسے رکھتی جو در اصل بدصورت
ہیں مگر اپنے تئیں خوبصورت سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ عورتیں بھی انھیں خوبصورت
سمجھیں۔ کوئی آئینہ میں اپنی صورت دیکھکر خوش ہو رہا ہے۔ کوئی خواہ مخواہ
موچھوں پر تاؤ دے رہا ہے۔ ایک صاحب اپنے ڈاڑھوں کو مل رہے ہیں۔ تو دوسرے
صاحب اس زعم میں کہ میں خوش گلو ہوں گنگنا رہے ہیں تیسرے صاحب جب اپنی محبوبہ کو
نیم مصنوعی خط لکھ رہے ہیں اور اس خوشی میں پھولے نہیں سماتے کہ اسکا ایک ایک فقرہ

پڑھنے والے کے دل کے پار ہو جائے گا اور وہ ع سار باں چاک ہو دل پردہ محمل کیسا کے مضمون کے موافق میرا کلمہ بھرتی ہوی گھر سے نکل آئے گی -

کمرہ ۲ - اس کانچی حوض میں ایک درجن راس وہ معزز حضرات ہوتے جو عورتوں کو نظر حقارت سے دیکھتے ہیں - اور اُن کو سوائے چکّی چولھے اور بچوں کے گُو موت کے اور کسی مصرف کا نہیں سمجھتے - جنھوں نے گھر کو صرف ایک سرائے مقرر کر رکھا ہے اور جو سوائے آرام پانے کے اور ہر وقت اپنے ہی کام کاج کی مصیبت ڈالنے کے گھر سے اور کوئی دلچسپی نہیں رکھتے - جنھیں بیوی بچے زہر اور اُن کے اخراجات وبال معلوم ہوتے ہیں - یہ لوگ بیشتر وہ ہیں جنکی تفریحات گھر سے باہر وابستہ ہیں - کچھ خدا رسول کا خوف کچھ دنیا کی شرم - زیادہ تر اپنا آرام صرف یہی باتیں انھیں بادل ناخواستہ گھر کے کھونٹے سے باندھتی ہیں ورنہ اُنکا دل ہر وقت باہر ہی پڑا رہتا ہے اور ؎

حسن ایسی کیا چاٹ ہے اُس گلی کی
چھُٹے اور غائب کھلے اور ندارد

تیسرا کمرہ حمام نما سنگ مرمر کے فرش کا ہوتا اس میں جے صاحب ہوتے اُن سب کے سر مُنڈے ہوے ہوتے اور اُنپر پانی کی مشکیں چھٹتی ہوتیں - یہ وہ بزرگ ہوتے جو سرے سے شادی کرنا ہی بُرا سمجھتے ہیں - ان کی آزادی میں فرق آتا ہے ان کو ایک خاص حد تک لباس سے بھی معترا کردیا جاتا - کیونکہ لباس کی بکھیڑ بندش اور اُسکے طول طویل اہتمام سے بھی آزادی میں فرق آتا ہے - ہر قسم کے جانوروں کی خوراکیں اُن کے لیے ہم پہنچائی جاتیں تاکہ صرف انسانی غذا کھانے سے آزادی میں فرق نہ آئے - اوڑھنا بچھونا کچھ نہ دیا جاتا - پیشاب پہنچانہ کے معاملہ میں قانون تہذیب سے مستثنیٰ ہوتے کیونکہ سب سے مقدم یہ ہے کہ آزادی میں فرق نہ آئے

چوتھا کمرہ کسی قدر تقدس کا رنگ لیے ہوے ہوتا۔ اسمیں وہ بے دست و پا صابر شاکر زندہ درگور روحیں ہوتیں جو بیوی کا دانہ کھاتی ہیں۔ بیوی کی اپنی آمدنی ہے تو میاں اب ہاتھ نہیں ہلاتے۔ طرہ یہ ہے کہ بیوی کو اور جھکنا پڑتا ہے کہ میاں کو ناگوار نہ گذرے کہ میں جو نہیں کماتا تو میری حقارت کی جاتی ہے۔ غرض عورت ہر طرح مری۔

آخری کمرہ۔ اور یہی کمرہ اُس مکان کیا بلکہ سارے جہان کی جان ہوتی ہے جسمیں چند وہ لوگ مع اپنے بیوی بچوں کے راحت گزین ہوتے جنکے دل گواہی دیتے کہ ہم دنیا میں بھی سرخرو ہیں اور آخرت میں بھی سرخرو ہوں گے یہ وہ لوگ ہیں جو فطرت کے جیّد اور پاک قانون سے واقف ہیں۔ جو عورتوں اور بچوں کی قدر و منزلت کرتے ہیں۔ جو محبت اور رواداری کے فرشتے بن کر رہتے ہیں اور نفسانیت کے شیطان کو پابہ زنجیر کرکے اپنے مقدس گھروں سے نکال دیتے ہیں اور جو محنت مشقت۔ محبت کفایت شعاری۔ اور میانہ روی سے گھر کو نہ صرف اپنے لیے بلکہ بیوی بچوں کے لیے بھی نمونۂ جنت بنا دیتے ہیں۔ اولٰئک ھم الفائزون (یہی کامیاب ہونے والے ہیں)

برقع اور مستورات

دنیا کا بھی عجب حال ہے - ایک طرف تو نوایجاد برقعوں کی بھرمار ہو رہی ہے اور کوشش کی جا رہی ہے کہ عورتوں کو وقت بے وقت باہر چہل قدمی کرائی جائے تاکہ اُن کی صحت عمدہ ہو اور وہ چار دیواری میں گھُٹے رہنے کے سبب سے پژمردہ اور مریض نہ رہیں - مگر دوسری طرف برقعوں اور عورتوں کی جائز مشی پر نکتہ چینی کرنے کا کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا جاتا - مندرجۂ ذیل مضمون جو ایک صاحب نے بڑی عرق ریزی سے لکھا ہے اسی قبیل کا معلوم ہوتا ہے - اگر نسائی صاحب کی یا اُنکی طرح کسی اور خاص طرف دار صنف لطیف کی نظر پڑ گیا تو کیا تعجب ہے کہ وہ آئندہ بے ڈھنگی ڈاڑھیوں - انوکھی موچھوں - بھیانک عینکوں - گنبد نما توندوں وغیرہ کے خاکے کھینچیں - (سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو صفحہ ۲)

ایڈیٹر

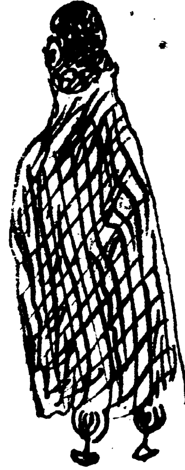
رباعیات

کیفِ مے پندار سے مدہوش نہ ہو
خاطرِ بشر کسی کی حق پوش نہ ہو
کیا عرض کروں کیا ہو نہ کیا ہو انساں
جو کچھ بھی ہو احسان فراموش نہ ہو

تقریر میں وسعتِ خوش بیانی نہ رہا
تحریر میں رنگِ نوجوانی نہ رہا
تصویر ہوں یک پیری و صد عیب کی میں
افسوس کہ لطفِ زندگانی نہ رہا

کیا کیا نہ پڑے رنج سے پالے مجھکو
دن رات رہے جان کے لالے مجھکو
مر کر چھوٹا ہوں قید غم سے صد شکر
اے خاکِ لحد! اب تو چھپالے مجھکو

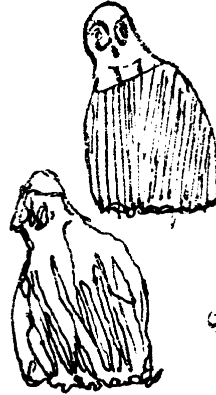
(حضرت واصلی)











یہ دُمدار سیارے کثرت سے حجاز کی طرف گرا کرتے ہیں جہاں ان کی نموداری کا وقت آج ہی کل ہے ۔ مگر ہماری دنیا میں بھی مناسب وقت پر فرداً فرداً یا مجموعی طور پر دیکھنے کا اتفاق ہوجاتا ہے ۔ رنگ گیروا یا بھنگ میلا جو کہ چند روز میں اندرونی ابخرات کی وجہ سے اُداس ہوجاتا ہے مگر اس سے جذبات اور کشش پر اثر

نہیں پڑتا - ایسی صورت میں اُسکی طرف نگاہ اُٹھانے سے طبیعت کو مالش پیدا ہوتی ہے - چنانچہ حکما مریض کو اس سیارے کو دکھا کر استفراغ کراتے ہیں - یہ عجیب بات ہے کہ مکھیاں اس موجودہ حالت میں اسکی طرف بہت رغبت سے رجوع ہوتی ہیں جہلا اسکو سریا سرنگی کہتے ہیں چونکہ ہر سہ اقسام آخری اُنکے زیر نظر گذرتے ہیں

قبیلہ سَن سَن و مین مِن :- ہندوستان کے بڑے شہروں کی تاریک گلیوں اور کوچوں میں رات کو آٹھ بجے پھرنے سے کبھی کبھی اسکی جھلک دکھائی دیتی ہے - اسمیں پھرتی زیادہ ہوتی ہے - خیال ہوتا ہے کہ کسی ستارے کی کشش اسکو سرعت کے ساتھ اپنی طرف کھینچ رہی ہے - مگر ٹکرا کر ٹوٹتا اور گرتا نہیں دیکھا

قبیلہ چرخ اور چوں - یہ شاید ایک ہی قبیلہ ہے - دن کو شارع عام پر حرکت کرتا ہے اور نیز میلے اور مجمع میں جیسا کہ عیدگاہ یا کربلا کے نزدیک -

قبیلہ عطارد واسد - یہ پرنیاد و دیوزاد سیارے ریل کے سفر میں محسوس رہتے ہیں - ان کی چمک مریخ اور زہرہ کو خیرہ کرتی ہے - چونکہ صرف دوربین سے دیکھے گئے ہیں اس لیے ابھی پوری واقفیت انکی ماہیت وغیرہ کی نہیں ہوی - مگر بعض کا قول ہے کہ ان کی نیش زنی اور گڑگڑاہٹ قیامت کی ہے - اگر کسی وقت ہماری زمین سے ٹکرا گئے تو آفت کا سامنا ہوگا - (سلسلہ کے ملاحظہ ہو صفحہ ؟

(۱) "درحقیقت دنیا میں کفایت ہے مگر سب سے اچھی کفایت وہی جو قابل فہم ہو"

(۲) "ہر کام کی خوبی کام کرنے والے کی غرض پر منحصر ہوتی ہے"

(۳) "زہد سب سے زیادہ مستقل نیکی ہے اور بدترین بدی بدخوئی ہے"

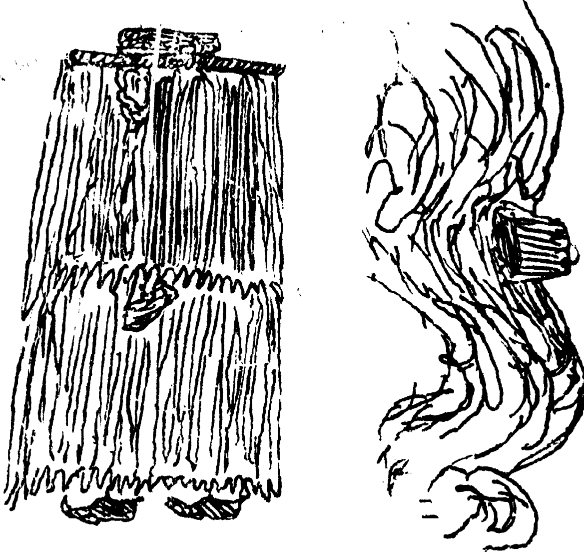
(۴) "عہد کی وفا میں مستقل رہو قبل اسکے کہ میعاد ختم ہو جائے مبادا عدم وفا سے تمھیں نقصان پہنچے"

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

تہذیب یوریشیائی کی جھلک - قدرت کے عجائب نمونے کوہستان میں



یہ تابوت بینڈ باجے کے روز یعنی ہفتہ میں تین روز نکالا جاتا ہے
مقصود عبرت نہیں حسرت ہے



ٹاپا غوطیلہ

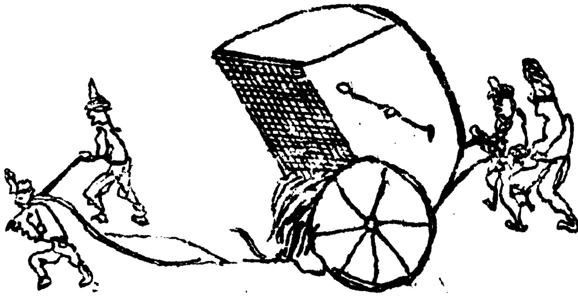
یہ نادر ٹاپا بہت ہی مفید ثابت ہوا ہے۔ اول تو بوچھار سے محفوظ رکھتا ہے۔ مثلاً باران مقطر یا شعاع مجذب یا نگاہ مبصر یا الف ناقص رصیع۔ البتہ کانوں میں روئی اور آنکھوں پر کلوروفیل جیشمہ کی ضرورت ہے۔ خونخوار جانوروں کو اسکے قریب آنے کی جرات نہیں ہوتی۔

غوطیلہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ سمندر کی موج اس پر کچھ اثر نہیں کرتی۔ غوطہ کھایا اور پھر اوپر کو اچھل پڑا۔ اسمیں ایک گاس بھر دی گئی ہے وہ نہ صرف اسکو اچھالے رکھتی ہے بلکہ روشن رہ کر گم گشتہ جہازوں کو خطرہ سے آگاہ کرتی ہی اور اپنے قریب آنے نہیں دیتی۔



بی بی شکیلہ

یہ عجائب المخلوقات قدرت کا نمونہ ہے۔ مسٹر ایچ جی ویلیس کی کتاب "فوڈ
آف دی گاڈس" میں جس غذا کا حوالہ دیا ہے اُسیپر ... بی بی کی پرورش
ہوی ہے۔ عمر کا اندازہ صرف ٹوپی اور فراک سے ہوتا ہے۔ باقی اثر غذا لمت کا
ہے کہ جس سے مشرق اور مغرب میں تفاوت کا امتیاز ذرا مشکل ہوجاتا ہے اگر
مصور اپنے حقوق اور ناظرین کی امید کو ملحوظ رکھکر چھیتری سے کام نہ نکالتا۔
موٹر پہ ہولیٹر کی ضرورت ہے۔ ڈانڈیو ن اور رکشا والے کانوں پر ہاتھ
رکھتے ہیں۔



قصاب کی دوکان صبح وشام گھومتی پھرتی ہے میونسپلٹی کے قواعد کے بموجب چلن ڈالدی گئی ہے مگراندر قسم قسم کے پاپچے موجود ہیں مثلاً سیڈل۔ لائن۔ گگ ہمپ شولدر۔ بادامی۔ قیمہ۔ معمر۔ نوخیز۔ بوڈھا۔ حلوان۔

سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو صفحہ ۱۲

انتخاب زوج

تمدن سے اس کتاب کو خصوصیت اسلیے ہے کہ یہ اُن مضامین کا مجموعہ جو "تمدن" میں شائع ہو چکے ہیں یہ مضامین دہلی کی ایک خاتون کے قلم سے نکلے تھے جو آج کتاب کی صورت میں پیش کیے جارہے ہیں۔ اس کتاب میں بے مرضی کی شادی اور خاوند کے انتخاب میں لڑکی کا دخل نہونے کی خرابیاں دکھلائی گئی ہیں کتاب ایک ناول کے پیرایہ میں لکھی گئی ہے جسکی زبان نہایت پاکیزہ اور سلیس ہے جسمیں شوہر کے غلط انتخاب کیوجہ سے سوسائٹی کی ایک نوجوان خاتون کی زندگی کی تباہی کا فوٹو کھینچ کر دکھایا گیا ہے اور رسوم قبیح پر کاربند رہنے والے لوگوں سے پُر درد اپیل کی گئی ہے کہ وہ ایسے الم ناک نتائج سے سبق لے کر سوسائیٹی کو تباہی سے بچائیں۔ ۱۸×۲۲ تقطیع پر یہ صاف لکھائی چھپائی کی کتاب صرف ۲؍ قیمت پر ناظم دایرۃ الادب سے مِل سکتی ہے۔



سروپا انکھیلہ

یہ عجیب درخت ہے جو سرو سے مشابہ ہے زیادہ تعریف کرنی تحصیل حاصل ہے۔

سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو صفحہ ۱۴



چتر یوریشیائی المعروف بہ "بول سگ" یعنی مشروم

یہ نباتات تازہ صحرائی ہے - یعنی صحرا میں پہنچکر تازہ صورت پیدا کی ہے -
بالیدگی اچھی ہے مگر قبل از وقت اگر شادابی نہ پہنچی تو سوکھ کر رہجائیگا۔ باغبان نے نمایش کا خیال کیا
مگر ضرورت کو نہ سمجھا امید نہیں کہ انعام پائے کیونکہ ممتحن ہر چیز کو کاٹکر دیکھتے ہیں صرف صورت پر نہیں جاتے

حمزہ خیل

شعرائے عرب
اور
اُنکا سالانہ مشاعرہ

جسطرح تمام افراد انسانی باعتبار اتحاد ذات وذاتیات و بلحاظ ماہیت مشترکہ ایک کلی نوع کی تحت میں حیثیت مساوات رکھتے ہیں اوسیطرح تمام طبقات عالم کے شعرا بلحاظ فلسفہ شاعری وہی نسبت آپسمیں رکھتے ہیں جو ایک نوع کے افراد میں اتحاد نوعیت کے لحاظ سے ہونی چاہیے اور بعینہ اُسی قسم کا تفاوت باہم شعرا میں بھی ہے جسطرح کا تفاوت نوع انسان کے افراد زید عمر بکر میں باعتبار تشخصات محضہ ہے اور زنگی ورومی و عراقی وحجازی میں بلحاظ اصناف ہے مادہ شاعری میں تمام افراد شعرا اسیطرح متحد ہیں جسطرح ماہیت انسان ہے مختصر یہ کہ صرف تشخصات یا اصناف زبان میں تفاوت ہے ورنہ مادہ شاعری میں سب متحد ہیں میرا اس تمہید سے صرف اسقدر منشا ہے کہ ہر طبقہ کو دوسرے طبقہ کے جذبات شاعرانہ پر پورے طور سے روشنی ڈالنے کا حق حاصل ہے عام اس سے کہ ارباب فارس کے تخیلات شاعری ہوں یا اعراب کے سنسکرت ہو یا بھاشا۔ انگریزی ہو یا یونانی۔ لاطینی ہو یا رومی۔ اگر اُردو ادب کے پرچوں میں ان سب کے ادب شاعری پر روشنی ڈالی جائے تو بجائے قابل اعتراض ہونے کے نہایت مفید ہوگا وسعت نظر کے ساتھ ہی ساتھ وسعت تخیل کا فائدہ پہنچیگا علوم کیطرف رغبت ہوگی جن کمالات اخلاقی وعلمی و تمدنی وا[illegible] نگاری وغیرہ سے ابھی تک اُردو کی شاعری بے خبر [illegible] ہے۔ ممکن ہے کچھ توجہ ہو۔ مجکو اس تمہید کے لیے اولاً یہ دکھانا ہے کہ مادہ شاعری جو تمام افراد شعرا میں ماہیت مشترکہ کی طرح پایا جاتا ہے شعرائے عالم کے مختلف اصناف میں سے کن کن اصناف میں یہ مادہ

زیادتی و کمال کے ساتھ پایا جاتا ہے اور کن اصناف میں کمی و نقصان کے ساتھ ہو جو ہے
دنیا کی تاریخ پر گہری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جسطرح اعراب نے تمام قومشترکہ
انسانی میں مثل علم و عقل وجودت وذہانت وحافظہ وعلم الاخلاق وتمدن وصنعت وحرفت وغیرہ کے
مقابل میں اپنی افراد نوعی کے سب سے زیادہ حصہ لیا ہے اسیطرح ادہ شاعری میں بھی انکا نمبر سب سے زائد
رہا اور کیف شاعری بھی سب سے زائد بہ وہ عدم سے بزم شہود میں لیکر آئے چنانچہ فن شاعری میں
عربوں نے ایسی ترقی کی تھی کہ رسالتمآب کے زمانہ کے بہت ہی قبل بلکہ صدیوں پہلے انھوں نے ایک
سالانہ مشاعرہ قصبہ عکاظ میں جو مکہ معظمہ سے غالباً تین دن کی راہ ہے قرار دیا تھا اس مشاعرہ میں
عربستان کے کل اطراف وجوانب سے شعرا آآ کے جمع ہوتے تھے اور ہر ایک دوسری کو کمال نیک نیتی
کے ساتھ داد سخن دیتا تھا صرف زبانی داد سخن پر اس مشاعرہ کا خاتمہ نہیں ہوتا تھا بلکہ انصاف
تنقیدی نظر سے تمام شعرا کے کلام کو جانچنے کے بعد جو کلام سب سے اچھا سمجھا جاتا تھا
اور درحقیقت وہ اس مشاعرہ میں نسبتاً سب سے بہتر و عمدہ ہوتا بھی تھا وہ نہایت بیش بہا
چیزوں پر سونے کے حرفوں سے لکھکر نہایت تزک احتشام کے ساتھ خانہ کعبہ میں آیندہ نسلوں
کے واسطے لٹکا دیا جاتا تھا ہمکو دنیا میں اس قسم کی مثال طبقہ شعرا میں ڈھونڈے نہیں ملتی
ممکن ہے کہ کسی صاحب نے پائی ہو اس سے زائد مذاق شاعری میں کمال کا درجہ میری محدود
نظروں نے نہیں دیکھا ہے اور خدا معلوم اس سالانہ مشاعرہ کے علاوہ اور کتنے مشاعرے
ماہوار و ہفتہ وار منعقد ہوتے ہونگے کیونکہ اس زمانہ کا بڑھا ہوا مذاق اور عربوں کی بے چین
طبیعتیں سال بھر کی مدت مدید کے انتظار میں ہرگز ساکت و خاموش نہیں رہسکتیں۔
لیکن افسوس کہ ہم کوئی اسکا تاریخی ثبوت نہیں دیسکتے کیونکہ شعرا عرب اور دیگر حصص عربستان
کا پرانا ادب ہم لوگوں تک نہیں پہنچا ہے اور تاریخ بالکل اس زمانہ کے ادب کے متعلق
ساکت ہے ہاں اگر ہم کو ملتا ہے تو سنہ عیسوی کے مابعد اور سنہ ہجری کے ماقبل کا کلام
ملتا ہے جسکا کچھ حصہ عشق میں ہے اور کچھ حصہ جنگ کے متعلق ہے اس سے معلوم ہوتا ہے

کیونکہ دونوں اعراب کے قدیمی مذاق ہیں جو اسوقت تک اتنے ہی دلچسپی کے ساتھ اُن میں موجود ہیں ہمکو اُس کلام میں عرب کے جو اُنکے زمانۂ جاہلیت کا ہے لطف استعارات و کنایات زائد ملتا ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ اُنکے شاعرانہ جذبات کا تعلق بہ نسبت تخیلات کے محسوسات کیطرف زائد تھا بالفعل مَیں اُن سات مشاعروں میں سے کسی کے متعلق کچھ لکھنے کا ارادہ کرتا ہوں جو سبع معلقات کے ذریعہ سے ہم تک پہنچے ہیں یہ وہی مشاعرہ ہیں جو قصبہ عکاظ میں سنہ ھ کے بہت قبل زمانۂ جاہلیت میں منعقد ہوتے تھے ان مشاعروں کا بھی حال شاید ہم تک اور یہ کلام نہ پہنچتا اگر یہ اس حیثیت کے ساتھ خانۂ کعبہ پر آویزاں نہ کیے جاتے یوں تو عرب میں ہر زمانہ میں شعرا پیدا ہوتے رہے اور شاعری کا چرچا گرما گرمی سے ہوتا رہا مگر تحقیق کرنے سے معلوم ہوتا ہی کہ ان کی شاعری کو ایسا زور و عروج کبھی نہیں ہوا جیسا زمانۂ جاہلیت میں تھا عرب کا ہر خطہ و گروہ اسکے ہر طبقہ کے لوگ یہانتک کہ فلاسفر اور ریاضی داں و مدبرین تک یہانتک کہ اطبار بھی اس سے خالی نہ تھے اور کم و بیش یہ جوہر لطیف بحیثیت جزئیت پایا جاتا تھا میری رائے میں یہ شعراءِ عرب کی شاعری کے مدارج الکمال تھے کہ فقہ و فلسفہ و جبر و مقابلہ کو بھی نظم ہی کے قالب میں ڈھال کے سمجھے جاتے تھے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہو سکتا کہ تمام دنیا کے شعرا ایک طرف اور شعراء عرب کے کلام ایک طرف ہم ان مشاعروں میں جو جو شعرا شریک ہوتے تھے یا جو جو اکابرین عرب میں سے بغرض سماعت آتے تھے اُنکی تفصیلی فہرست دینے سے افسوس کہ مجبور ہیں ہم نے بہت کوشش کی لیکن تاریخ اس وادی میں آکے بالکل رُکی ہوئی ہے کیونکہ ہم یہ واقعات کم سے کم سنہ ہجری سے ایک صدی قبل کے لکھ رہے ہیں ہاں ان مشاعروں میں کامیابی کا سہرا جن جن شعرا کے سر رہا ہے اُنکا ضرور ذکر کرینگے اور انشاءاللہ انھیں کے کلام پر روشنی بھی ڈالیں گے بشرطیکہ ناظرین "تمدّن" کو اسکی طرف کچھ توجہ و دلچسپی بھی ہو۔ (باقی آئندہ)

سید علی آشفتہ لکھنوی

عالمِ تصور کے چند لمحے

او اندھیاری رات تو چاہے کتنی ہی بھیانک بن، ہاں، مان لیا تو طالع مجنوں سے ہم آغوش ہو چکی ہے لیکن میری سیہ بختی سے تیری تاریکی و ظلمت کو کیا نسبت، کہاں کوہ کہاں کاہ،

تیرے لیے آخر میں پیغامِ نو ہے جو تیری چوٹی کی محراب میں پوشیدہ طور پر لپٹا ہوا ہے مجھے اطمینان ہے کہ تیری افشاں کا سب سے بڑا ستارہ پھر چمکنے والا ہے۔

لیکن میرے لیے تیری پر کرب طولانیوں میں پیام نور کہاں۔

تجھکو اگر اپنے وحشت خیز سکوت میں شب زندہ دار کی ہولناک (ہو) پر کچھ ناز ہو تو ادھر دیکھ میری جگر سوز خاموشی اور تاب شکن خودداری (جواب نصیب دشمناں شاید کسی کے پیمان وفا کی طرح چور چور ہو جائے گی "اکوئی آہ (ہزاروں روک کے بادلوں کو ہوا کی طرح چیرتی ہوئی) مضطرب قلب سے بیزار ہو کر لب نا مانوس فریاد جب اپنی غیر محسوس اور نہ نظر آنے والی ستی بجاتی ہے اور ساتھ ہی غیر آباد ویران پہلو سے ہُوک غولِ بیابان کی طرح اُٹھکر جگر کو کباب سیخ بنا کر کام و دہن کو خشک کر کے کسی سرمست جفا پیشہ کی طرح۔ جب اُس ستی کو چھڑاتی ہے" تو لاکھوں وحشتیں ہیں جو تجھکو وام بھی میسر نہیں آسکتی ہیں میرے چہرے کی بلائیں لیتی ہیں۔

تیری تمام کائنات میری ہی زلف برہم کی طرح شانہ شعاع خورشید سے برہمی پذیر ہے تو اس سے کیا اتراتی ہے جو جلوۂ خورشید بھی شرمندہ نہ ہو جسکو تیرا سایہ او سدا من خورشید یکساں ہو شاید تجھکو اسپر ناز ہو کہ

تیرے پردہ میں اکثر دل گرفتہ سنسان جنگلوں میں بانسری کی زبان میں اپنا درد دل شناسا کر ہمنہ منزل دلوں میں آگ لگایا کرتے ہیں۔

لیکن تجکو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ سب میرے ہی ماجرا درد کے ترجمان ہیں۔ آہ درد جان سے پیارا درد جہاں کہیں بھی ہے میرا رشتہ دار ہے۔

تجھ واثر گوں پیکر کا اس میں کیا ہے۔

اب تو آئی ہے تو خیر آ تو کچھ نہ سہی تاہم میں تجکو اپنی خلوت میں جگہ دیتی ہوں۔ افسوس میری طرح تو بھی گھبرائی ہوئی ہے آ تجھ سے دو باتیں کرکے تیرا دل بہلا دوں۔ لیکن یہ یاد رکھنا کہ میری باتیں تیرا دکھڑا نہیں ہیں جنکو تو نیاز یا خلیقی و صحافی سے کہتی پھرے۔ یہ کتاب دل کی شرح ہے۔ جو صرف اسی کو سنائی جائیگی" جسکو اب تک تو میں ہی جانتی ہوں۔

(۲)

شب تاریے دودو یا میرا

میں کیا تھی

جیسے چینی کی مورت کسی خوشنما طاق پر باریاب ہوکر طرۂ آسائش ہوا کرتی ہے ایسے ہی میں بھی آغوش مادر میں چلتی پھرتی بولتی چالتی سونے کی نہایت نظر فریب مورت تھی۔

میری بلا کو خبر تھی کہ خندۂ خورشید میں کسقدر فرحتیں مخلوقات عالم کے لیے قدرت ارزانی فرماتی ہے اور لیلی شب کے تبسم سے کسقدر بجلیاں گداز دلوں پر کوندا جایا کرتی ہیں۔ ناگاہ یہ بھولی دنیا میرے بالے پن کے ساتھ ساتھ ہمیشہ کو عالم یاد میں سدھارے گی اور مجھکو ایک ایسے ہولناک میدان میں مسافرانہ غریب الوطن ہوکر آنا پڑا جس سے میں واقف نہ تھی۔

(باقی آئندہ) ظفر احسن علوی

محبت



اخلاق نتیجہ ہے وجود بشری کا — آفاق میں باعث ہے یہی ناموری کا
مغرور میں کیوں عیب نہ ہو کج نظری کا — بدلا یہ ملا ہے اُسے شوریدہ سری کا
کج خلق کو کوئی شہرۂ آفاق نہیں ہے
انساں نہیں جو صاحب اخلاق نہیں ہے

ذکر روش اہل جہاں ہو نہیں سکتا — کچھ حال زمانہ کا بیاں ہو نہیں سکتا
وہ درد ہے دلمیں کہ نہاں ہو نہیں سکتا — مجبور ہیں اب ضبط فغاں ہو نہیں سکتا
رنج اُن سے ہے جو صاحب انصاف نہیں ہیں
دعوی تو صفائی کا ہے پر صاف نہیں ہیں

افسوس بہت سرد ہے بازار محبت — کمیاب ہیں عالم میں خریدار محبت
پاتے جو نہیں داروئے آزار محبت — بے موت مرے جاتے ہیں بیمار محبت
مملو زر اخلاص ہی سے صدر نہیں ہے
وہ کیا ہیں محبت کی جنھیں قدر نہیں ہے

ہے رشک قمر چہرۂ زیبائے محبت — دل بس وہی دل ہے جو ہو شیدائے محبت
وہ آنکھ نہیں جو نہیں جویائے محبت — وہ سر نہیں جسمیں نہیں سودائے محبت
خالی ہے وہ سینہ کوئی حسرت نہیں جس میں
پہلو ہے وہ کیا درد محبت نہیں جس میں

دنیا میں ہیں جو واقف اعزاز محبت — وہ دلمیں چھپائے ہوئے ہیں راز محبت
پاتے ہیں جو کچھ ذائقۂ ناز محبت — دل سے ہیں وہ دلدادۂ انداز محبت
دنیا کے ہنر اسمیں ہیں عیبوں سے بری ہے

جو شیشۂ دل میں ہے نہاں یہ وہ پری ہے

اس جنس گرانقدر کے ماہر ہیں بہت کم　　جو حاصل الفت ہو بہ از عیش ہے وہ غم
کہتے ہیں قسم کھا کے محبت ہی کی اب ہم　　ہے اسکے طلبگاروں کا اک دوسرا عالم

مغموم کسی حال میں دیکھا نہیں اُن کو
بستی ہو کہ صحرا کوئی پروا نہیں اُن کو

ہے دوست کی الفت بھی پی دست عجب دوست　　بنجاتی ہے خلوت میں دم رنج و تعب دوست
لیکن ہیں فقط نام کے دنیا میں تو سب دوست　　پر دھر میں ملتا ہے کسی کو کوئی کب دوست

جو دوست ہیں باہم عجب اوصاف ہیں اُنکے
آئینے بھی ہیں گرد وہ دل صاف ہیں اُنکے

پی لیتے ہیں آپس میں محبت کا جو بادہ　　ہو جاتے ہیں اس نشہ سے ہشیار زیادہ
کرتے ہیں جو کچھ کہنے کا باہم وہ ارادہ　　بن جاتا ہے قصد انکا دلوں کے لیے جا

کر دیتی ہے حال اسکا بیان سب نظر اُسکی
ہو جاتی ہے اس دوست کو فوراً خبر اُسکی

لیکن وہ محبت کہ غرض جسمیں ہو شامل　　ہرگز نہ پسند اسکو کرے گا کوئی عاقل
مطلب سے جو خالی ہو وہ ہے الفت کامل　　پھر کیوں نہ محبت کو کہیں عقدۂ مشکل

ہر طرح بشر نور کا گنجینہ بنا دے
یوں دل کو کرے صاف کہ آئینہ بنا دے

دعوائے محبت ہو تو پروانہ کو دیکھے　　شاکی نہ کسی زلف کا ہو شانہ کو دیکھے
گر عشق بڑھے قیس سے دیوانہ کو دیکھے　　انصاف سے خود قلب کے پیمانہ کو دیکھے

ہو درد اگر شوق فغاں سینے میں رکھے
بلبل کی طرح سوز نہاں سینے میں رکھے

شفق مشدی لکھنوی

جان گئی

شہر لکھنؤ میں گومتی کے کنارے والی سڑک پر ایک نوجوان نہایت عمدہ انگریزی لباس زیب تن کیے کسی خاص خیال میں محو چلا جاتا ہے صورت شکل نہایت موزوں اور اسقدر موزوں کہ حسین کہلائے جانے کی مستحق۔ فاختائی رنگ کے سوٹ پر یہ مینڈکیوں والی بو کیا بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اس سڑک پر یہ نوجوان کوئی آدھی دور گیا ہوگا کہ رومال نکال کر پسینہ پونچھا اور کچھ سوچ کر لوٹا اور جس طرف سے آیا تھا اسی طرف روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم اس نوجوان کو لاٹوش روڈ پر ایک بنگلہ میں بیٹھے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہ اپنے دل سے اسطرح گفتگو کر رہا ہے۔

یہ مانا کہ اس نے انکار کر دیا کہ آپ میرے حال پر عنایت کرنی چھوڑ دیں گھر میں کیا کروں اس دل نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے۔ آخر تو کیا چاہتا ہے۔

دل۔ میں بیچارہ تو نہ تم سے کہتا نہ سنتا اگر یہ آپ کی رفیق آنکھیں آپ کے لیے یہ سامان راحت پیدا نہ کر دیتیں۔ آنکھوں نے آپ کی مس صاحبہ کو دیکھا اور اسکے بعد میری منت خوشامد کی کہ میرا کام جو کچھ تھا وہ تو ہو چکا اب جب تک حضرت دل آپ میری مدد نہ کریں گے جبتک میرا کام نہیں بنے گا۔ اگر آپ نے بری دوستی کی تو میں فاقہ مر جاؤں گی آپ ہی بتائیے کہ میں ان بیچاریوں کی کیوں نہ مدد کرتا جب یہ اپنی

لاچاری ظاہر کرکے میری مدد کی طالب ہوتی تہیں - مگر مجھے ہرگز یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ آنکھیں مار آستیں کا کام دیں گی اور ان کی یہ سازباز مجھے ہی تباہ کرنے والی ہوگی - اب گو آنکھوں کا بھی آپ پر تقاضا رہتا ہے کہ ہم تو مس صاحبہ کو دیکھیں گے مگر میرا تو ایسا سخت حکم آپ پر لگتا ہے کہ اگر آپ اسکے خلاف کریں تو آپ کی زندگی ہی لے ہوجائے - اب مقطع کا بند یہ ہے کہ گو آپ نے بہت ذلتیں سہیں یہانتک کہ صاف جواب مل گیا کہ یہاں آنا چھوڑ دو مگر ایک دفعہ اور چل کر کوشش کرو -

جناب دل - میرے تڑپانے والے دل میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ ایک دفعہ تو اور تقدیر آزمائی کرنی چاہیے - اچھا چلو اب ہمارے نوجوان پھر اُٹھے کپڑوں پر برش کیا بائیسکل اُٹھائی اور چل نکلے مس صاحبہ کے بنگلے پر پہنچے اپنا کارڈ بھجوایا اس وقت مس صاحبہ اُن حضرت کی ملاقات میں مصروف تھیں جن پر انکی نئی نظرعنایت ہوی تھی -

ہمارے نوجوان کا کارڈ دیکھکر مس صاحبہ بہت ناراض ہوئیں اور نوکر سے کہدیا کہ" ان سے بولدو کہ اب ہم کو دق مت کریں" نوکر نے آن کر ان کو یہ جواب دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ گول کمرہ میں ... صاحب سے باتیں کر رہی ہیں -

یہ دونوں پیغامات سُنتے ہی ہمارے نوجوان کی حالت متغیر ہوگئی - چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں - اور خجالت کے مارے عرق عرق ہوگئے کہ کاشکے وہ لکھکر یہ پیغام دیتیں کہ تم نہ آیا کرو تو یہ ذلت نہ ہوتی - خیر جو کچھ ہونا تھا سو ہوگیا ایسی زندگی سے موت بدرجہ بہتر ہے

اب یہ یہاں سے روانہ ہوئے اور اپنی کوٹھی پر پہنچے۔ ان کے والد صاحب کو جو یہاں ڈسٹرکٹ جج ہیں اس امر کی اطلاع ہو چکی تھی انھوں نے ان کو بلایا اور ڈانٹنا شروع کیا۔ اور اس سال بی۔ اے میں فیل ہو جانے کا ذکر کیا اور کہا کہ کاشکے ایسی اولاد ہونے سے میں لاولد ہوتا۔ ڈوب مرنے کی بات ہے کہ باپ تو بی۔ اے میں یونیورسٹی میں اوّل آئے اور بیٹا اور ایسے باپ کا بیٹا فیل ہو جائے اگر میں اسکی جگہ ہوتا تو زہر کھا لیتا اور دنیا میں منھ نہ دکھاتا۔

ہمارے نوجوان تو وہاں کے نکالے ہوئے اور زخم خوردہ تھے والد صاحب کے اس غصّہ نے مرے پر سو دُرّوں کا کام کیا۔ اُٹھ کر اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ اور چاروں طرف کے کواڑ بند کرکے پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگے اور آخر کو یہ فیصلہ کیا کہ اب دنیا میں زندہ رہنا بے کار ہے۔

مرنے کا قطعی ارادہ کرکے پہلے بہت دیر تک روتے رہے اسکے بعد مس صاحبہ کے خطوط نکال کر سب کو پڑھا اور ان کو انگیٹھی میں رکھکر جلا دیا۔ اسکے بعد میز پر آئے اور یہ لکھا۔

"کہ میں نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ اب زندہ رہنا بیکار ہے اور اس لیے میں اپنا خاتمہ کرتا ہوں"

یہ خط لکھکر اپنے والد کے کمرے میں داخل ہوئے اور انکی الماری میں سے ریوالور نکال کر اپنے دل پر رکھا اور بسم اللہ کہکر ریوالور کا گھوڑا دبا دیا۔ اس آواز کو سُنتے ہی سب لوگ کمرہ میں پہنچے۔ دیکھا تو ہمارا نوجوان تڑپ رہا ہے اور تھوڑی دیر میں ملک عدم کو سدھار گیا۔ کپڑے اُتارتے وقت اسکی جیب میں سے وہ خط نکلا۔

کیوپڈو سایک

(بسلسلہ تمدن ماہ نومبر)

(۷)

ابتدائے آفرنیش سے لے کر اس وقت تک کوہ اولمپس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے کسی آبادی کو اپنے دامن میں جگہ دی ہو، کیونکہ اُسکی بلند چوٹیاں نہ صرف اسوجہ سے کہ خداوند جیوپیٹر کی تجلی گاہ تھیں، بلکہ اسوجہ سے بھی کہ اُنکو آباد کرنا اک انسانی قوت سے باہر تھا، ہمیشہ ویران اور سنسان رہیں۔ ناقابل پیمائش غاروں کی تاریک وسعت، نہایت ہولناک سیاہ پانی کے چشموں کی اُسیس روانی، بڑے بڑے درختوں سے پیدا ہونے والا ہوا کا مہیب سناٹا، خوفناک درندوں کی گرج کی آوازِ بازگشت اور بڑے بڑے کانٹوں والی جھاڑیوں کا ایک غیر متناہی سلسلہ اور اسی طرح کی اور بہت سی ڈراؤنی چیزوں اور جسم میں لرزہ پیدا کر دینے والے مناظر کا مجموعہ۔ یہ تھا کوہ اولمپس، جہاں کیوپڈ نے سایک کے ساتھ رہنا پسند کیا اور جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کیوپڈ سب دیوتاؤں میں بہت کمسن، ناتجربہ کار اور نازک دیوتا........ تھا تو یہ حیرت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اُس نے کیوں ایسے زہرہ گداز مقام کو سایک کے قیام کے لیے منتخب کیا۔ مگر نہیں یہ انتخاب اُس نے اپنی کمسنی اور ناتجربہ کاری ہی کے لحاظ سے کیا تھا، کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ جب اُسکی ماں وینس کو خبر ہو جائے گی تو وہ کوئی دقیقہ سایک کی ہلاکت کے لیے نہ اُٹھا رکھے گی۔ پھر وہ کہاں جاتا؟

کوہ اولمپس ہی اک ایسا ٹھکانا تھا، جہاں کسی کی رسائی نہ تھی اور وہ اپنی زندگی سایک کے ساتھ امن و سکون میں بسر کر سکتا تھا۔ کیونکہ جب جیوپیٹر کو کوئی عذاب نازل

کرنا ہوتا تھا تو وہ اسی پہاڑ کی چوٹیوں پر اُتر آتا تھا اور عذاب نازل کرتا تھا، چنانچہ اس سے قبل بار ہا، اولمپس کی چوٹیوں سے جیوپٹر کا غصہ آگ بنکر نکلا اور دور دور کی آبادیوں کو بھی تباہ کر دیا، پھر ایسی جگہ جو آسمان کے دیوتاؤں میں سب سے بڑے دیوتا کے قہر کرنے کی جگہ ہو کون جا سکتا تھا، یا کس کو ہمت ہو سکتی تھی کہ وہاں جانے کا خیال دلمیں لائے مگر کیوپڈ چونکہ جیوپٹر کا محبوب ترین فرزند تھا اور اپنی خدمات کے لحاظ سے نہایت اہم دیوتا تھا اسلیے وہ وہاں پہنچ سکا اور اپنے ساتھ رہنے والی مخصوص دیویوں مارفیس و زفر کو بھی اپنے ساتھ لا سکا۔

اس نذرین قصر کا ذکر پہلے ہو چکا ہے جو اُس نے سائیک کو مسرور کرنے کے لیے تیار کیا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ کیوپڈ سے مواصلت کی مسرت، ایک ایسی مسرت سائیک کے لیے تھی کہ ایک ہفتہ تک تو اُسے یہ ہوش بھی نہیں ہوا کہ وہ ہے کہاں اور نہ اسکا وہ کبھی خیال کر سکتی تھی، کیونکہ اب تو اُسکے دل میں صرف ایک آرزو تھی کہ وہ کسی وقت کیوپڈ سے جدا نہو، مگر پورے ایک ہفتہ تک تو اُس برج طلائی کی خلوت میں بند رہنے کے بعد وہ وقت آیا کہ سائیک کو اپنی نئی زندگی پر کچھ غور کرنا پڑا اور اب اُسے یہ دلشکن حقیقت معلوم ہوی کہ اب کیوپڈ اس سے زیادہ مسلسل وقت اُسے نہیں دے سکتا، کیونکہ انھیں آٹھ دس دن میں کیوپڈ کے معطل بیٹھ رہنے سے کرۂ ارض میں بے رحمی، کج خلقی، اور ورندگی بہت پھیل گئی تھی اور اس لیے ضرورت تھی کہ وہ اپنے تیر و کمان سنبھال کر نہایت سرگرمی کے ساتھ چند دن کام کرے اور جتنی کمی محبت کی دنیا میں ہو گئی ہے اُسے پورا کر دے۔

نہ سائیک کو اسوقت تک اس بات کا علم تھا کہ اُسکا شوہر یا عاشق کیوپڈ ہے اور نہ کیوپڈ ہی اس حقیقت کا اظہار اسپر کر سکتا تھا اس لیے اُس کے سائیک کو یہ تو بتایا ہی نہیں کہ اُسکے فرائض کیا ہیں اور کیونکہ یہ معلوم کرنے کے بعد کون جوان لڑکی ایسی تھی جو نہ پہچان لیتی) مگر ہاں اُس نے اپنی روانگی کو نہایت اہم وجوہ کی بنا پر ضروری قرار دے کر سائیک سے اجازت طلب کی اور کہا کہ اس مختصر غیر حاضری سے اُسکی محبت میں کوئی فرق نہیں آ سکتا سائیک نے

آخر کار بادل ناخواستہ اُسکو اجازت دی، لیکن سوال یہ تھا کہ جبتک وہ آئے گا ساایک کیونکر اپنا وقت بسر کرے گی، کن مشاغل میں اپنے تئیں الجھائے رکھے گی؟۔ اسکا حل بیشک ذرا دشوار تھا، لیکن آخر کار ساایک نے کچھ غور کرنے کے بعد کیوپڈ سے کہا کہ وہ حوالی قصر میں اُن تمام سامان تفریح کو مہیا کردے، جنکی وہ اپنے زمانۂ دوشیزگی میں عادی تھی۔ کیوپڈ نے فوراً فرش سے دو گلدستے لے کر زمین پر دے مارے جو زمین میں غائب ہوگئے اور بجائے اُن کے دو حسین فرشتے جن کے پروں میں الماس ٹکے ہوئے تھے اور جن کی عمر میں چودہ سال سے زائد نہ تھیں نکلکر ساایک کے سامنے کھڑے ہوگئے، کیوپڈ نے اُنسے کہا کہ "جاؤ اور قبل اسکے کہ ملکۂ ساایک اُٹھکر دروازہ تک پہنچے، تمام حوالی قصر کو ان مناظر سے آباد کردو جو والی یونان کے محل سے متعلق ہیں" اُن کو رخصت کرکے کیوپڈ نے جتنے گلدستے وہاں رکھے تھے سبکو فرش زمین پر ٹپکنا شروع کیا یہاں تک کہ چشم زدن میں سارا قصر نہایت حسین پریوں سے بھر گیا اور ساایک ان پرداربیش خدمتوں سے گھر گئی۔ اُنکے ہاتھوں میں مختلف قسم کے ساز تھے جن کے تاروں سے ارتعاش کے وقت عجیب مشکر خوشبو پیدا ہوتی تھی، ساایک اس مختصر زمانہ میں اس نوع کے عجائب و غرائب سے اس درجہ آشنا ہوگئی تھی کہ اُسے زیادہ حیرت نہیں ہوی اور وہ کیوپڈ کے شانے پر ہاتھ رکھکر پریوں کے حلقے میں قصر سے باہر نکلی، لیکن اُسکی نگاہ دروازہ سے باہر نکلکر پھیلی ہی تھی کہ وہ ششدر رہ گئی، کیونکہ اُسکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ چند لمحات میں، شاہ یونان کا باغ مع اپنی روشوں، کنجوں، درختوں حوضوں، فواروں، اور نہروں کے کیونکر یہاں منتقل ہوسکا، وہ اس باغ اور اُس باغ میں سوائے اسکے اور کچھ فرق نہ پاتی تھی کہ وہاں بلور کے ٹکڑے روشوں پر پھیلے ہوئے تھے اور یہاں ذرہ ہائے الماس، وہاں حوض سنگ مرمر

اور بلور کے تھے اور یہاں شفاف طلا و صیقل کی ہوئی چاندی کے، وہاں حوض کی مچھلیاں صرف رنگین تھیں اور یہاں رنگین بھی تھیں اور درخشاں بھی۔ ساٸیک خوش خوش اس باغ میں داخل ہوئی اور ٹہلتے ٹہلتے ہر چیز کو دیکھتی ہوئی پھولوں کو سونگھتی کیوپڈ کو لے کر ایک کنج کے اندر چلی گئی، اور ساری پریاں باہر مودب کھڑی رہیں، شام ہو گئی تھی اور چاند نکل آیا تھا اس لیے پھر ساٸیک وہاں سے نہیں نکلی اور وہ رات قصداً اُسنے کیوپڈ کے ساتھ اُس کنج میں بسر کرنا چاہی کیونکہ جب وہ یونان میں تھی تو یہی کنج تھا جہاں اُس نے پوری ایک طویل رات نہایت حسرت و ناکامی کی حالت میں کاٹی تھی اور اسلیے آج وہ اس چاندنی کو جلانا چاہتی تھی جس نے ساٸیک کو اسدن بہت تڑپایا تھا۔

صبح ہوئی اور کیوپڈ کے رخصت ہونے کا وقت آیا۔ ہر چند ساٸیک کو یہ جدائی نہایت شاق تھی، لیکن اس نے کہا "کہ اچھا جاؤ میں بھی جب تک تم نہ آؤگے پھولوں کے ہار تمھارے لیے گوندھا کروں گی اور پھر انھیں یہ کہکر توڑ ڈالا کروں گی کہ اچھے نہیں گندھے، یہانتک کہ تم آجاؤگے اور میں صرف ایک ناتمام ہار تمھارے محبت بھرے سینہ کے لیے پیش کرسکوں گی"

کیوپڈ نے جلدی سے ساٸیک کو آغوش میں کھینچکر

فضا میں تحلیل ہو کر غائب ہو گیا۔

(۸)

کچھ زمانہ اسی انداز سے گذر گیا کہ کیوپڈ دو چار دن کے لیے باہر چلا جاتا تھا اور پھر اک نیا شوق، نیا جوش لے کر واپس آتا اور ساٸیک کے پاس آکر رہتا ہر چند ساٸیک بھی اُسکی عادی بننا چاہتی تھی اور کیوپڈ کی غیبت میں وہ انتظار کی گھڑیاں کو مختلف مشاغل تفریح میں کاٹتی تھی، لیکن، وہ کیوپڈ کی اس گھڑی

گھڑی کی مفارقت سے بسا اوقات بہت دلگرفتہ اور مضمحل ہو جاتی، کیونکہ وہ چاہتی تھی کہ کوئی اُسی کا ہمجنس مل جائے اور وہ اُس سے اپنی موجودہ کامرانی کی داد دے وہ ان پریوں سے اشارہ سے کام لیا کرتی تھی، کیونکہ کام کرنے والی یہ ہاں بات نہیں کرسکتیں اور شاید کیوپڈ نے قصداً ایسی پیش خدمتیں مہیا نہیں کیں جن سے سائیک گفتگو کرسکتی۔ غرضکہ جب کیوپڈ چلا جاتا تو وہ سخت متوحش ہو جاتی اور باوصف اسکے کہ کنیزوں کی ایک کثیر تعداد اُسکے جلو میں ہوتی، لیکن وہ ان بیجان (یعنی بے زبان متحرک تصویروں سے گھبرا کر یہی سمجھتی کہ "میں تو اب بھی ویسی ہی تنہا ہوں" جسوقت تک عورت اپنی محبت میں کامیاب نہیں ہوتی، اُسوقت تک اُسکی زندگی اِک کلی کی سی خلوت آرمیدہ زندگی ہے نہ وہ کہیں جانا پسند کرتی ہے اور نہ کسی سے بات کرنا، لیکن جب وہ اپنی محبت میں کامیاب ہو جائے، جب اُسکی حیات معاشقہ اک عملی صورت اختیار کرلے، تو وہ تنہا ہونے پر بھی بجائے خود اک انجمن ہے اور خلوت سے بیزار جب تک اُسکی محبت کا کوئی جواب دینے والا نہیں ہوتا وہ یہی آرزو کیا کرتی ہے کہ کوئی اُسے یہ بتائے کہ اُسکے حسن و شباب میں کچھ لذتیں ہیں بھی یا نہیں، لیکن جب کوئی شخص اُسے مل جاتا ہے اور اُسکی جوانی کی لذتوں کو اپنے اعترافات فعلی سے اُسکے لیے قابل الفہم بنا دیتا ہے تو پھر عورت اپنے مسرت کے بار کو برداشت نہیں کرسکتی اور اپنے ہی جنس و عمر کا کوئی فرد اپنے پاس بیا ہتی ہے، جس سے وہ اپنی لذتوں کو بیان کرے، یعنی جسطرح وہ اپنی ناکام زندگی میں دوسروں پر رشک کیا کرتی تھی اُس طرح اب اپنی مسرور شاد کام حالت میں یہ چاہتی ہے کہ کوئی دوسرا بھی اُس پر رشک کرے۔ اسلیے سائیک بعض وقت گھبرا اُٹھتی تھی اور چاہتی تھی کہ کوئی اور نہیں تو کم از کم اُسکی بہنیں ہی اگلاروس وکیوپڈس آکے دیکھیں اور اُسکی خوش قسمتی پر رشک کریں۔

ایک دن، جبکہ کیوپڈ خلافِ معمول کئی دن کی دیر لگا کر آیا، تو سائیک مچل گئی کہ میں تو اپنی بہنوں کو دیکھوں گی اور اگر میں وہاں نہیں جا سکتی تو انھیں کو یہاں بلواؤں گی۔ وہ میرے لیے مضمحل و پریشان ہوں گی کہ خدا معلوم کس عفریت نے میرا لقمہ کیا اسلیے میں چاہتی ہوں کہ وہ یہاں آ کے مجھے دیکھیں اور خوش ہوں اُس نے یہ بھی کیوپڈ سے کہا کہ اب وہ تنہائی سے بہت گھبرانے لگی ہے۔ یا تو وہ کہیں جایا نکرے کہ اس صورت میں پھر اُسکو کسی چیز کی ضرورت نہیں اور اگر اُسکا جانا نہیں رک سکتا تو پھر کیوپڈ میں اور اگلارس ہی کو بلوا دے کہ چند دن انھیں کے ساتھ کٹیں۔

کیوپڈ خاموشی سے سائیک کی اس ضد کو دیکھتا اور سُنتا رہا اور جب وہ کہہ چکی تو اُسنے نہایت سنجیدگی سے یہ متفکر جواب دیا کہ "اے سائیک میرے لیے اس سے زیادہ مسرت کسی بات میں نہیں کہ تیرے احکام کی تعمیل میں اپنی ساری قوتوں کو صرف کر دوں، لیکن میں ڈرتا ہوں کہ کہیں کیوپڈس و اگلارس کا آنا میری مسرت کو خاک میں نہ ملا دے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ اُنکے آنے سے تمہاری بعض ضدیں پھر از سرِ نو زندہ ہو جائیں اور وہی خدشات پیش نظر ہو جائیں جنکے خیال سے میں کانپنے لگتا ہوں، شاید وہ یہاں آ کر تیرے دل میں کوئی جستجو پیدا کر دیں اور یہی ایک چیز ایسی ہے جو میں تیرے دل میں دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ اے سائیک رحم کر اور مجھے اُنکے بلانے پر مجبور نہ کر" مگر سائیک جسے اپنی محبتوں پر پورا اعتماد تھا اور جو اسوقت یہ نہ سمجھ سکی کہ وہ آ کر کیا ایسی نئی بات پیدا کر سکیں گی جو کیوپڈ کے خلاف ہو، اپنی ضد پر قائم رہی۔ کیوپڈ نے مجبوراً مارفیس اور زفر کو پھر بلایا اور اگلارس اور کیوپڈس کے لانے کا حکم دیا، لیکن اسی کے ساتھ یہ تاکید بھی کر دی کہ ان پر یہ کسی طرح نہ ظاہر ہونے پائے کہ کس کے ارشاد یا حکم سے وہ طلب کیجاتی ہیں شام کا وقت تھا، آفتاب کا ارغوانی سایہ کوہ اولمپس کی چوٹیوں کو رنگیں بنائے ہوئے تھا۔ سائیک اپنی بہنوں کے

انتظار میں فرش گل پر بیٹھی ہوئی کیوپڈ کے سامنے ساز پر گا رہی تھی کہ :-
میں اُن راتوں پر رشک نہیں کرتی جنہیں تو میرے پاس ہوتا ہے، کیونکہ جب تک تو میرے پہلو میں ہے صرف میرا ہے - لیکن ہاں جلتی ہوں میں ان راتوں سے جنہیں تو مجھ سے بچھڑ جاتا ہے کیونکہ پھر تیری معیت انھیں کے ساتھ ہے جب تو کہیں چلا جاسکتا یہ سمجھ کہ میں تجھ سے جدا ہوں کیونکہ میں تو صرف تجھے چاہنے کی اک آرزو ہوں، اور وہ آرزو تیرے ساتھ ساتھ ہے جہاں بھی تو ہو - پھر اگر تو مجھ سے جدا ہوکے تو میرا خیال رکھتا ہے تو تو غلطی کرتا ہے، کیونکہ میں تو تیرے ساتھ ساتھ ہوں خیال کیسا؟ تو اپنے فرائض کے انہماک میں ایک دفعہ ناگہاں چونک کر کچھ سکوت کرتا ہے سوچنے لگتا ہے، وہ سکوت و فکر میں ہی تو ہوں جو تیری نگاہوں کو تیرے کام سے ہٹا لیتے ہیں۔ تو رات کو کسی دور دراز ملک میں سوتے سوتے چونک پڑتا ہے اور گھنٹوں جاگ کر وٹیں لیا کرتا ہے یاد رکھ کہ وہ بیداری اور کروٹ خود سا ایک ہے جو تیری آنکھوں میں سما جاتی ہے اور تیرے پہلو میں لپٹ جاتی ہے - لوگ کہتے ہیں کہ محبت بُری ہے مگر میں دیکھتی ہوں کہ میرے زخمی کرنے کے لیے شاید کوئی خاص تیر تھا جو کیوپڈ نے چلایا ـــــــــــ"

کیوپڈ کے بدن میں اس فقرے سے اک جنبش ہوئی اور اپنا اضطراب دور کرنے کے لیے قطع نغمہ کرکے بولا کہ "اے سا ایک کیوپڈ نے کیا چلایا یہ کہو کہ میں نے چلایا" سا ایک بولی "ہاں سچ ہے تمھیں نے چلایا - تو کیا تم کیوپڈ ہو؟ نہیں تم کیوپڈ نہیں ہوسکتے، کیونکہ میں نے سُنا ہے وہ خود کسی سے محبت نہیں کرسکتا، اُسکے دل میں ذرا رحم نہیں ہے اُسکا سینہ گداز عشق سے خالی ہے وہ سفاک ہے اور تم تو مجھسے محبت کرتے ہو، مجھے چاہتے ہو" کیوپڈ - "ہاں میں کیوپڈ نہیں ہوسکتا اسوجہ سے کہ میں واقعی کیوپڈ نہیں ہوں مگر یہ خیال کہ کیوپڈ کو کسی کے ساتھ محبت نہیں ہوسکتی شاید

درست نہ ہو، کیونکہ بہت سی روایتیں یوں ہی غلط مشہور ہو جاتی ہیں اور تمھیں کیا علم کہ اسوقت وہ کس حالت میں ہے"

یہاں یہ گفتگو جاری تھی کہ مارفنیس اور زفرؔ، سایک کی بہنوں کو اپنے نازک ہاتھوں پر لیے ہوئے آگئیں اور انھیں جگا کر غائب ہوگئیں۔ ستایک اپنی بہنوں کو قصر میں لے گئی اور اک اک چیز وہاں کی دکھائی اور پھر وہاں سے باغ میں لائی اور اک تفاخر کے ساتھ ہر ہر کنج کی سیر کرائی، دل میں تو وہ بہت کڑھیں کہ ستایک ابھی نہ صرف زندہ ہے بلکہ ایسی شاہانہ زندگی بسر کر رہی ہے کہ کبھی اُنکے خواب و خیال میں بھی .. .. .. نہ آسکتی تھی، لیکن ظاہر میں انھوں نے ستایک کو مبارکباد دی اور پوچھا کہ یہ زر و جواہر، یہ سامانِ نشاط کہاں سے آیا"؟

ستایک نے جواب دیا کہ "مجھے نہیں معلوم کہاں سے آیا اور کون ہے جس نے مہیا کیا؟"

انھوں نے نہایت حیرت سے کہا "تو کیا اسوقت تک تیرے شوہر نے اپنا نام بھی تجھے نہیں بتایا؟"

"آہ، میں اس کا نام نہیں جان سکتی، کیونکہ اُسکی سخت ممانعت ہے"

وہ بولیں "مگر اے بہن تو نے اس کا چہرہ تو ضرور دیکھا ہوگا۔ کیا بہت خوبصورت ہے"

"نہیں میں نے اُسکا چہرہ تو نہیں دیکھا کیونکہ وہ ہمیشہ نقاب ڈالے رہتا ہے، مگر ہاں جب میں سو جاتی ہوں تو خواب میں اُسکا چہرہ محبت سے روشن و منور پاتی ہوں"

کیوپڈس بولی "اے لڑکی تجھے فریب دیا گیا، کیونکہ یہ وہی بدشکل عفریت ہے جو جو کسی دن تجھے کھائے گا"

ستایک نے کہا کہ "نہیں وہ عفریت تو نہیں ہو سکتا، مجھے اسکا یقین ہے" مگر دونوں

بہنوں نے پھر بھی کہا اور اسقدر اصرار کے ساتھ اُس کے عفریت ہونے کا یقین دلایا کہ سایک بھی کچھ متفکر سی ہو گئی۔ اِس فکر سے اُنھوں نے اور فائدہ اُٹھایا اور اسے مجبور کیا کہ ابھی جائے اور نقاب اُلٹ کر اُسکا چہرہ دیکھے۔

رات ہو گئی تھی اور کیوپڈ اپنی خواب گاہ میں بیہوش پڑا سو رہا تھا۔ سایک آہستہ آہستہ گئی اور اُسکے چہرہ سے نقاب الٹ دیا، مگر بجائے اسکے کہ وہ ایک عفریت کی ڈراونی صورت دیکھتی اُس نے نہایت ہی حسین وجمیل شکل کیوپڈ کی دیکھی اور اسی اک لمحہ میں سایک کی محبت نے خدا جانے کتنے مدارج اور طے کر لیے۔ کیوپڈ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اور برہم ہو کر بولا کہ:۔

اُلے بیوقوف سایک یہ تو نے کیا کیا۔ کیا تو یہ نہ جانتی تھی کہ مَیں ایک دیوتا ہوں، اور کیا تجھے یہ علم نہ تھا کہ کوئی شخص میرے چہرہ کو دیکھکر زندہ نہیں رہ سکتا، یہ کہہ کر اُس نے باہر نکل جانا چاہا، لیکن بدقسمت سایک نے اپنی مسترحم نگاہوں سے کیوپڈ کو دیکھکر اپنے ہاتھ بڑھاے کہ وہ لوٹ آئے اور اُسکی خطا معاف کر دے ہرچند کیوپڈ سایک کی اس ادا سے بے انتہا متاثر ہوا اور بے اختیار اُسکا جی چاہا کہ اُس سے لپٹ جاے، لیکن وہ رک گیا۔ کیونکہ اب ایسا کرنے سے اُسکی غیر فانی روح چھین لی جاتی۔ اس لیے کیوپڈ فوراً ایک بادل اپنے اور سایک کے درمیان حائل کر کے غائب ہو گیا اور سایک بیہوش ہو کر گر پڑی۔

کیا خبر وہ کتنے عرصہ تک بیہوش رہی، لیکن ہاں، جب اُسکی آنکھ کُھلی، تو نہ وہ قصر تھا اور نہ وہ اُسکی مکلف خوابگاہ۔ نہ وہاں باغ اور نہ کوئی کنیز وہی سنسان اور وحشتناک کوہ الوند کی چوٹی تھی جہاں وہ قربانی کے لیے لائی گئی تھی اور وہی شاہ بلوط سامنے تھا جسکے تنے سے وہ باندھ دی گئی تھی۔ پہلے تو وہ یہ سمجھی کہ مَیں کوئی وحشتناک خواب دیکھ رہی ہوں لیکن نہیں تھوڑی دیر بعد اُسے

یہ یقین کرنا پڑا کہ خواب یہ نہیں ہے مگر خواب تو وہی تھا جس میں اس نے ایسی پُرلطف زندگی بسر کی تھی - مگر ایسا طویل خواب کبھی خواب نہیں ہو سکتا - مگر پھر کیا تھا؟ آہ، وہ اس حقیقت پر غور کرنے کے لیے تیار نہ تھی - وہ بالکل مبہوت تھی دیوانہ پن اُسکے چہرہ سے نمایاں ہونے لگا تھا اور وہ فوراً مرجانا چاہتی تھی۔

(۹)

سایک دیوانہ وار پہاڑ پر پھر رہی تھی، پاؤں کانٹوں سے مجروح تھے سارا بدن چوٹوں سے داغدار، کراہتی تھی اور روتی تھی - چیختی تھی اور گر پڑتی تھی، کہ ہائے اب وہ صورت کہاں ملے، ہر شخص اُسکی تباہ اور برباد حالت پر جی دکھا سکتا ہے لیکن وینس کی برہمی کا وہی عالم تھا - اُسنے آدمیوں کو حکم دیا کہ سایک کو پکڑ کے سامنے لائیں اور خود یہ حکم دے کر جیوپیٹر کے پاس گئی - جیوپیٹر اُسکا شوہر اولین تھا اور یہ کسی زمانہ میں اُسکی محبوب ترین بیوی رہ چکی تھی اس لیے اس نے کچھ ایسی تدابیر حُسن افزا وینس کو بتادیں جس سے وہ سایک کے سامنے حجاب نہ کر سکے اس نے ان تدابیر پر عمل کیا اور اپنے پندار میں ایسی حسین بنکر بیٹھ گئی کہ اب اُسے سایک کے حُسن کیطرف سے ذرا کھٹکا نہ رہا بارہ لی سایک لائی گئی، مگر وینس یہ دیکھکر کہ اس خستگی و پریشانی کے عالم میں بھی سایک کے حُسن کا وہ عالم ہے کہ اب بھی وہ اُسکا مقابلہ نہیں کر سکتی عرق عرق ہوگئی اور دل میں یہ ٹھان کر اُٹھ کھڑی ہوئی کہ اُسکو مار ڈالنا ہی بہتر ہے - لیکن رات کو جیوپیٹر نے وینس کے خواب میں آکر اُسکا یہ خیال بدلدیا اور سایک کی جان بخشی کی شرط یہ قرار دی گئی کہ وہ دیوی پرآسرپائن کا طلسمی صندوق لے آئے جس میں طلائے حسن بند ہے -

سایک اپنی قسمت کا فیصلہ سُنکر کانپ اُٹھی، کیونکہ اُسکی نسبت مشہور تھا کہ وہ کوہ ہیڈس کے سب سے گہرے غار میں محفوظ ہے اور کسی کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکتی

لیکن ایک آواز اسکے کانوں میں آئی جسے سوا اسکے اور کسی نے نہیں سُنا کہ گھبرا نہیں تیرا محافظ تیرے ساتھ ہے" یہ محبت بھری آواز اُسے کچھ آشنا سی معلوم ہوئی اور وہ اس شرط کے پورا کرنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوگئی۔ نہ اس نے دشوار گذار پہاڑی راستوں کی پرواہ کی اور نہ درندوں کی، نہ اُس نے کانٹوں کا خیال کیا اور نہ مہیب غاروں کا، کیونکہ وہاں ایک روشنی تھی، اک محبت پاش جھلک تھی جو اُسکی رہنما تھی اور ان مصائب میں اُسے تسکین دیتی جاتی تھی۔ راستے میں درندے اُسے ملے مگر وہ اُسکے حسن سے مسحور ہو گئے، متلاطم دریا اُس کی راہ میں آئے، لیکن وہ بھی خشک ہو گئے غرضکہ وہ کسی نہ کسی طرح پراسرپاین کے دربار تک پہنچی اور اُسنے رحم کھا کر وہ صندوق سایک کے حوالہ کردیا۔

سایک خوش خوش واپس آئی اور وہ صندوق وینس کے سامنے لاکر ڈالدیا مگر وینس سایک کے اس عزم واستقلال سے اور زیادہ جل گئی اور بدعہدی کے لیے تیار ہوگئی۔ مگر جیوپیٹر اسپر راضی نہوا اور وینس کو حکم دیا کہ سایک کو چھوڑ دے کیونکہ جب وینس کے پاس طلسمی صندوق آگیا ہے تو اسکو کسی کے حسن سے جلنے کی ضرورت نہیں ہے آخر کار وہ بھی اسپر راضی ہوگئی اور سایک کو جیوپیٹر نے خاص اپنی شراب الوہیت منگا کر پلادی جسکے اثر سے وہ بھی غیر فانی ہوکر آسمانی مخلوق میں شمار ہونے لگی۔

(۱۰)

کیوپڈ و سایک پھر اُسی کوہ اولمپس پر چلے گئے اور سایک کی پھر وہ زندگی شروع ہوگئی جس زندگی کا خواب وہ ایکدفعہ دیکھ چکی تھی اسکے بعد کیوپڈ نے کبھی اپنے چہرہ پر نقاب نہیں ڈالا، مگر ہاں اُسوقت جب اُسکو انسانوں کی نگاہ سے چھپکر تیر عشق چلانا مقصود ہوتا تھا ~~~~~~~~~~

نیاز فتحپوری

سیرِ چمن

۲۷ اپریل ۱۹۱۰ء کی رات تھی گرمی کا موسم تھا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ بیٹھے بیٹھے دل میں آیا آؤ آج تو کنگ ایڈورڈ پارک (دہلی) کی سیر کریں بس پھر کیا تھا حضرت دل کے نادر شاہی حکم کا اقلیم ہستی میں اعلان ہو گیا۔ فوراً حواس خمسہ کی تار برقی پاؤں کی سفر مینا کو پہنچا دی گئی کہ ہاں بڑھے چلو۔ سینے کے ہوادار پر جلالت مآب سلطان الاعضا دل خلد اللہ ملکہ وحشمتہ سوار تھے جلو میں شوق ہمرکاب تھا قطع سفر کچھ منٹوں میں ہو گیا۔ یہ باغیچہ جامع مسجد کے سامنے واقع ہے اول تو یہاں کی فزا پہلے ہی سے قابل دید تھی اب اس باغیچے نے سونے پر سہاگے کا کام دیدیا ہے اس باغ کے چاروں طرف لوہے کے جنگلے لگے ہوئے ہیں ان سے ملے ہوئے پھولوں کے درخت چلے گئے ہیں پودے چشم بد دور جو برس ڈیڑھ برس کے لگے ہوئے ہیں وہ جوان رعنا کے ہم قد نظر آتے ہیں کیاریاں گو عہد طفولیت میں ہیں مگر قرینہ بتا رہا ہے کہ شباب آنے دو قیامت کے فتنے دیکھ لینا ہمارے ہی رنگ میں پوشیدہ ہو نگے دلفریبی عشوہ گری میں ہم اپنی نظیر آپ ہوں گے۔ غرض زمردی فرش پہ زندہ دلاں دہلی جلوہ آرا نظر آتے ہیں پیچھے قہقہے کی صداؤں نے عالم بالا کے رہنے والوں کو ہوشیار کر دیا۔ خوش گلو حضرات نے علم موسیقی کے دلکش ترانوں سے بزم تیموری کے آخری تاجدار بہادر شاہ کے شب[illegible] عیش کا سماں پیش نظر کر دیا۔ جب حضرت دل کی سواری باغ میں داخل ہوئی ہے تو درخت تعظیم کے لیے استادہ ہو گئے۔ شاخیں جھک جھک کر آداب بجا لائیں۔ یہ سب کا سلام لیتے ہوئے آگے بڑھے

نرگس ہمراہ کھڑی تھی فوراً آنکھ ماری دل اپنا دل پکڑ کر بیٹھ گیا کسی کا تیر نگاہ پہلے ہی مجروح کرچکا تھا۔ اوس نقشے نے زخم پر پھر خط کشی کردی ہمنشینوں نے بمشکل سنبھالا گلاب کے تختے کے پاس لیجا کر لٹا دیا۔ رفتہ رفتہ ہوش میں آئے طبیعت ٹھکانے پر آنی شروع ہوئی تھی کہ قریب سے کسی غنچے کے چٹکنے کی آواز آئی یہاں خیال ہوا

کوئی بم پھینکا گیا

فوراً مصاحبوں نے حلقے میں لے لیا۔ یہ دیکھکر غنچہ مسکرایا۔ دل کو بہت ہی تاؤ آیا نہایت خفیف ہوے غنچے نے کہا آؤ میری بہار دیکھو۔ انھوں نے یاس کے انداز میں فرمایا تم میری حسرتوں کا مزار دیکھو۔ غنچے نے کہا پھر میرے اجزا پریشان ہوجائیں گے۔ جواب دیا گیا۔ تیرے پریشان ہونے سے میرے اوسان ہوجائینگے یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ موتیا نے آگے بڑھکر کہا بندہ پرور آداب عرض ہے۔ نظر اُٹھا کر دیکھا تو مست ہوگئے۔ موتیا کا کٹورا تھا کہ مئے ارغوانی کا جام۔ فرمایا آؤ۔ موتیا نے کہا۔ دست شوق دراز کیجیے توڑیے اور دامن میں رکھ لیجیے۔ یہ بار بار اُسکی خوشبو سونگھتے اور حظ اُٹھاتے رہے یک بیک کچھ خیال آیا آبدیدہ ہوگئے فرمانے لگے۔ آہ تو مجھ سے لاکھ درجے بہتر ہے کہ ٹوٹنے کے بعد بھی کوئی سر پر جگہ دیتا ہے کوئی زیب گلو کرتا ہے لیکن میرے مرنے کے بعد سونگھنا تو درکنار ہزاروں من مٹی کا انبار ڈالدیتے ہیں تاکہ پھر کبھی صورت نہ دکھائی دے یہ سُن کر

پھول نے قہقہہ مارا

اور کہا آپ عاقل ہوکر نادان بنے جاتے ہیں مرنے کے بعد میں اور آپ دونوں یکساں ہیں۔ غور فرمایئے میں شب کو کسی بت طناز کے گلے کا ہار ہوجاتا ہوں اور صبح ہی نوچ کھسوٹ کر پھینک دیا جاتا ہوں۔ میری زندگی میرا شباب ہے اور شباب کے

ساتھ ہی میری قدر ہے جہاں باسی ہوا اور نظروں سے گرا۔ لیکن آپ ایک ایسی مخلوق ہیں کہ بعد جوانی بھی قدر کے قابل ہیں لوگ آپ سے پیچیدہ معاملات کو سلجھاتے ہیں آپ کی رائے کی عزت کرتے ہیں ہر محفل میں تجربہ کار آدمی کو بڑا سمجھ کر صدر بنا دیا کرتے ہیں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میری زندگی یک شبی ہے اور آپ کی ہزار شبی بلکہ اُس سے بھی زائد۔ تاہم میری ہستی کا ہر ورق معرفت الٰہی کا دفتر ہے نصیحت و عبرت کی مجلد کتاب ہے اگر آپ کی آنکھیں روشن ہیں تو آپ دیکھ سکتے ہیں لیجیے یہ پہلے ورق کی چند سطریں تو پڑھیے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۔ یہ دوسرا صفحہ ملاحظہ ہو۔ یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ اسکے علاوہ سب سے آخری صفحہ یہ ہے ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۔ لیکن مجھے آپ کی حالت پر افسوس آتا ہے کہ اشرف المخلوقات ہو کر تمہاری آنکھیں مظاہر کے دیکھنے کی عادی نہیں اگر دیکھ بھی لیتے ہو تو حظ نفس کے لیے آپکو زیبا تھا کہ بلحاظ اپنے مرتبہ کے سب سے زیادہ خدا کی معرفت کے ساتھ قربت حاصل کرتے۔ اب مجھے چھوڑ دیجیے کمہلانے لگا ہوں میری زبان آپ کی اُنگلیوں میں مقید ہے ورنہ کچھ اور بھی کہنا یہ سُنکر دل نے ایک چیخ ماری ہاتھ پیروں میں رعشہ آگیا کپکپایا لڑکھڑایا آخر دیکھنے والوں نے دیکھ لیا کہ پھول کے ساتھ دل بھی خاک پر پڑا ہوا تھا۔

مقرب حسین مقرب دہلوی

اُردو کا طوطی

اے میری پیاری زبان - تیری اداؤں کے قرباں - تیری شیرینی و لطافت کے صدقے - تیری خوبیاں مجھ جیسے دلدادہ سے پوچھے - ہاں پوچھے مگر میں اُسکے اظہار سے عاجز - اُس کے بیان سے قاصر - قوت گویائی گو تجھپر ناز کرتی ہے مگر تیرے اوصاف کے اظہار میں سربگریباں - زبان کو یارا نہیں - اسکی اوقات کیا اُس کی بساط ہی کیا جو دم مارے - اچھا میں دم بخود ہوں - دل خوب جانتا ہے - اُسکا جاننا کافی اُسکی گواہی قابل وثوق - تیرا لطف حُسن ادراک ہی پر منحصر ہے -

مگر کچھ تو کہوں - ہائے دل کا تقاضا بھی بُرا ہوتا ہے - تو تیری سوانحعمری بیان کروں - تیرے عالم وجود میں آنے کی کیفیت لکھ ڈالوں - نہیں نہیں - یہ سب جانتے ہیں - اسکا بتانا - اس کا لکھنا کیا - سیکڑوں نے لکھا - ہزاروں نے پڑھا - عالم جانتا ہے - تو تیری خوبیوں کو احاطہ تحریر میں لاؤں ہاں کچھ کرنا چاہئے - کچھ تو ہو -

تو ایک ہزار داستان ہے - شیریں مقال ہے - خوش لہجہ ہے - خوش آواز ہے - ہر بات نرالی بولی بولتا ہے - کبھی ہندی راگ الاپتا ہے - گاہے فارسی کی زبان میں نغمہ سرائی کرتا ہے - کبھی عربی لہجے اُڑتا ہے - تجھ سے کوئی زبان نہ بچی - ترکی - انگریزی - کیا کیا کہا جائے اور لطف یہ کہ پھر اُردو کی اُردو ہے - اللہ رے تیرا حُسن قبول - غیروں سے یہ مناسبت - یوں شیر و شکر ہونا - کیا مجال بے ربطی پیدا ہو - بے لطفی کا نام نہیں -

اے میری پیاری زبان - تیری اداؤں کے قربان - ہے تو عجب چیز - تیری فصاحت و بلاغت - تیری شیرینی و لطافت کا کیا کہنا - تو کہاں نہیں - تیرا سکہ چار دانگ عالم میں چل رہا ہے - بنگالے پر تیرا جادو چلا - پنجاب میں تیرے بحر بے پایاں کی روانی - کشمیر میں تیری گرم بازاری - بمبئی مدراس جہاں دیکھیے تو موجود تیرے شیدائیوں کا جم غفیر دست بستہ حاضر - اے حسن بلاغت کی دیوی تیرے مرکز بھی بتا دوں - تیرا مندر لکھنؤ میں - تیرا کلیسا دہلی میں مگر تیرے حُسن عالم افروز کا کیا کہنا زمانہ فیض یاب - تیرے حسن کی جھلک - دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچتی ہے - ہاں جا تیری - تیرے شیدائی - تیری پرستش کرنے والے - تیرے پوجنے والے - دور دور سے ان مرکزوں کی جانب کھنچ کر جاتے ہیں - تیری بارگاہ میں باریاب ہو کر تیرے چشمۂ فیض سے اپنی پیاس بجھاتے ہیں - وہ ذائقہ حاصل ہوتا ہے کہ تا ابد نہیں بھولتے - امتیاز کی آنکھیں کھل جاتی ہیں - کھرے کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے - تیرا دیدار ٹکسالی صورت میں نصیب ہوتا ہے -

اے میری پیاری زبان - تیری اداؤں کے قربان - ہے تو عجب چیز - ہاں تیرا سکہ دلوں پر چلتا ہے اور چلتا رہے - تیرا عالم فریب حُسن مسخر کرتا ہے اور کرتا رہے - تیری زلف گرہ گیر کمند پھینکتی ہے اور پھینکتی رہے - ہاں ہاں تیرا طوطی بولتا ہے اور تا حشر یونہی بولتا رہے - آمین ثم آمین -

ناولہائے قاری ماسٹر باسط بسوانی

یعنی سعید - سعادت - شاہد رعنا

جناب قاری محمد سرفراز حسین صاحب عزمی دہلوی کے اخلاقی ناول جو دو مرتبہ چھپ چکے ہیں - اب پھر زیر طبع ہیں - جو صاحبان خریداری چاہیں وہ دفتر "تمدن" کو اطلاع دیں -
منیجر

ناداری

مثل مشہور ہے "پیری و صد عیب" مَیں کہوں گا "ناداری و صد عیب" مفلس ہونا بذاتہ کوئی عیب نہیں ہے۔ لوگوں میں مفلس مشہور ہونا مصیبت ہے۔ جہاں لوگوں کو یہ گماں ہو گیا کہ فلاں شخص غریب ہے۔ بس پھر دنیا اُس سے بچ کر نکلنے لگے گی۔ مالدار چور لباس فاخرہ پہنکر نکلے تو شریف سے شریف اُسکے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سر بازار نکل جائے گا۔ لیکن مفلس ساہوکار سے گلی میں بات کرتے ہوے بھی ہر شخص شرمائے گا۔ جس طرح ہندو غیر مذہب والے سے چھوت کرنے لگتے ہیں اسی طرح دنیا مفلس سے بچتی ہے۔ امیر ہو کر جو غریب ہو جائے اسکی اور بھی مشکل ہے۔ اسکے قدیم نمکخوار۔ ہم پیالہ و ہم نوالہ دوست۔ اسکے بھائی بند سب اُس سے آنکھ چرانے لگتے ہیں۔ وہ خود بھی اُن سے بچنا چاہتا ہے۔ کہاں وہ زمانہ کہ سب اُسکی جوتیاں سیدھی کرتے تھے اُسکی غلط بات کو بھی صحیح بتاتے تھے اسکے عیوب کو خوبی سمجھتے تھے کہاں یہ وقت کہ اُسکی طرف سے مُنھ موڑ لیتے ہیں وہ ٹھیک بات بھی کہے تو اسے جھوٹ سمجھتے ہیں اسمیں کوئی خوبی ہو تو اسمیں بھی بُرائی نکال دیتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ شاہان دہلی و نوابان اودھ کا عروج تھا۔ اُن سے زیادہ نہ کوئی شکیل تھا نہ اُن سے زیادہ کوئی عقیل تھا۔ دنیا بھر کی خوبیاں اُن ہی میں جمع ہو گئی تھیں۔ اُن ہی کی اولاد اب ہے کہ اُسکے پاس پیسہ نہیں ناداری کی بلائیں گرفتار ہے کوئی ٹکے کو نہیں پوچھتا بلکہ اُنکی خوبیوں کو بُرائی سمجھتے ہیں کوئی کہتا ہے کہ "ان لوگوں میں زبانی جمع خرچ بہت ہے ان سے کام نہیں ہوتا" کوئی کہتا ہے "صاحب بغیر برف کے تو ان کے حلق سے پانی نہیں

اُترتا دس روپیہ مہینے کے یہ پان کھا جاتے ہیں۔ بھلا ان سے کیا نوکری ہونی ہے
ابھی ان کے پاس دولت ہوتی تو ان ہی عیوب کے متعلق یہ کہا جاتا۔ "اجی ہاتھی
مرا ہوا بھی لاکھ ٹکے کا ہوتا ہے۔ کیوں نہوں شہزادے ہیں امیر ابن امیر ابن امیر
ہیں اب وقت پڑا ہے تو کیا ہے لیکن نسلی خوبیاں تو نہیں جا سکتیں طلاقت زبان
تو ملاحظہ فرمائیے۔ کسقدر فصیح کلام ہے کیسی سلیس اُردو بولتے ہیں زبان تو بس ان
لوگوں کا حصہ ہے۔ کام نہیں ہو سکتا مگر اس سے معذور سمجھنا چاہیے انھوں نے
کبھی کہاں کام کیا ہوگا" برف و پان کے متعلق کہتے "حضرت اس گئی گذری
حالت میں بھی صرف ایکدم کے لیے دس سیر روز برف آتی ہے۔ اور کچھ نہو کچھ ہو
تو بھی دس روپیہ ماہوار کے تو پان اُٹھ جاتے ہوں گے۔ آخر شہزادے
ہیں امارت کی بو کہاں سے جائے گی"

غرضکہ دنیا کا تو یہ حال ہے۔ امیر غریب سے یوں بھاگتا ہے کہ کہیں کوئی سوال
نہ کر بیٹھے غریب غریب سے یوں بچتا ہے کہ اس سے مل کر ملے گا کیا۔ دنیا دار
تو دنیا دار اللہ والے لوگ بھی غریب کی قدر نہیں کرتے۔ وہاں بھی امیر ہی کی
سُنائی ہے۔ مندروں پہ جاکر دیکھو مزاروں و زیارات پر دیکھو امیروں کے
چڑھاوے لیے جارہے ہیں اور غریبوں کو دھتکارا جا رہا ہے۔ مرنے کے بعد گناہوں
کی بخشش کے لیے بھی "دان چاہیے غریب کے پاس رکھا ہی کیا تھا جو اسکے لیے دان دیے جائیں۔ مسلمانوں کے ہاں یہ رسم ہے کہ قضا و نماز کے عوض
اسقدر گیہوں خدا کے نام غریبوں کو تقسیم کیے جائیں تو معافی مل جاتی ہے۔ امیر
تو گیہوں چھوڑ مرا وہ تقسیم ہو گئے اسکو معافی مل گئی۔ غریب کہاں سے اپنی نماز
قضا ہونے کا عوض دے۔

وہ دنیادار لوگ جو ملاؤں اور مذہبی پیشواؤں پر امیر پرستی کا اعتراض کرتے ہیں

خود امیر پرستی میں پھنسے ہوے ہیں اور غریب کا حق اُسکو نہیں دیتے۔ فی زمانہ جسقدر قوم کے لیڈر ہیں ان میں سے ایک ایسا نہیں کہ جو محض قوم کی محبت۔ ذاتی لیاقت و دماغی قابلیت ہی کی وجہ سے لیڈر ہوا ہو اور روپیہ کی وجہ سے نہوا ہو میرا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص نادار ہو لیکن اسمیں گرمجوشی۔ محبت۔ لیاقت۔ قابلیت سب موجود ہوں اور وہ چاہے کہ میں قوم کے فائدے کے لیے کوئی کام کروں۔ قوم کے فائدہ کی کوئی بات کہوں۔ قوم کو ادبار زرپرستی و خوشامدخوری سے بچاؤں تو ممکن نہیں کہ اُسکی کوئی بات پوچھے۔ کوئی کہے گا میاں یہ بھی کمائی کرنے کا سلسلہ نکالا ہے کوئی کہے گا کہ یہ چندہ تو جمع کرتے پھرتے ہیں مگر کھا گئے تو کیا ہوگا کوئی اسکے لباس پر اعتراض کرے گا تو کوئی اُسکے پاس سواری نہونے پر معترض ہوگا۔ غرضکہ اُسکی بات کوئی نہ سُنے گا کہ یہ کہتا کیا ہے اگر واقعی عقل کی بات کہتا ہے تو خواہ غریب ہی کیوں نہ ہو لیکن اس کو اپنا رہنا بنانا چاہیے اپنا لیڈر سمجھنا چاہیے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ قوم کے لیڈر سرسید احمد خان تھے پنشن یافتہ سب جج تھے۔ مہدی علی تھے جنکو اب بھی آٹھ سو روپیہ ماہوار پنشن کے ملتے تھے ہزاروں روپیہ سال کی ذاتی آمدنی ان کے پاس تھی۔ مولوی مشتاق حسین بھی نواب تو ہیں۔ جسٹس شاہ دین جج ہیں۔ سر فاضل بھائی کریم بھائی۔ آدم جی پیر بھائی۔ نواب سلیم اللہ مرحوم وغیرہ وغیرہ سب مائی کجیمی کے پوت ہیں۔ ان کے مقابلے میں سینکڑوں اور گمنام مگر سچے ہمدرد و بہی خواہاں قوم کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ شیخ سادہ لوح ریاست تیراگڈھ کے کامدار ہوگئے۔ بول وہ نہیں سکتے۔ لکھ وہ نہیں سکتے۔ قوم کی حالت سے وہ واقف نہیں۔ کامدار ہونے سے پہلے کوئی ان کے نام تک سے واقف نہیں تھا۔ مگر کامدار کیا ہوے دنیا بھر کی قابلیت

دنیا بھر کی لیاقت اور عقل اُن میں آگئی اور اُسی دن سے وہ لیڈران قوم میں شمار ہونے لگے۔ میر خضر الحق مدرسۂ جہل آباد میں دینیات کے مدرس تھے لوگ مسجد کا مُلّا سمجھتے تھے۔ اتفاق سے نواب صاحب کی اُن کے حال پر مہربانی ہوئی قاضی القضاۃ کردیا جاگیر دیدی مالدار بن گئے اب کیا تھا انجمن رفیق الجہال کا وفد اُنکی خدمت میں حاضر ہوا کہ ہمارے سالانہ جلسے کے پریسیڈنٹ ہونا منظور فرمایئے۔ کسی وجاہت پسند کالج نے دعوت دی کہ ہمارے انتظام دینیات کی تصدیق کیجیے۔ بس چشم زدن میں لیڈر قوم بن گئے۔ اب میر صاحب ہیں کہ جا دبے جا وقت بے وقت مدرسے کے لڑکوں کے بجائے دنیا بھر کو سبق پڑھاتے پھرتے ہیں اور عربی فقروں اور غلط منطق سے لوگوں کے دماغ کو پریشان کر رہے ہیں۔ جہاں ایک منٹ کی اسپیچ کی ضرورت ہے وہاں گھنٹوں بک بک کر رہے ہیں۔ مہذب مجلس میں نامہذب باتیں فرما رہے ہیں مگر کس کی مجال جو اُن سے آنکھ ملا سکے یا اُن کو اُن کی بیجا عنایت پر منع کرسکے اس کے برخلاف ایک معمولی حیثیت کا آدمی جس نے نہایت مطالعہ و مشقت کے بعد ایک دلچسپ و ضروری مسئلہ پر ایک مضمون تیار کیا ہے ایک جلسے میں اپنا مضمون پڑھتا ہے۔ لوگ سُنتے ہیں اور چپ ہو رہتے ہیں۔ بعض وقت سُنتے بھی نہیں کہ کیا کہتا ہے۔ بعض وقت اُسکی اسپیچ ہی بند کرا دیتے ہیں۔ اگرچہ اسی اسپیچ کے چھپ جانے کے بعد بڑے بڑے لیڈران قوم اسکے خیال کو اسکے فقروں کو اپنی دوسری اسپیچوں میں استعمال کرتے ہیں اُسوقت سب واہ وا کرتے ہیں تعریفوں کی بھرمار ہوتی ہے اور تحسین و آفرین کے نعرے آسمان تک پہنچتے ہیں۔ یہ زر پرستی کی حد ہے۔ سچ ہے ناداری بُری چیز ہے۔

م - ا - ز

ہنری ڈونان
بانی انجمن صلیب احمر

ہر قوم میں کچھ نہ کچھ ایسے لوگ ہمیشہ پیدا ہوتے رہے ہیں جنکی قوت تفکر اور قوت عمل ہر ساعت اور ہر لحظہ قومی فلاح و بہبود میں مصروف رہتی ہے، وہ اپنی قوم کی چھوٹی سی چھوٹی مصیبت سے بھی بیچین ہو جاتے ہیں اور اُسکے دفعیہ کے لیے اپنی جان تک قربان کر دینے میں تامل نہیں کرتے ہیں، درحقیقت ایسے ہی لوگ اپنی قوم کے سچے ہمدرد اور حقیقی تاجدار ہوتے ہیں جنکے سہارے قومی حیات کی کشتی مقصود تک پہنچتی ہے، یہ دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں مگر اُنکے سچے کارنامے ایک شفیق معلم کیطرح اُنکی قوم کی آیندہ آنے والی نسلوں کو رحم و محبت اور ہمدردی کا درس دیتے رہتے ہیں۔

ان ہی مخصوص لوگوں میں ہنری ڈونان کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے جس نے ابنائے جنس پر وہ بڑا احسان کیا ہے جو صفحات تاریخ پر زریں حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

ہنری ڈونان ۱۸۲۸ء بمقام جنیوا ایک نہایت مشہور دولتمند اور شریف خاندان میں پیدا ہوا، اسکی طبیعت کا میلان انسانی شفقت کیطرف بچپن ہی سے ظاہر ہونے لگا تھا اور وہ جنگوں کے ہولناک واقعات اور مجروحوں کی کرب اور ہچکیاں سُن سُنکر سخت متاسف ہوتا، ۱۸۵۹ء میں جب اسٹریا اور فرانس کے درمیان جنگ چھڑی تو وہ بنفس نفیس میدان کارزار گیا تاکہ کوئی بہتر سے بہتر طریقہ مجروحوں کی امداد کا دریافت کر سکے، اسی سال بتاریخ ۲۴ ہر جون معرکہ ہولفرینو (Solferino) میں بھی جو مذکورہ سلطنتوں میں واقع ہوی موجود تھا، ایکدن شام کے وقت میدان کا چکر لگانا شروع کیا

یکایک کیا دیکھتا ہے کہ ایک بہت بڑی تعداد مجروحوں کی ہے جو خون میں لتھڑے پڑے ہیں آہ و بکا کی صدا فریاد کی آواز لبوں پر جاری ہے اور وہاں اُنکا نہ کوئی مددگار ہے اور نہ کوئی پرساں حال، وہ اس عبرتناک اور دردانگیز نظارہ سے بہت متاثر ہوا اور اُسکا نہایت رحیم دل اس خونی منظر سے بھر آیا، اُسوقت اُسکی زبان سے جو الفاظ نکلے وہ یہ تھے "ائیں! یہ لوگ مار ڈالے گئے، اُف! کسقدر یہ عبرتناک اور تعجب خیز امر ہے کہ ایک انسان اپنے بھائیوں کے قتل کے لیے پیشقدمی کرتا ہے" اُس نے اسیوقت سے اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرنا شروع کیا آخرکار اس نتیجہ پر پہنچا کہ جنگ انسان کے لیے نہایت جانکاہ مرض ہے جس سے چھٹکارا پانا کسیطرح ممکن نہیں، اُسکا جڑ سے اُکھاڑ دینا تقریباً محال ہے، اسکے لیے کوئی ایسی دوا نہیں ایجاد ہو سکتی جو اسکو بالکل نیست و نابود کر سکے" اُس نے اپنے دل میں کہا "لیکن ہمکو ایسی چیز ضرور ایجاد کرنی چاہیے جو کم از کم اس مرض کی غیر معمولی تپچیدگیوں کو دور کر سکے اور مجروح دلوں کے لیے باعث تسکین ہو"

اسکے بعد ہنری ڈونان نے عہد کر لیا کہ اس مبارک تجویز کے پورا کرنے میں میں اپنی تمام کوششیں صرف کروں گا اور اپنی تمام زندگی صرف اس مقصد کی تکمیل کے لیے وقف کر دوں گا، پہلے پہل اُس نے "یادگار سولفرینو" کے عنوان سے ایک زبردست مضمون لکھا جسمیں تمام متمدن قوموں کو ایک ایسی انجمن قائم کرنے کے لیے دعوت دی جسکے ذریعہ تمام مجروحین کی امداد بحسن و خوبی کی جا سکے، اس مضمون کا اثر بہت زیادہ پیدا ہوا لوگوں نے ہر چہار طرف سے اسکی دعوت کو لبیک کہا مگر تھوڑے ہی دنوں بعد اسکی یہ صدا پست ہونے لگی، تب اسکو معلوم ہوا کہ یہ تجویز مسلسل کوشش اور جد و جہد کی مقتضی ہے، اس غرض سے اُس نے بڑے بڑے دارالسلطنتوں کا دورہ کرنا شروع کیا اور مختلف صحبتوں اور مجلسوں میں پرزور تقریریں کیں بالآخر

ایک دن اسکے مقصد کی بنیاد پڑ ہی گر رہی،

اس مسلسل دوا دوش میں اسکو بہت بڑی کامیابی پیرس میں یہ ہوی کہ وہاں اسکے بہت سے مددگار اور ہمخیال پیدا ہو گئے اور اول جس شخص نے اسکی طرف دست امداد بڑھایا وہ ایک اخبار کا ایڈیٹر تھا جس نے اُسکے تمام مضامین اپنے اخبار میں شائع کیے، بہت سے مضمون نگاروں کے قلم کو جنبش ہوی اور انھوں نے بھی اس عنوان پہ مضامین کا درانہ سلسلہ جاری کر دیا جس سے اسکے مقصد کی اشاعت اور زیادہ ہوی، اسکا خوشگوار نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں میں انجمن صلیب احمر کی بنیاد مکمل ہو گئی، اس انجمن کے رکن اور ممبر بڑے بڑے شرفا اور امرا قرار پائے، اور اسکا پہلا جلسہ ۲۶ ر اکتوبر ۱۸۶۳ء بمقام جنیوا منعقد ہوا اور پھر اسکے بعد کے اجلاسوں میں تمام متمدن دول نے اپنے اپنے نمایندے بھیجے، اسوقت سے آج تک یہ انجمن تمام مجروحین کی مرہم پٹی اور انکے آرام رسانی کا سامان کرتی آئی ہے،

ہنری ڈونانٹ کو سنہ ۱۹۰۱ء میں وہ قابل فخر انعام ملا جسکا اعلان فرڈ نوبل نے اس شخص کے لیے کیا تھا جس نے اپنے مفید معلومات زبردست تحریر و تقریر اور بہترین تجاویز کے ذریعہ انسانی خدمت ادا کرنے میں امتیازی درجہ حاصل کیا ہو لیکن موت نے نوع بنی آدم کے اس سچے ہمدرد اور مخلص کو نہیں چھوڑا نومبر سنہ ۱۹۱۰ء میں اس شریف النفس شخص کو دنیا سے کوچ کرنا پڑا۔

مولانا احمد اللہ معلم ندوہ

رباعی

ہر ایک سے صلح و آشتی بہتر ہے	گر ہو سکے سب سے دوستی بہتر ہے
مغرور ہو اکڑ نہ تنا گردن خم کر	انساں کے لیے فروتنی بہتر ہے

حضرت واسطی

چاندنی رات

سچ ہے نیچر کے دلدادہ کو سہانی تاروں بھری رات اور تابشِ ماہ کا فرشِ تمام لوازمات استراحت سے بے پروا کر دیتا ہے۔ کیا ہی پُرفضا وہ سین ہوتا ہے۔ جبکہ آخری شب کی آہستہ گھڑیوں میں کوئی نوجوان قدرت کی فیاضیوں کا لطف اُٹھانے کو آبادی سے باہر نکل جاتا ہے۔ شیروں کی گرج جنگلی جانوروں کی خوفناک آواز نہ تو اسکا تفریح کا شوق کم کر سکتی ہے۔ اور نہ اسکو ڈرا دھمکا کر وہیں کا وہیں ساکت کر سکتی ہے۔

آخر یہ کیوں؟۔ ہو نہ ہو وہ نوجوان چاندنی کے فرشِ سیمیں پر چلتا ہوا نسیم سحر کے پُرفزا پُرلطف و پُرادا جھونکوں سے گفتگو کرنے میں اسقدر غرق ہے کہ وہ اُن آوازوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور یا تو یہ سبب ہے کہ گُل کے رنگ و بو نے معشوق کی یاد کو تازہ کر دیا ہے اور یا یہ کہ شاید ماہ کامل کے حسن صبیح نے اسکو اسقدر متوجہ کیا ہے کہ وہ جیکو رکیطرح سے اس نیچر کے عظیم نشان پر فریفتہ ہے۔ جبکہ شبنم کے موتی گلاب کی سُرخ و سفید پنکھڑیوں پر ایک عجب انداز و زینت پیدا کر رہے ہوں تو یہ بالکل ناممکن ہے کہ ایک عجائب پسند طبیعت انکو سرسری نظر سے دیکھکر نظرانداز کر دے۔ یورپ والے گو جادو کو نہ تسلیم کریں مگر پھر بھی وہ کون سا دل ہوگا جو پیاری شبِ ماہ کے لطف اُٹھائے اور نیچر کے اس جادو کے اثر سے بچ جائے۔ شعرا اور قدرت کے دیگر دلدادہ اسی چاندنی رات یا پیاری تاروں بھری رات کی آرزو کیا کرتے ہیں۔ اُنکے شاہدان نازہی جادو والی رات کو سیر گلزار کو بیتابانہ نکل آتے ہیں۔ یہی رات عشاق ناکام کو اُنکے بستر استراحت سے سیر گلزار کے لیے کشاں کشاں کھینچ لاتی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ فراق کے صدمہ اسی رات میں تارے گن گن کر کم ہو جاتے ہیں۔

میرا خیال تو یہ ہے کہ ماہ کامل کے پُرنور چہرہ کا جادو یا حُسن دلربا۔ اُنکے معشوق کی یاد فراموش کر دیتا ہوگا۔ ورنہ یہ نہوتا۔ وہ دل جو برسوں سے کسی دلربا کی زلف پریشاں پہ گھائل ہو کر سیماب کیطرح تڑپ رہا ہو۔ اسی رات کو ماہ کامل کے پرلطف نظارہ سے آرام پاتا ہے۔ سیر و تفریح کیلیے یہ نہایت ہی مناسبات ہوتی ہے۔ دریا کے کنارے صحرا میں ہرے بھرے سبزہ زار پر چہل قدمی کرتے ہوئے۔ یہ رات طبیعت کو طرفہ لذت بخشتی ہے۔

محمد حسین علوی

غزلیات

حضرت وحید الدین صاحب بیخود دہلوی مدظلہ العالی

دل ہے مشتاق جدا آنکھ طلبگار جدا — خواہش وصل جدا حسرت دیدار جدا
کچھ کھڑے جھومتے ہیں طالب دیدار جدا — اینڈتے پھرتے ہیں کچھ خلد میں میخوار جدا
زاہدوں سے نہ بنی حشر کے دن بھی یارب — وہ کھڑے ہیں تری رحمت کے طلبگار جدا
جی جلانے کو ستانے کو مٹانے کو مجھے — وہ جدا غیر جدا چرخ ستمگار جدا
تیغ و خنجر بھی ہیں انداز و ادا بھی موجود — سر کے گاہک ہیں الگ دل کے طلبگار جدا
کعبہ ہو آتے ہیں دل تک ہے رسائی مشکل — سارے رستوں سے ہے یہ منزل دشوار جدا
باغ میں یاد نے اُسکی مجھے ٹکنے نہ دیا — چٹکیاں لینے لگے پھول جدا خار جدا
ہر قدم پر ہے مری خاک سے کھٹکا اُنکو — ہاتھ دامن سے نہ ہوگا دم رفتار جدا
بجلیاں حضرت موسیٰ پہ گریں دو اکبار — شعلۂ شوق جدا شعلۂ دیدار جدا
ہمسری قال سے کب حال کی ہو سکتی ہے — خانقاہوں سے ہے خانہ خمار جدا
دست صیاد میں ہوں خاک اُڑا دیں کیا بولو — قینچی گردن میں جدا چٹکی میں منقار جدا
ہو گئے وہ سحر وصل یہ کہکر رخصت — تجھ سے کرتا ہے مجھے چرخ ستمگار جدا
دلمیں الفت بھی رہی رشک کے کانٹے بھی رہے — اسنے سَو بار ملے ہم ہوے سَو بار جدا
قتل کرتے ہی مجھے جلوہ نمائی بھی ہوی — در پہ ہنگامہ الگ ہے پس دیوار جدا
سختیاں عشق کی جھیلوں کہ سنوں میں دل کی — کھائے جاتا ہے محبت میں یہ غمخوار جدا
حال یعقوب کی کیونکر ہو خبر یوسف کو — کوچۂ عشق سے ہے حسن کا بازار جدا
زاہدوں کی تری رحمت پہ چڑھائی ہے الگ — ٹولیاں باندھ کے آئے ہیں گنہگار جدا

وضع کا پاس بھی ہے بیخود میخوارہ ضرور
کاگ بوتل سے نہ کھینچے سر بازار جدا

حضرت مولانا عزیز لکھنوی مدظلہ العالی

جو راز ہے دل میں وہ ہے اندوختہ انکا
کچھ کہہ نہیں سکتا ہے دہن دوختہ انکا

انکی نگہ گرم ہو جب مانع فریاد
کیا آہ کرے گا کوئی دل سوختہ انکا

کھل جائے گا جب کوئی لگا دینگے وہ ٹھوکر
سب خاک کے پردے میں ہے اندوختہ انکا

دوزخ کے کلیجے میں بھی اک آگ لگی ہے
سرگرم فغاں ہے کوئی دل سوختہ انکا

خود آکے بجھائیں تو لگی دل کی بجھے گی
یہ عشق ہے اک شعلہ افروختہ انکا

کیا کیا نہ عزیز آپ کو ناصح نے پڑھایا
لیکن نہ رہا یاد کچھ آموختہ انکا

حضرت مرزا ثاقب قزلباش لکھنوی مدظلہ العالی

چھری ہے ہر نفس ہر ہر قدم پر کام قاتل سے
عدم کی شاہراہیں ملگئی ہیں اک رگ دل سے

کسی کا رنج دیکھوں یہ نہیں ہوگا مری دل سے
نظر صیاد کی جھپکے تو کچھ کہدوں عنادل سے

تمنا کی شکایت کیا جو نکلے آہ مشکل سے
یہ کس نے پھیر لیں آنکھیں کہ دنیا پھر گئی دل سے

تعجب خیز ہے معجز نمائی عشق صادق کی
تمنائے دل مجنوں نکل آئی ہے محمل سے

چل اے ہمدم ذرا ساز طرب کی چھیڑ بھی سن لیں
اگر دل بیٹھ جائیگا تو اٹھ جائینگے محفل سے

زیادہ کر رہی ہے بیوفائی طول فرقت کو
تمھارا فاصلہ بڑھتا ہی جاتا ہی مرے دل سے

رسیدہ نا امیدی کا بھم ہونا وہی جانے
کہ جسنے کشتیوں کو ڈوبتے دیکھا ہی ساحل سے

فدا ے کس پہ بسمل کا مطلب خوب ہی نکلا
جنازہ مرکے بھی اٹھتا نہیں ہے کوے قاتل سے

قریب عشق نے حد سے بڑھایا پاے الفت کو
تعلق ہوگیا آخر دل مجنوں کو محمل سے

مرے پاے بیاباں گرد کو زنداں سے کیا مطلب
اگر کانٹے نہ پائیگا تو الجھیگا سلاسل سے

نہ سمجھا معنیِ گورِ کفن سمجھا تو یہ سمجھا | تھکا تھا میں لپٹ کر سو رہا دامانِ منزل سے
تڑپتا ہے شبِ غم یوں کہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا | بتا لے نامرادی کونسی باتیں کروں دل سے
ادھر میں سر بکف پہنچا عدالت گاہ محشر میں | لہو کی بو ادھر آنے لگی دامان قاتل سے
وہی میں ناخدا تھا کشتیِ دل جسکو لے ڈوبا | مرا قصہ کوئی کہدے سبکسارانِ ساحل سے

وہ جس دن آ گئے شمعیں چڑھانے قبر پر ثاقب
اسی دن روشنی داغوں کی پھوٹی پردۂ دل سے

جناب عبدالرحیم صاحب کلیم لکھنوی مدظلہ العالی

بیکار یہ فراق کے صدمے گذر گئے | مرنا جو تھا تو مرتے ہی ہم کیوں نہ مر گئے
عیسیٰ کو دیکھکر ترے بیمار مر گئے | صحت کا نام سنتے ہی چہرے اتر گئے
تنہا ہم ایک رہ گئے سب آسیہ مر گئے | صدمے جہان بھر کے ہمیں پر گذر گئے
میت کے ساتھ ساتھ وہ کیوں ننگے سر گئے | ہم مر کے آج اور بھی بے موت مر گئے
دونوں جہان ایک کیے وہ جدھر گئے | دو چار تیر ادھر گئے دو چار ادھر گئے
تیر انکے اتنے دل میں ہمارے اتر گئے | ٹیس آبلوں سے دور ہوئی زخم بھر گئے
انجام قرب یار تناسخ سے بڑھ گیا | سو بار زندہ ہم ہوئے سو بار مر گئے
کچھ میرے ضبط عشق کی تصویر کھینچ دی | ناکام جو مرے وہ بڑا کام کر گئے
بھولے نہیں عتاب میں بھی انکی نازکی | جب ہم چڑھے نظر پہ نظر سے اتر گئے
آئینہ ہم نے دے کے انھیں پیار کر لیا | منہ دیکھتے وہ رہ گئے ہم اپنی کر گئے
شق جا بجا زمین ہوئی اتنے مقام کی | وحشت میں جس جگہ ترے شوریدہ سر گئے
کہنے کو یوں تو سب کا لیا اس نے امتحاں | جو بے نشان ہو گئے وہ نام کر گئے
آنکھوں میں وہ بسے ہیں کہ نگاہوں میں وہ سمائے | دل سے مرے نکل کے نجانے کدھر گئے
سارا جہاں ہے اپنا سنبھالے ہوئے جگر | تیر نظر ترے مرے دل سے اتر گئے

سکھنے کو اک ادا ہے زمانہ کی ہے قضا / لاکھوں اُنھوں نے خون کیے اور مکر گئے
اس بدگمانیوں نے مرا ضعف کھو دیا / میں اُنکے ساتھ ساتھ رہا وہ جدھر گئے
غیروں کو میرے قتل سے ایسی خوشی ہوئی / قاتل پہ آج سیکڑوں صدقے اُتر گئے
ہو جنکو لطف زیست اُنھیں کو ہے حضور / ہم کو تو آپ ابھی سے سمجھیے کہ مر گئے
ایسا نہیں کوے صنم کا تھا اشتیاق / ہم آپ وقت دفن لحد میں اُتر گئے
سوئیں نہ آکے کیسلیے تربت میں چین سے / ہم آج امتحان میں پورے اُتر گئے

موسی نہیں کلیم جو غش کھاے طور پر
دیکھ آئے اُسکو صاف جب اہلِ نظر گئے

حضرت مولانا صفی لکھنوی مدظلہ العالی

وہ آئیں تیغ بکف عذر امتحاں میں نہیں / لہو کی بوند مگر جسم ناتواں میں نہیں
سُنیں تو دل پہ لگے چوٹ سُننے والوں کے / یہ کیوں کہوں کہ اثر کچھ مری فغاں میں نہیں
کسی کی بزم میں یہ اعتبار کیا کم ہے / سبک نگاہ حریفاں سرگراں میں نہیں
کیا ہے کچھ تو سمجھکر یہاں کسی نے قیام / وہ کنج دل میں فضا ہی جو لامکاں میں نہیں
یہ گوشِ آہ میں جوشِ اثر نے پھونکا ہے / کہ آج تیرے برابر کوئی جہاں میں نہیں
ہلال میں خم ابرو دستاں ہے تو ہو / کشادِ تیر جگر دوز اس کماں میں نہیں
پگھل گیا مرے نالوں سے سنگ کعبہ تک / مگر نہیں تو اثر کچھ دلِ بتاں میں نہیں
کیا ہے وعدہ کسی نے یہ خانے آنے کا / وگرنہ عذر نہیں مرگ ناگہاں میں نہیں
وہ ہیں ہمارے جبین نیاز میں مضمر / جو نقش سجدہ کسی سنگ آستاں میں نہیں
ملا ہے مجھ کو بٹے دلوں کے دوستوں میں جو لطف / نصیب خضر کو وہ عمر جاوداں میں نہیں
نہیں حریص سخن یاں یہ دیکھنا ہے مجھے / کہ دل کی طرح تو کوئی گرہ زباں میں نہیں
پسینہ آگیا مجھکو سرِ تپش تلافیِ اشک / یہ دیکھکر کہ لہو چشم خونفشاں میں نہیں

حرارت غم جانسوز اے معاذ اللہ   بھرا ہوا ہے دھواں مغز استخواں میں نہیں

صفیؔ تراوش خونابہ جگر کب تک
لہو کی بوند بھی اب چشم ناتواں میں نہیں

حضرت محشرؔ لکھنوی مدظلہ العالی

عمر کی صرف جستجوے حبیب   اللہ اللہ ری آرزوے حبیب
ہوگا یارب وہ انقلاب کبھی   کہ بدل جاے جس سے خوے حبیب
اس سے مطلب نہیں ملے نہ ملے   ہم ہیں اب اور آرزوے حبیب
اب کہاں میں کہاں حواس مرے   ہر نفس آرہی ہے بوے حبیب
مجھسے امید و یاس کا ہے یہ قول   لیے بیٹھا رہ آرزوے حبیب
اور کچھ ہو گیا دماغ مرا   جب سے کھائی ہواے کوے حبیب
انتظامات شوق کے صدقے   ہاتھ دل پر نظر ہے سوے حبیب
نکلا آنکھوں سے یوں لہو دل کا   بن کے تصویر آرزوے حبیب

محشرؔ اٹھو چلو ذرا دیکھیں
آرہی ہے کہاں سے بوے حبیب

جناب منشی عبدالخالق صاحب خلیقؔ دہلوی مدظلہ العالی

جلا دل پہلے جاں اب جل رہی ہے   لگی میں اور یہ کیسی لگی ہے
مے الفت نشیلی ایسی پی ہے   کہ ساقی بیخودی سے بیخودی ہے
ہماری تلخ اب جو زندگی ہے   کسی کی ترشروئی نے یہ کی ہے
بتوں کو دیدیا ہے حسن ایسا   یہ اسکی شان اسکی خالقی ہے
نہ میری بات اے شیریں سخن کاٹ   زباں ہے تیری یا میٹھی چھری ہے
سمجھ رکھا ہے ناصح عشق آساں   کوئی دل کا لگانا دل لگی ہے

نہ اچھی شکل پر مائل ہو اے دل
کہ تیرے حق میں بصورت بڑی ہے

گلے سے تو لگا لینے دے قاتل
تری تلوار کیا ہے اک پری ہے

تمھارے اچھے ہونے میں نہیں شک
مری جاں میری ہی قسمت بری ہے

دکھایا اک حسیں جو آج اُن کو
عجب نخوت سے بولے آدمی ہے

رولاتے ہیں مجھے ذکر عدو سے
جو میری چڑ ہے وہ اُنکی ہنسی ہے

امانت اپنی واعظ تم اُٹھا لو
نصیحت طاقِ نسیاں پر دھری ہے

تمھیں ہم چاہیں تم اوروں کو چاہو
یہ سُنکر بولے اپنا اپنا جی ہے

وہ یکتا شکل آنکھوں میں سمائی
جدہر دیکھو اُدھر صورت وہی ہے

نہ چُوکے ظلم سے وہ پیش داور
قیامت پر قیامت ہو رہی ہے

نواسنجان گلشن دم بخود ہیں
غزلخواں کیا خلیقِ دہلوی ہے

جناب فدا علی صاحب خنجر لکھنوی مدظلہ العالی

ہوا حیران قاتل جذبہائے شوق بسمل سے
چلا تیر نظر اور مل گیا خونِ رگِ دل سے

کُھلی ہیں عشق سے آنکھیں ناصح نافہم شکل سے
نکالی بحث بیجا تونے پھر ٹوٹے ہوئے دل سے

جراحت کے مزے پوچھو دل بیتاب بسمل سے
رگوں میں دوڑنے لگتا ہے خونِ دیدۂ قاتل سے

کہیں ایسا نہو جل بھنکے قالب خاک ہو جائے
بس اے سوز محبت اب دھواں اُٹھنے لگا دل سے

طلسم عالم ایجاد کیا تھا اک تماشا تھا
کُھلا یہ راز ہم پر جب اُٹھے ہستی کی محفل سے

خدا کی شان ہے وہ ذبح کرنے آئے ہیں مجکو
اُچھل پڑتے تھے کل تک جو صدائے نالۂ دل سے

کٹی شام جوانی آئی پیری ہمنفس اُٹھے
سمیٹے جا رہے ہیں ٹوٹے پھوٹے جام محفل سے

بہت تھا دعوی دیدار ہوئی اب غشی کیسی
کچھ اُسکا ظرف دیکھو بات کی جس نے مقابل سے

بتاؤ تو سہی کیونکر دعا کیو اسطے اُٹھتے
ان ہاتھوں کو ہوئی کسترنہ فرصت تم دل سے

ہواؤں کے یہ سناٹے یہ طوفانِ برق و باراں کا
یہ پوچھو اُس سے جو مایوس ہو دامانِ ساحل سے

ستم ہے پھر کسی حُسنِ نظارہ سوز نے چھیڑا
سنبھالا تھا ابھی ہم نے دلِ مضطر کو مشکل سے

کچھ ایسی بیکسی سے کشتیِ عمرِ رواں ڈوبی
صدائے الرحیل آنے لگی دامانِ ساحل سے

وہ تشنہ کامِ الفت ہوں کہ میرے قتل ہونے پر
لہو تا دیر برسا دیدۂ شمشیرِ قاتل سے

زمانہ مرکزِ اصلی پہ خود پہنچائے گا غضنفر
یہ کیوں تشویش بیجا ہے نہ ہو مایوس منزل سے

جناب مرزا واجد حسین صاحب یاس عظیم آبادی مدظلہ العالی

چراغِ زیست بجھا دل سے اک دھواں نکلا
لگا کے آگ مرے گھر سے میہماں نکلا

دل اپنا خاک تھا پھر خاک کو جلانا کیا
نہ کوئی شعلہ اُٹھا اور نہ کچھ دھواں نکلا

سُنیں گے چھیڑ کے افسانۂ دلِ مرحوم
ادھر سے ملکِ عدم کا جو کارواں نکلا

تڑپ کے آبلہ پا اُٹھ کھڑے ہوئے آخر
تلاشِ یار میں جب کوئی کارواں نکلا

لہو لگا کے شہیدوں میں ہو گئے داخل
ہوس تو نکلی مگر حوصلہ کہاں نکلا

لگا ہے دل کو اب انجامِ کار کا کھٹکا
بہارِ گل سے بھی اک پہلوئے خزاں نکلا

زمانہ پھر گیا چلنے لگی ہوا اُلٹی
چمن کو آگ لگا کر جو باغباں نکلا

ہمارے صبر کی کھاتے ہیں اب قسم اغیار
جفا کشی کا مزہ بعدِ امتحاں نکلا

خوشی سے ہو گئے بدخواہ میرے شادیِ مرگ
کفن پہن کے جو میں گھر سے ناگہاں نکلا

اجل سے بڑھ کے محافظ نہیں کوئی اپنا
خدا کی شان کہ دشمن نگاہباں نکلا

حریمِ ناز میں شاید کسی کو دخل نہیں
دلِ عزیز بھی ناخواندہ میہماں نکلا

نہاں تھا خانۂ دل ہی میں شاہدِ معنی
جسے نشاں تھا وہ دیوار درمیاں نکلا

ہے فنِ عشق کا اُستاد بس دلِ وحشی
مریضِ غم کا یہی اک مزاجداں نکلا

دکھایا گورِ سکندر نے بڑھ کے آئینہ
جو سر اُٹھا کے کوئی زیرِ آسماں نکلا

لحد سے بڑھکے نہیں کوئی گوشۂ رحمت — قیامت آئی جو اس گھر سے میہماں نکلا
اب اپنی روح ہے اور سیرِ عالمِ بالا — کنوئیں سے یوسف گم کردہ کارواں نکلا

کلام یاس سے دنیا میں پھر اک آگ لگی
یہ کون حضرت آتش کا ہمزباں نکلا

جناب کنور محمد حیات علی خانصاحب آتش رئیس انزولی مظلہ العالی

تیغ کے ٹکڑے ہوے شل دست قاتل ہوگیا — سخت جانی سے خجل ہوکر میں بسمل ہوگیا
عشق میں پورا محبت میں وہ کامل ہوگیا — لطف جسکو وصل کا فرقت میں حاصل ہوگیا
جسکو خلوت میں بھی آنکھیں چار کرتے شرم تھی — خیر سے اب وہ زمانہ بھر کا قاتل ہوگیا
کرتے کرتے وعدۂ دیدار پورا رہ گئے — ہوتے ہوتے شادماں پژمردہ یہ دل ہوگیا
مدرسہ میں عشق کے دو حرف جس نے پڑھ لیے — ہوگیا ماہر ہر اک فن میں وہ کامل ہوگیا
دل فرشتہ خو مرا الفت میں اُسکے غرق ہے — آپکا چاہ ذقن بھی چاہ بابل ہوگیا
ہر کرم میں بھی مجھے ملنے لگا لطف ستم — مائل ذوق مصیبت اسقدر دل ہوگیا
جسکو دیکھا جاں کا خواہاں نظر آنے لگا — اپنا گھر اپنا محلہ۔ کوئے قاتل ہوگیا

جی جلاتا تھا جو میرا خاک کرتا تھا مجھے
آج اے آتش وہ آکر شمع محفل ہوگیا

ابن مسلم

"تمدن" کے پرانے کرمفرما جناب سلطان حیدر صاحب جوش (علیگ) نے ابن مسلم نامی ایک ناول دو سال کی مسلسل کوشش سے تیار کیا ہے جسکا حجم دو سو سو دو سو صفحہ کے قریب ہے ہمکو معلوم ہوا ہے کہ ناول زیر طبع ہے۔ ناظرین "تمدن" جنھوں نے مسٹر جوش کے مضامین پڑھے ہیں ضرور اندازہ کرسکتے ہیں کہ یہ ناول کیا چیز ہوگا۔

(سفرنامہ میں غلطی سے بعض جگہ ۱۹۱۶ء کی جگہ ۱۹۱۵ء چھپ گیا ہے ناظرین صحت کرلیں
(سفرنامہ کے سلسلے کے لیے اکتوبر نمبر ملاحظہ ہو)

میرا پہلا لکچر ناگاساکی میں بدھ مذہب کے مشہور مندر مسمّی بہ چوشوجی میں
انگریزی میں ہوا۔ اُس کا مختصر ذکر "ناگاساکی پریس" مورخہ ۱۹۔ دسمبر ۱۹۰۵ء
نے حسب ذیل الفاظ میں کیا:۔

ترجمہ

ناگاساکی پریس ۱۹ دسمبر ۱۹۱۵ء

وکیل محمد سرفراز حسین نے چشوجی کے مندر میں ایک لیکچر دیا۔ لیکچر کا
عنوان "خدا کا خیال" تھا دو سَو کے قریب جاپانی لیکچر میں موجود تھے۔
جلسہ کے صدر مسٹر سوزوکی ایڈیٹر "تو یوھنو دے" تھے جنھوں نے لیکچر کا
ترجمہ بھی کیا کیونکہ لیکچر انگریزی زبان میں تھا۔

لیکچرار مسلمان ہے اور اُس نے نہایت دلچسپ پیرایہ میں ثابت کیا کہ توحید
جو کسی نہ کسی صورت میں ہر مذہب و فلسفہ میں موجود تھی اسلام میں درجۂ
تکمیل کو پہنچی۔ اسی کے ضمن میں لکچرار نے کل مشہور مذاہب اور فلسفوں کا
ذکر کیا۔

میں مسٹر سوزوکی کا نہایت ممنون ہوں۔ اُن ہی کی کوشش سے یہ لیکچر ہوا
علاوہ ترجمہ کرنے کی تکلیف اُٹھانے کے انھوں نے مجھ سے از حد محبت کا اظہار کیا

ناگاساکی سے کوبے پہنچا اور وہاں ایک ہفتہ قیام کر کے دارالسلطنت ٹوکیو
میں پہنچا۔ وہاں کے اخبارات نے میرا خیر مقدم نہایت عمدہ الفاظ میں کیا۔
ہندوستان میں اخبار وکیل نے حسب ذیل نوٹ شائع کیا۔

از اخبار وکیل امرتسر مورخہ ۲ فروری ۱۹۰۶ء

سفر جاپان | ناظرین یہ خبر نہایت مسرت سے سُنیں گے کہ اسلام کے سچے خادم

اور ہمارے کرمفرما قاری سرفراز حسین صاحب عزمی دہلوی جو ایک سال کی فرلو لے کر جاپان تشریف لے گئے ہیں ۱۱ دسمبر کو ناگاساکی پہنچے اور ۱۸ دسمبر کو بدھ مذہب کے مندر چوشوجی میں توحید پر انگریزی میں لیکچر دیا۔ جسکا ترجمہ جاپانی زبان میں ایک لائق جاپانی جنٹلمین نے کیا۔ دو سو کے قریب حاضرین تھے جنھوں نے لیکچر مذکور کو دو گھنٹہ تک نہایت توجہ اور غور سے سُنا۔ ایک امریکن لیڈی مس رینڈلف گوڈ بھی موجود تھیں۔ اگلے روز انگریزی اور جاپانی اخباروں نے آپکے لیکچر پر نہایت معقول ریویو کیا۔ اور کلمات تحسین کے بعد لکھا کہ "یہ پہلا موقعہ ہے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی توحید کا وعظ جاپان میں کیا گیا ہے" کثرت سے لوگ آپ سے ملنے آتے اور اسلام کی حقانیت کی باتیں نہایت شوق سے سُنتے رہے۔ ناگاساکی سے آپ شہر کوبے میں پہنچے جو دوسرا بندرگاہ ہے وہاں سے اب آپ ٹوکیو دارالسلطنت جاپان میں پہنچ گئے ہیں۔ امید ہے اشاعت اسلام کے متعلق قادری صاحب کی کوششیں بارآور ہوں گی اور آپ وقتاً فوقتاً اپنی قابل قدر مذہبی خدمات کے نتائج سے وکیل کے کالموں کو مزین فرماتے رہیں گے۔

ٹوکیو میں ایک ماہ کے قریب رہا۔ وہاں اُن ہندوستانی طلباء نے جو وہاں پڑھتے تھے مجھ پر بہت عنایت کی۔ مسلمان طالبعلم تو صرف ایک تھے باقی طلبہ ہندو اور بنگالی تھے۔ ان سب نے خلوص کا برتاؤ کیا۔ ٹوکیو کے اخبارات نے بھی مروت کا برتاؤ کیا۔ اور میری آمد کی خبر اور مقصد کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا مگر وہ انجمن جسکی تلاش میں مَیں نکلا تھا نہ ملنی تھی نہ ملی۔ ناچار مَیں نے وہاں بطور خود لیکچروں کا بندوبست کیا ایک لیکچر یونی ٹیرین چرچ میں ہوا لیکچر انگریزی میں تھا۔ ترجمان صاحب ایک ایک فقرہ کا ترجمہ جاپانی زبان میں

کرتے جاتے تھے۔

دوسرا لیکچر سوسائیٹی برائے انسداد مظالم بر حیوانات میں ہوا۔ اخبارات نے میرے لیکچروں پر بہت معقول ریویو کیے۔

۱۷ فروری ۱۹۰۶ء کے وکیل میں میرے متعلق حسب ذیل نوٹ شائع ہوا

از اخبار وکیل امرتسر مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۰۶ء

قاری سرفراز حسین صاحب دہلوی جاپان میں اسلام کی منادی کرنے کو پہنچ گئے ہیں اور وہاں کے لوگ ان کے لکچر دلچسپی کے ساتھ سنتے ہیں۔ اخبارات میں خاص طور پر ان کی تقریروں کا اقتباس درج ہوتا ہے۔

اسی تاریخ یعنی ۱۷ فروری ۱۹۰۶ء کے اخبار روزگار میں میرے متعلق حسب ذیل مضمون شائع ہوا جس کا میں تہ دل سے ممنون ہوں۔

جاپان میں اشاعت اسلام

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

قاری سرفراز حسین ایک مسلمان مشنری

قاری سرفراز حسین صاحب مدرسۃ العلوم علیگڈھ کے ایک پرانے طالبعلم اور ہمارے دیرینہ کرمفرما دوست ہیں۔ انسپکٹر جنرل سپلائی وٹرینسپورٹ ایسٹرن کمانڈ نینی تال کے دفتر میں ملازم ہیں۔ عربی زبان اور علوم دینیات کے بہت اچھے ماہر اور انگریزی زبان میں اعلیٰ درجہ کی دستگاہ رکھتے ہیں اور قومی ترقی کے جدوجہد کے میداں میں ہمیشہ ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں اسوقت جس اولوالعزمی اور ہمت کا کام اُنھوں نے کیا ہے وہ قرن اولیٰ کے

مسلمانوں کی ہمت اور جوانمردی کا ایک نمونہ ہے - جاپان میں اشاعت اسلام کی ضرورت کے چرچوں کو سُن کر یہ جوان ہمت اور محب اسلام بزرگ بغیر کسی شور و شغف کے چپ چاپ اُٹھکر ملازمت سے رخصت لے کر اپنے خرچ سے جاپان پہنچ گیا ہے اور اشاعت اسلام کے متعلق جاپان کی نبض پر ہاتھ رکھا ہے - جاپان سے انھوں نے اپنا پہلا خط حسب ذیل لکھا ہے جو پیسہ اخبار میں چھپوایا گیا ہے -

از مقام کوبے ملک جاپان - محل مورخہ ۲۰ دسمبر ۱۹۰۵ء

برخوردار عباس حسین طولعمرہٗ - بعد دعا کے معلوم ہو کہ میں نے ایک پوسٹ کارڈ مقام ناگاساکی سے ڈالا تھا - امید ہے کہ پہنچا ہو گا - میں اللہ کے فضل و کرم سے بالکل تندرست ہوں اور ہر طرح سے آرام و آسایش میں ہوں - سردی ابھی تک نینی تال ہی کے مثل مل رہی ہے - اور کسی قسم کی تکلیف نہیں ہے - برف ابھی تک یہاں شروع نہیں ہوی - جنوری میں پڑے گی - صحت کے اعتبار سے آب و ہوا جاپان کی نہایت عمدہ ہے اور مجھے موافق ہے - میں ۱۱ دسمبر کو ناگاساکی پہنچا تھا اور دس روز وہاں رہ کر ۲۰ تاریخ کو روانہ ہو کر کل صبح کو یہاں پہنچا - ہندوستان میں جو خبر سُنی تھی کہ ناگاساکی میں مذہب کی کمیٹی ہے وہ مجھے وہاں نہ ملی - دس روز تک میں نے ہر قسم کی کوشش کی - لوگوں سے ملاقات کی - اخباروں میں اشتہار دیے - مگر اسکا پتہ نہ چلا - غالباً کسی دوسرے شہر میں ہو گی - جس کا حال مجھے آیندہ معلوم ہو جاوے گا - ۱۸ تاریخ کو میں نے ناگاساکی کے ایک مشہور مندر میں انگریزی میں توحید پر لکچر دیا - دو ہزار سے زیادہ آدمی تھے - اور لوگوں نے بہت پسند کیا اُس کا ترجمہ جاپانی زبان میں کر کے ایک دوسرے شخص نے سُنایا - دوسرے دن کے

اخباروں نے میرے لکچر کی اللہ کے فضل سے بہت تعریف چھاپی اور ایک جاپانی اخبار نے لکھا کہ یہ پہلی مرتبہ ہے کہ جاپان میں اسلام کا لکچر سُنایا گیا۔ اُسکے بعد جو میں دو دن وہاں رہا۔ تو لوگ مجھے ملنے میرے ہوٹل میں آتے رہے اور ایک جاپانی جنٹلمین اور ایک امریکن لیڈی نے بعد چندے مطالعہ کے اسلام قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے اب مَیں انشاء اللہ دارالسلطنت ٹوکیو کو جا رہا ہوں تاکہ اس کمیٹی کے آدمیوں سے مل کر اور اپنا کام وہاں جا کر تقریر و تحریر کی کارروائی وہاں سے شروع کروں اور پھر دوسرے شہروں میں لکچر دینے نکلوں۔ جاپانی لوگ پڑھنے کے لیے رسالے مانگتے ہیں۔ ٹوکیو پہنچ کر رسالے بھی تصنیف کر کے چھپوا دوں گا۔ اس کام میں بڑا خرچ درکار ہے بغیر اسکے یہاں گذارہ نہیں ہے۔ کل یا پرسوں انشاء اللہ میں ٹوکیو روانہ ہو جاؤنگا اب تک تمہارے پاس سے کوئی خط مجھے نہیں ملا۔ آیندہ خطوط ٹوکیو بھیجنا۔ جو خط نگاساکی پہنچیں گے۔ وہ مجھے ٹوکیو بھیج دیے جائیں گے۔ اسکا انتظام مَیں نے کر دیا ہے۔ مجھے اس لکچر میں بہت تقویت ہو گئی ہے اور اللہ کے فضل سے ہر طرح امید ہے کہ ٹوکیو پہنچ کر میں اپنے مقاصد میں اچھی طرح کامیاب ہوں گا۔ خدا کے فضل سے میرا دل زیادہ قوی ہوتا جاتا ہے۔ ایک پادری صاحب سے جہاز میں مباحثہ ہوا۔ اور دو جاپانی عیسائی شدہ پادری بعد لکچر کے مجھ سے گفتگو کرنے ہوٹل میں آئے۔ ان تینوں کو میں نے اللہ کے فضل سے قوی دلائل سے بند کر دیا۔ ان لوگوں کو کچھ جواب بن نہ آیا۔ یہاں پادریوں کا زور ہے۔ اور دن بدن ہوتا جاتا ہے۔ لاکھوں روپے مشن کے کام پر خرچ کر رہے ہیں اور گرجا اور مدرسے اور سوسائٹیاں قائم ہیں۔ اسلام کے ایک باقاعدہ مستقل مشن کی یہاں اشد ضرورت ہے۔ ٹوکیو پہنچ کر

اس مضمون پر ایک مفصل تحریر ہندوستان بھیجوں گا۔"
قاری صاحب کے اس خط کے پڑھنے کے بعد کون سا ایسا مسلمان ہوگا جسکے دل سے احسن و مرحبا کی صدا اس نیک اور سچے اور باہمت مسلمان کی نسبت نہ نکلے گی اور کون سا ایسا مسلمان دل ہوگا جس سے قاری صاحب کے اس پاک اور عظیم الشان مقصد اور مدعا کی کامیابی کی دعا نہ نکلے گی - لیکن جہاں تحسین و تعریف کی جاوے گی اور دعائیں مانگی جائیں گی - وہاں اس امر پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ قاری صاحب کو جو احتیاجات پیش آئیں گی ان کے پورے کیے جانے کے لیے وہ مسلمانان ہندوستان کی امداد کے مستحق ہیں یا نہیں۔ اس امر کی نسبت ہم اپنے ذاتی علم اور واقفیت سے مسلمانان ہندوستان کو یقین اور اطمینان دلا سکتے ہیں کہ قاری صاحب نے جو کام اختیار کیا ہے اور جس نیک اور اہم مقصد کے پورا کرنے کے واسطے اپنے آپ کو پیش کیا ہے - اسکے کرنے کے وہ بہمہ وجوہ قابل ہیں - ہر ایک مسلمان کو ان کی عالی ہمتی اور اس سب سے بڑے قومی اور اسلامی خدمت کا دل سے مشکور ہونا چاہیے لیکن قاری صاحب کی قوت ایمان نے جس امر کا ان کو تقاضا کیا اس کو وہ اپنی طرف سے پورا کر چکے ہیں - اُنھوں نے اپنا گھر چھوڑا - عزیز و اقارب کو چھوڑا - آرام و آسایش کو چھوڑا - اپنا وقت اپنے پاک اور پیارے دین کی خدمت کے واسطے وقف کر دیا - اور اپنے مقدور کے موافق اپنی گرہ سے خرچ بھی برداشت کیا - لیکن ممالک غیر میں اشاعت اسلام کا کام ایسا کام نہیں ہے جس کے واسطے ضروریات مصارف کی حاجات کو قاری صاحب اپنی گرہ سے پورا کر سکیں - یہ ایک ایسا کام ہے جس کے واسطے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں روپیہ کی ضرورت ہے اور اگر محض اس وجہ سے کہ روپیہ کی

امداد نہیں مل سکتی اس بزرگ کام کے متعلق کوششوں کو ترک کردینا پڑیگا تو اس سے بڑھکر شرمناک پست ہمتی کے اظہار کا کوئی امر مسلمانان ہندوستان کے واسطے نہیں ہوگا۔ مسلمانان ہندوستان نے اپنی قومی ضرورت کے کاموں میں اب تک جو امداد دی ہے وہ گو توقع سے کم ہو مگر پھر بھی قابل تعریف ہے۔ ہر ایک قومی ضرورت جو مسلمانوں کے سامنے پیش کی گئی ہے اس میں ان تمام مسلمانوں نے جنھوں نے اس ضرورت کو سمجھا ہے بہت عمدہ امداد دی ہے۔ تو اشاعت اسلام کے عالیشان مقصد کے واسطے اگر مسلمان امداد دینے میں قصور یا کوتاہی کریں تو اسکے معنی صرف یہ ہو سکتے ہیں کہ مسلمانان ہندوستان اشاعت اسلام کے کام کو ضروری نہیں سمجھتے۔ لیکن ہم یقین کرتے ہیں کہ تمام دنیا کے کروڑوں مسلمانوں میں گو ایسے مسلمان موجود ہوں جو اپنے دیگر اتمام کے حوائج سے ناواقف اور بے خبر ہوں مغربی علوم و فنون کے حصول کی ضرورت کو نہ سمجھتے ہوں۔ اقوام یورپ کے نقش قدم پر چل کر اپنے حالات کی اصلاح کے گر سے بے علم ہوں لیکن کوئی مسلمان باعلم و باخبر یا جاہل ایسا نہیں ہوگا جو اشاعت اسلام کے مقدس کام کی ضرورت سے انکار کرے یا جسکے دل میں اس نیک کام کے کرنے کا شوق نہو۔ اور اگر یہ امر صحیح ہے تو اس ضرورت کے مانے جانے اور شوق کا ثبوت صرف ایک ہی طریق پر دیا جا سکتا ہے کہ تمام مسلمان اپنی اپنی ہمت اور توفیق کے مطابق اس مدعا کے حاصل کیے جانے کی کوششوں کے لیے روپیہ سے امداد کریں۔ ہم گزشتہ تحریروں میں بیان کر چکے ہیں کہ یہی ایک ایسا کام اور مقصد مسلمانوں کا ہے جسمیں ہر طبقہ اور ہر فرقہ اور ہر قسم کے مسلمان بلا اختلاف رائے شامل اور شریک ہو سکتے ہیں پس جس چیز کی

اس مضمون پر ایک مفصل تحریر ہندوستان بھیجوں گا۔"

قاری صاحب کے اس خط کے پڑھنے کے بعد کون سا ایسا مسلمان ہوگا جسکے دل سے احسن و مرحبا کی صدا اس نیک اور سچے اور باہمت مسلمان کی نسبت نہ نکلیگی اور کون سا ایسا مسلمان دل ہوگا جس سے قاری صاحب کے اس پاک اور عظیم الشان مقصد اور مدعا کی کامیابی کی دعا نہ نکلے گی۔ لیکن جہاں تحسین و تعریف کی جاوے گی اور دعائیں مانگی جائیں گی۔ وہاں اس امر پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ قاری صاحب کو جو احتیاجات پیش آئیں گی ان کے پورے کیے جانے کے لیے وہ مسلمانان ہندوستان کی امداد کے مستحق ہیں یا نہیں۔ اس امر کی نسبت ہم اپنے ذاتی علم اور واقفیت سے مسلمانان ہندوستان کو یقین اور اطمینان دلا سکتے ہیں کہ قاری صاحب نے جو کام اختیار کیا ہے اور جس نیک اور اہم مقصد کے پورا کرنے کے واسطے اپنے آپ کو پیش کیا ہے۔ اسکے کرنے کے وہ بہمہ وجوہ قابل ہیں۔ ہر ایک مسلمان کو ان کی عالی ہمتی اور اس سب سے بڑے قومی اور اسلامی خدمت کا دل سے مشکور ہونا چاہیے۔ لیکن قاری صاحب کی قوت ایمان نے جس امر کا ان کو تقاضا کیا اس کو وہ اپنی طرف سے پورا کر چکے ہیں۔ انھوں نے اپنا گھر چھوڑا۔ عزیز و اقارب کو چھوڑا۔ آرام و آسایش کو چھوڑا۔ اپنا وقت اپنے پاک اور پیارے دین کی خدمت کے واسطے وقف کر دیا۔ اور اپنے مقدور کے موافق اپنی گرہ سے خرچ بھی برداشت کیا۔ لیکن ممالک غیر میں اشاعت اسلام کا کام ایسا کام نہیں ہے جس کے واسطے ضروریات مصارف کی حاجات کو قاری صاحب اپنی گرہ سے پورا کر سکیں۔ یہ ایک ایسا کام ہے جس کے واسطے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں روپیہ کی ضرورت ہے اور اگر محض اس وجہ سے کہ روپیہ کی

امداد نہیں مل سکتی اس بزرگ کام کے متعلق کوششوں کو ترک کردینا پڑیگا تو اس سے بڑھکر شرمناک پست ہمتی کے اظہار کا کوئی امر مسلمانان ہندوستان کے واسطے نہیں ہوگا۔ مسلمانان ہندوستان نے اپنی قومی ضرورت کے کاموں میں اب تک جو امداد دی ہے وہ گو توقع سے کم ہو مگر پھر بھی قابل تعریف ہے۔ ہر ایک قومی ضرورت جو مسلمانوں کے سامنے پیش کی گئی ہے اس میں ان تمام مسلمانوں نے جنھوں نے اس ضرورت کو سمجھا ہے بہت عمدہ امداد دی ہے۔ تو اشاعت اسلام کے عالیشان مقصد کے واسطے اگر مسلمان امداد دینے میں قصور یا کوتاہی کریں تو اسکے معنی صرف یہ ہو سکتے ہیں کہ مسلمانان ہندوستان اشاعت اسلام کے کام کو ضروری نہیں سمجھتے۔ لیکن ہم یقین کرتے ہیں کہ تمام دنیا کے کروڑوں مسلمانوں میں گو ایسے مسلمان موجود ہوں جو اپنے دیگر تمام کے حوائج سے ناواقف اور بے خبر ہوں مغربی علوم و فنون کے حصول کی ضرورت کو نہ سمجھتے ہوں۔ اقوام یورپ کے نقش قدم پر چل کر اپنے حالات کی اصلاح کے گُر سے بے علم ہوں لیکن کوئی مسلمان باعلم و باخبر یا جاہل ایسا نہیں ہوگا جو اشاعت اسلام کے مقدس کام کی ضرورت سے انکار کرے یا جسکے دل میں اس نیک کام کے کرنے کا شوق نہو اور اگر یہ امر صحیح ہے تو اس ضرورت کے مانے جانے اور شوق کا ثبوت صرف ایک ہی طریق پر دیا جا سکتا ہے کہ تمام مسلمان اپنی اپنی ہمت اور توفیق کے مطابق اس مدعا کے حاصل کیے جانے کی کوششوں کے لیے روپیہ سے امداد کریں۔ ہم گذشتہ تحریروں میں بیان کر چکے ہیں کہ یہی ایک ایسا کام اور مقصد مسلمانوں کا ہے جسمیں ہر طبقہ اور ہر فرقہ اور ہر قسم کے مسلمان بلا اختلاف رائے شامل اور شریک ہو سکتے ہیں پس جس چیز کی

ضرورت ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہر ایک مقام پر ایسے اہل دل مسلمان پائے جائیں جو اس کار خیر کے واسطے چندہ جمع کریں۔ چندہ دینے والوں کی کمی کی شکایت کہیں بھی پیش نہیں آئے گی۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے جن دوستوں اور جن محبان دین پاک کے کانوں میں ہماری یہ صدا پہنچی ہے انھوں نے اپنے اس سب سے بزرگ اور ضروری کام کے واسطے کیا کچھ کیا ہے اور آخر میں ہم خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرتے ہیں کہ وہ رب کریم و رحیم جس کے کرم و فضل پر قاری سرفراز حسین بھروسہ اور توکل کرکے اس نیک اور پاک کام کے واسطے پردیس میں جا پہنچے ہیں مسلمانوں کے دلوں میں ان کی امداد کا خیال ڈالے اور ان کی امداد کی ہمت اور توفیق عطا کرے اور قاری صاحب کو اپنے اس مہتم بالشان کام میں کامیابی اور بارگاہ باری تعالے سے اجر عظیم حاصل ہو۔ آمین "

۳ مارچ سنہ ۱۹۰۶ء کے روزگار میں مسٹر محمد دین صاحب کا حوصلہ افزا خط شائع ہوا جسکو شکریہ کے ساتھ درج کرتا ہوں وھوھذا

اشاعت اسلام

مکرم بندہ جناب قاضی صاحب زاد لطفہ۔

سلام علیکم و رحمۃ اللہ تعالے و برکاتہ۔ روزگار کے پرچہ مورخہ ۱۷ فروری سنہ ۱۹۰۶ء میں جاپان میں اشاعت اسلام کے مضمون کو پڑھکر جسقدر مسرت ہوی ہے۔ اسکو میں احاطہ بیان سے باہر پاتا ہوں قاری سرفراز حسین صاحب نے جس جوش محبت و اولوالعزمی سے یہ مقصد اعلا

علمی مذہبی اخلاقی کتب کا ذخیرہ

الزہرا: حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی قابل قدر سوانح عمری بعد جناب مولانا راشد الخیری صاحب ایڈیٹر عصمت جس میں تحقیقات علم و دین کی وسیع زندگی وغیرہ ملک میں بہت مطبوع ہوئی ہیں۔ قیمت ۱۲ر

جذبات اسلام: دور جدید کے مشہور شعراء یعنی مولانا حالی و ڈاکٹر اقبال مولانا شبلی مولوی ظفر علیخان وغیرہ کی قومی و مذہبی نظموں کا نہایت دلکش مجموعہ ۔۔ عہ

انتخاب زوج: دہلی کے ایک مشہور انشاپرداز خاتون کے زور قلم کا تازہ کارنامہ ہے۔ قابل مصنفہ نے اپنے طبقہ کی جانب سے جنس ذکور کی خدمت میں پیش کیا ہے کہ اس عزت کی رائے کو بھی قابل قدر نعمت سمجھکر حاصل کر لیا جائے ۳ر

تعلیم صوم و نماز و زاری: قصے اور کہانیوں میں نہایت ضروری تعلیم قیمت ۱۲ر

حقائق الاسلام: اسلام کے عقائد پر جو اعتراضات پیش کیے جاتے ہیں ان سب کا نہایت معقول و مدلل جواب عقائد اسلامیہ کو قلب میں راسخ اور ایمان کو محکم بنانے والی کتاب ہے۔ مولفہ ... صاحب ایم اے مولوی فاضل قیمت عہ

محاصرہ دردانیال: دردانیال کی مکمل تاریخ موجودہ جنگ کے معرکہ ہائے دردانیال کی پوری حالت انگریزوں کی واپسی اور ... کے واقعات نہایت صحیح اور مفصل بیان کیے گئے ہیں قیمت ۔۔۔۔۔۔ ۱ر

مشہور مصنفین اردو کی کتابیں

خواجہ حسن نظامی

	قیمت
سیپارۂ دل	۸ر
دو رو ... با تصویر	۷ر
... با تصویر	۱۲ر
اتالیق خطوط نویسی	۱۰ر
بیوی کی تعلیم	۱۲ر
انتخاب نوسید	عہ
کرشن بیتی	عہ
چٹکیاں اور گدگدیاں	۸ر
بچوں کی کہانیاں	۲ر
مجموعۂ خطوط حسن نظامی قیمت	۱۲ر

مولانا شبلی مرحوم

	قیمت
الکلام	عہ
رسائل شبلی	عہ
مقالات شبلی	۸ر
مضامین عالمگیر	۱۰ر
شعر العجم جلد سوم	۱۲ر
دیوان شبلی فارسی	۸ر
بوئے گل	۴ر
دستۂ گل	۴ر
برگ گل	۴ر
الانتقاد	۸ر

مولوی سید سلیمان ندوی

	قیمت
ارض القرآن	عا
لغات جدیدہ	عہ
مکاتیب شبلی	۱۲ر
انقلاب الامم	۸ر

ملنے کا پتہ: منیجر آئینہ ادب انجمن اشاعت کوٹھی لکھنؤ

ناول اور افسانے

طلسم: والٹر اسکاٹ کے ناول طلسمات کا ترجمہ صفحہ ۱۷۶ قیمت ۶ر

مونگے کا جزیرہ:۔ انگریزی جہازرانوں کے عجیب و غریب سفر و مہر کے صفحہ ۲۹۶ قیمت ۔ ۸ر

دہن شیر:۔ رومی بادشاہوں کا جور و ظلم کا ناول صفحہ ۲۳۲ قیمت ۸ر

زرین ملک کے عجائبات:۔ چند نوجوانوں کے انگلستان سے جنوبی امریکہ تک سفر ناموں کے پیرایہ میں قیمت ۸ر

رومۃ الکبریٰ کی آتشزدگی:۔ قیصر روم کے عہد کا تاریخی ناول مجلد ۱۰ر

جان ہیلفکس جنٹلمین:۔ ایک نوجوان لڑکے کے حالات۔ کسطرح ادنیٰ حالت سے اپنی جوانمردی سے ترقی کرکے دولتمند ہوگیا صفحہ ۶۴۰ قیمت ... ۱۲ر

سرگذشت رابنس کروسو:۔ (صفحہ ۲۹۲) انگلستان کے ایک مشہور جہازران اور سیاح کے زندگانی کے حالات بہت دلچسپ کتاب ہے قیمت ۱۲ر

افسون:۔ بالکل سچی سرگذشت اور تاریخی فسانہ غدر ۱۸۵۷ء کے واقعہ کی دردناک تصویر قیمت ... عہ

ہاجرہ:۔ ایک دلچسپ اور اعلےٰ درجہ کے ترکی ناول کا ترجمہ قیمت ۸ر

اوٹوپیا:۔ ایک خیالی قوم کی طرز معاشرت وغیرہ کے پیرایہ میں ایک فلاسفر نے اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں مع تصویر ۹۶۔ قیمت ۴ر

بزم اکبری:۔ اسمیں شہنشاہ اکبر اور اسکے جلیل القدر پنجہزاری منصبدار حبیب خاں کے دلچسپ حالات حاکم مالوہ باز بہادر کی شاہزادی روپ مہ کے حسن و عشق کی پُردرد داستان خاقان اکبر کی فتح کشتی سلطان احمدنگر کی تباہی اور دیگر تاریخی واقعات نرالے ڈھنگ سے قلمبند کیے گئے ہیں صفحات ۴۴۰ قیمت ۱۲ر

علمی ادبی اور اخلاقی کتابیں

چمنستان عرب غنچہ حج:۔ قرآن شریف احادیث اور تواریخ سے حج مکہ معظمہ کعبہ مقدسہ مدینۂ منورہ اور عرب کے تاریخی جغرافیائی حالات اس کتاب میں نہایت تفصیل سے درج کیے گئے ہیں ادعیہ حج بھی کتاب میں درج ہیں قیمت .... عہ

اتالیق بی بی:۔ جسمیں عورتوں شوہروں کی بے معنی نکتہ چینی اور بیجا شکایت کا بہت سچا خاکہ دکھلایا گیا ہے قیمت ۸ر

رموز فطرت:۔ علم طبیعات۔ علم طبقات الارض جغرافیہ طبیعی اور ثوابت و سیارے کے ابتدائی اور بنیادی اصول کی تشریح ۸ر

سیر یورپ:۔ ہر ہائینس نازلی رفعیہ سلطان نواب بیگم ریاست جنجیرہ کے سفر یورپ کا روزنامچہ جسمیں تمام واقعات خوبصورتی اور جامعیت کے ساتھ قلمبند کیا ہے ۴۶ عکسی تصاویر شامل ہیں کاغذ و چھپائی نہایت اعلےٰ صفحات ۳۰۶ قسم اول ۲ر قسم دوم ۱۲ر

انقلاب ٹرکی:۔ سلطنت عثمانیہ کے گذشتہ انقلاب اور پارلیمنٹری دور کے آغاز کی ایک مفصل اور جامع تاریخ مؤلفہ منشی عبدالرؤف خاں صاحب ہاتف ... ۸ر

نیشنل ڈراما: ہندو مسلمانوں کی موجودہ حالت پر انکو شرم دلانے کا نیا طریقہ اور تعلیم کی ضرورت کے اظہار کا جدید طرز قیمت ۸ر

السنۂ مشرقیہ:۔ عربی سنسکرت اور فارسی زبان کی دلچسپ تاریخ ہر زبان کی ترقی و تغیر اور زبان کے نمونے نہایت عمدہ تحقیق سے لکھے گئے ہیں قیمت ... ۶ر

خیابان عجم:۔ شعرائے عجم کی سوانحعمریاں اور انکے کلام کا انتخاب مع ترجمہ انگریزی قیمت ... ۱۰ر

زندگانی بینظیر:۔ جسمیں نظیر اکبرآبادی کے حالات و خیالات سے انگریزی اصول تذکرہ نویسی پر تفصیلاً بحث کی گئی ہے مولفہ سید عبدالغفور صاحب شہباز قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالۂ "تمدن" نیا گاؤں۔ لکھنؤ

علمی ادبی اور اخلاقی کتب کا ذخیرہ

اخلاق محمدی :- اس کتاب میں طرز معاشرت ادب مجالس اخلاق کسب معاش ہمت و استقلال ہمدردی حقوق باہمی وغیرہ تمام صفات حسنہ کے متعلق آیات و حدیث جمع کرکے مع اصل و ترجمہ کے طبع کی گئی ہیں علم اخلاق میں اس طرز کی کتاب آجتک طبع نہیں ہوئی مسلمانوں کے لیے اسکا مطالعہ مفید ہے قیمت ہر دو حصہ ۱۲ عار

المدنیۃ والاسلام :- یہ کتاب ایک زبردست مصری فاضل محمد فرید وجدی کی تصنیف ہے ۔ مغربی تعلیم اور مغربی علوم وفنون کی بدولت جو شکوک اور شبہات مذہب کیطرف سے پیدا ہو رہے ہیں اور الحاد و دہریت کا جو سیلاب مغرب کیطرف سے چلا آرہا ہے ۔ اسکے استیصال کے لیے یہ کتاب آب حیات سے کم نہیں ہے قیمت ۱۲ عہ

حکمت عملی :- فلسفۂ علمی پر مبسوط اور جامع کتاب ہے جسمیں افراد انسانی کی روحانی ارتقا کی تدابیر کے ساتھ قومی ترقی اور عزت حاصل کرنے کے اصول بھی بیان کیے ہیں عورتوں کی تعلیم اور حقوق کی نگہداشت کا ذکر بھی موقع بموقع کیا ہے عبارت نہایت دلچسپ ہے لکھائی چھپائی اعلےٰ درجہ کی قیمت .... سے ر

جذبات بھاشا :- بھاشا کے [illegible] قدرتی مناظر کی تصویر کھینچنا اسکے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے خودداری حیا غرور حسن و محبت و جذبات میں ہندی بھاشا کی شاعری کا ستون کھڑا ہے سارے آسمان تشبیہات دلوں میں چٹکیاں سے لیتی ہے جذبات بھاشا میں ملک کے قابل انشاپرداز حضرت نیاز فتحپوری نے ان دوہوں کے معنے بیان کیے ہیں ۱۲ ار

حیات النذیر :- شمس العلما حافظ نذیر احمد صاحب مرحوم ایل ایل ڈی دہلوی کی زندگی کے مفصل حالات قیمت سے ۱۲ مجلد ... ۱۲

حضرت خواجہ حسن نظامی کی کتاب
میلاد نامہ

اگر آپ نے اسے اب تک نہ دیکھا ہو تو جلد طلب فرمالیجیے۔ حقیقت میں اسکے مطالعہ کا یہ سب سے بہتر زمانہ ہے۔ رسول اللہ کا ذکر میلادنامے میں جس شان سے لکھا گیا ہے ویسا اور کہیں نہ ملے گا۔ آنحضرت کے بزرگوں کے حالات سے شروع کیا ہے اور ولادت کا بیان نظم ونثر کی زیبائش سے قلمبند کرکے بچپن جوانی کے کل واقعات قلمبند کیے ہیں پھر تتمہ میں رسالت سے لیکر وفات تک کی کیفیت ہے آخر میں حضور کے اخلاق۔ عادات لباس و طعام کا حال ہے حجم دس جزو قیمت عمر علاوہ محصول۔

انسان :- انسان کی تشریح علمی رنگ میں ۸ ر

آثار خیر :- اسلامی عہد حکومت کے محکمہ پبلک ورک مدرسوں سڑکوں نہروں وغیرہ کے حالات ... عمر

خیالات ممتاز :- جسمیں اہل ہنود کا مذہب اور اسکی حقیقت بودھ مذہب کے بانی کا حال مسیحی و یہودیوں اور آتش پرستوں کے [illegible] اور [illegible] اشاعت تثلیث کا ذکر دہریوں کے [illegible] مادہ و فطرت کے مقابلہ کا بیان اور پاک اسلام اور اسکے بانی کا تذکرہ اور دنیا میں کس قدر مذاہب شائع ہیں اسلام کس قدر جلد پھیلا [illegible] اور [illegible] اللہ نے مذہب کیا [illegible] اور دنیا کو [illegible] سے [illegible] قیمت ۸ ر

تاریخ مذاہب :- اس کتاب میں مذہب کی ابتدا اور ترقی کا حال اور [illegible] مذہب مثلاً [illegible] اور دیگر اقوام و ممالک [illegible] مذہب کی تاریخ [illegible] مجلد [illegible]

ملنے کا پتہ :- منیجر تمدن بک ایجنسی نیا گاؤں لکھنؤ

تمدن
لکھنؤ

ڈاک

چناں میانِ من و یار راہ مسدود است
کہ رسم نامہ و پیغام برطرف شد و رفت

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دنیا میں کتنی مدت سے تحریر و ترقیم کی بنیاد پڑی اور پہلے پہل کیونکر اس کی تحریک ہوئی اگرچہ شروع میں غالباً اشارات اور کنایوں پر ہی کاروبار ہوتی تھی مگر رفتہ رفتہ بجائے اُن اشاروں کے ابجدی یا حروفی اور فقراتی اشارے رکھ لیے گئے۔

شروع شروع ان ابجدی اشاروں کی اشاعت اور عمل سے اکثر انسان تعجب کرتے ہوں گے کیونکہ انسان کی یہ عادت میں داخل ہے کہ وہ شروع شروع میں ہر ایک نئی شے کے دیکھنے سے تعجب کرنے لگتا ہے اگرچہ وہ خود اُس کی خود ساختہ ہی ہوتی ہے۔ تحریر اور ترقیم کی بدولت انسانی کاروبار میں ایک حد تک سہولتیں پیدا ہو گئیں

تو دوسری طرف کچھ دقتیں بھی پیدا ہوئیں۔ دنیا کی ہر چیز دونوں پہلو رکھتی ہے کبھی فطرتاً کوئی شے مفید ہوتی ہے اور استعمالاً مضر اور کبھی استعمالاً مفید اور طبعاً مضر دنیا کی رونق کا یہی ذریعہ ہے اور اسی پر یہ سلسلہ چل رہا ہے تحریر دیکھو کیسی مفید ہے مگر اس کی بدولت بھی دنیا بھر میں جو جو جھگڑے اور تنازعات اس وقت برپا ہیں اُن کا کون شمار کر سکتا ہے اگر تحریر نہ ہوتی تو دنیا کے بہت سے تنازعات ہی نہ ہوتے جب تک اشارات اور زبان پر کاروبار چلتے تھے تب تک تو سہولت اور امن رہا اور جب نوبت بہ تحریر آئی تو وہ بات باقی نہ رہی۔

دلے در سینۂ من بود لیکن ہا
نہ مے دانم چہ شد خوں گشت سرِ یافت

لوگ تہذیب تہذیب کی دُہائی دیتے ہیں جب سلسلۂ تحریر نکلا ہوگا تو اُس وقت بھی چاروں طرف اسی کا شور و غلغلہ ہوگا کون جانتا تھا کہ اس کی بدولت فائدہ کے علاوہ خرابی ہوگی اور حروف و نقاط کے گھیروں میں بھی اس قدر پیچیدگیاں ہوں گی زبان بے اعتبار ہو جاوے گی قول صداقت سے دور جا پڑیں گے قلم اور کاغذ یا چند حروف و الفاظ یا فقرات پر اعتبار کیا جائے گا۔ زبانی باتیں آئی گئی ہوا کی ہی رکھیں گی۔

دوسری طرف

تحریر کی بدولت بیسیوں علوم و فنون کی بنیاد بھی رکھی گئی اگر تحریر نہ ہوتی تو حافظہ کس قدر کام دے سکتا یہ تحریر ہی کا صدقہ ہے کہ آج صدیوں کی باتیں جوں کی توں ثابت اور زندہ ہیں تاریخ تحریر ہی کی بدولت رونق بازار واقعات ہے اور تذکرات ترقیم ہی کی وجہ سے موجب ثبات عالم و عالمیاں ہیں مذاہب باوجود تحریر میں آنے کے بھی اسقدر اختلاف رکھتے ہیں فلسفۂ ترقیمی کا پہلو بھی کسی کل نہیں بیٹھتا

اگر یہ سب سلسلہ زبانی ہی ہوتا تو کچھ اور ہی سماں ہوتا لیکن ذرا دوسرا رخ بھی دیکھو اگر تحریر کا ایک رخ اس قدر مفید ہے تو دوسری طرف مضر بھی ثابت ہو رہا ہے یہ تاریخ ہی ہے جس کی بدولت اس تہذیب کے زمانہ میں بھی قومیں چھری کٹاری ہو رہی ہیں یا دہقاں کے جوش اور ولے میں دن بدن بے دی ہو رہی ہے اگر آج یہ تاریخی فسانے مٹ جائیں تو دنیا کا رنگ ہی کچھ اور ہو جائے یہ تاریخ اور تحریر ہی کا صدقہ یا اثر ہے کہ آج لوگ آپس میں باوجود زندہ انسان ہونے کے مردوں پر لڑ رہے ہیں ذرا وحشی لوگوں میں جا کر دیکھو جہاں زبان ہی زبان ہے تحریر کا نام نہیں حروف و الفاظ کا نشان نہیں جو بات منھ اور زبان سے کہی وہی پتھر کی لکیر ہوگئی نہ سیاہی نہ دوات نہ کاغذ وہی الفاظ اور وہی فقرات جو منھ اور زبان سے نکل کر ہوا میں اڑ گئے اخیر تک ثابت اور قائم رہتے ہیں نہ کہ تحریر کی طرح کہ باوجود ایک قسم کی پابندی کے بھی موجب کلفت ثابت ہوتے ہیں تو تو تاویلیں کی جاتی ہیں الفاظ اول تو لکھتے ہی سوچ سمجھ کر ہیں بعد میں مفہوم قرار دیتے ہیں تو تو تاویلیں اور تعبیریں ہوتی ہیں ابتدائی عدالتوں میں بحث ہو کر ان کا کوئی نہ کوئی مفہوم قرار دیا جاتا ہے اور علاوہ اپیل پر وہی لفظ کچھ اور معانی پیدا کر لیتے ہیں قطع نظر ان کہانیوں کے دیکھنا چاہیے کہ تحریر کیا ہے۔

ایک یادداشت غم و غصہ خوشی و فرحت کی۔
ایک پیشین گوئی مختلف حالات کی۔
ایک خوش خوئی یا ایک بدخوئی۔
ایک لذیذ مسیح یا ایک تنغص
ایک کامرانی یا ایک ناکامی۔

آؤ ہم ذرا اڈاکیہ کے تھیلے کا تماشا دکھائیں صبح ہی صبح ہر ڈاکیہ گلی بہ گلی

کوچہ بہ کوچہ منزل بہ منزل کوٹھی بہ کوٹھی کمرہ بہ کمرہ اور بازار بہ بازار بیگ میں لوگوں کی قسمتیں بند کرکے لیے پھرتا ہے گو خود اُسے اُن قسمتوں کی کیفیت کا علم نہیں ہوتا مگر ہزاروں کی قسمتیں اُس کی بغل میں ہوتی ہیں ہزاروں خوش خبریاں دیتا ہے اور ہزاروں ہی غم و اندوہ بھی روز تقسیم کرتا ہے ایک چھوٹے سے بیگ میں اسقدر درد مختلف قسمتوں کا بند ہوتا ہے کہ سوچنے والوں کے واسطے ایک عجب قسم کا تماشا رکھتا ہے۔کون جانتا ہے کہ ڈاکیہ کس کس کی قسمتیں اُٹھائے پھرتا ہے اور بیگ میں کس کس کا نصیبہ بند ہے اور اُس کے نکلنے سے گلی کوچوں میں کیا کچھ ہجوم مسرت اور ہجوم غموم ہوگا۔

آں شوخ ز دلہا چہ خبر داشتہ باشد
طفل است ز دنیا چہ خبر داشتہ باشد

اے بیگ یہ تیرا ہی حوصلہ اور تیرا ہی ہاضمہ ہے کہ اسقدر لوگوں کی قسمتیں اور فرحت و غم اُٹھائے پھرتا ہے۔ڈاکیہ کی بغل پھٹ کیوں نہیں جاتی ڈاکیہ کے دل پر کیوں کوئی اثر نہیں ہوتا ڈاکیہ کس حوصلہ سے یہ بار اغیار اُٹھائے پھرتا ہے۔وہ دیکھو ڈاکیہ بیگ کھول کر ایک گھر والے کو خط دے رہا ہے ابھی وہ چند قدم بھی نہ گیا ہوگا کہ گھر میں ایک کہرام مچ گیا لوگ رفتہ رفتہ جمع ہوتے جاتے ہیں کوٹھوں پر عورتیں آرہی ہیں۔کوئی ڈاکیہ سے پوچھے جاتے جاتے یہ کیا آگ لگا چلے ہو پُرزہ کاغذ کیا دیا ایک آفت برپا کردی ڈاکیہ چونکہ روز ایسے ہی تماشے دیکھتا ہے اس واسطے مُڑ کر دیکھتا بھی نہیں پوچھنا تو جدا رہا کہ خط میں کیا بارود بھری تھی جو یہ کہرام مچ گیا پڑھتے یا پڑھاتے ہی بارود سے اُڑی۔

چار قدم پرہی جاکر کسی دوسرے کو ایک اور خط نکال کر تھیلے سے دیتا ہے پڑھنے والے کی پڑھتے ہی باچھیں کھل جاتی ہیں چہرہ لال ہوجاتا ہے اور آنکھیں روشن

زور سے آواز دیتا ہے لو خدا کے فضل سے لڑکا با تعریف پاس ہو گیا مراد بر آئی یہ سُن کر ڈاکیہ بھی انعام کی خاطر لوٹ آتا ہے اور مبارکباد دیتا ہے ۲ر ۸ر لے کر چلتا ہوتا ہے۔ ڈاکیہ بھی خوشی کا سماں دیکھ کر مزا آیا سچ ہے غم کا کوئی شریک نہیں۔

نالہ ام آں سنگ دل ہرگز نخواہد کرد گوش
درد اکہ صدرہ می دہد تقصیر آواز مرا

سامنے ایک بڑے پیٹ یا بڑی توند والا کوئی مارواڑی دوکان دار کھڑا ہے چہرہ کہہ رہا ہے کہ کسی تار یا کسی خط کے انتظار میں ہے ڈاکیہ دیکھتے ہی لالہ جی کو خط نکال کر دیتا ہے لالہ جی شوق سے خط (وا چھتے) پڑھتے ہیں۔ ہاتھ سے خط گر پڑتا ہے اور لالہ جی کی توند نرم پڑ جاتی ہے شاگرد پوچھتا ہے کیوں خیر تو ہے۔ ایک آہ بھر کر لالہ جی فرماتے ہیں ہینگ کا نرخ ارزاں ہو گیا ہزاروں پر پانی پڑ گیا سال بھر کی کمائی تباہ ہو گئی ڈاکیہ یہ الفاظ سُنتے ہی رفو چکر ہوتا ہے وہ روز ایسے تماشے اور سانحات دیکھتا ہے کس کس کے دروازے پر آوے اور کس کس سے ہمدردی کرے ایک ہو تو کچھ کرے بھی یہاں تو تھیلہ ہی ایسی خبروں سے بھرا ہے

ہر سو کہ رو نہادیم در دشت او فتادیم
دنیا برائے ما شد دارالمحن سراپا

سامنے ایک رکوٹھی دار کھڑے ہیں ڈاکیہ کارڈ پکڑا کر آہستہ آہستہ چلا جاتا ہے کوٹھی دار بلا کر کارڈ پڑھواتا ہے ڈاکیہ سُناتا ہے مہاراج چیف کورٹ سے مقدمہ جیتا گیا پوری ڈگری ہو گئی کوٹھی دار خوشی سے ایک اٹھنی ڈاکیہ کے ہاتھ پر رکھ کر خود اچھلتا کودتا دکان کے اندر جا کر تھوڑے پیسے نکال کر نوکروں چاکروں کی مٹھی گرم کرتا ہے۔

اگلی گلی میں ایک بڑھیا کھڑی ہے پیارے بچّے کے خط کا انتظار دیکھ رہی ہے ڈاکیہ غور سے تھیلہ دیکھ کر کہتا ہے آج کوئی تمھارا خط نہیں آیا ہے غریب بڑھیا سا مُنھ لے کر واپس جاتی ہے۔

اب حلقہ نمبر (۲) آجاتا ہے یہاں صاحب لوگوں کی کوٹھیاں ہیں ولایتی ڈاک کا انتظار ہو رہا ہے ڈاکیہ ایک خط ایڈنبرا سے چلا ہوا میم صاحبہ کو دیتا ہے ولایت کا خط دیکھکر میم صاحبہ مارے خوشی کے پھولی نہیں سماتیں وطن مالوفہ کی خوشی بشرہ سے ٹپک رہی ہے دوڑکر اندر کمرہ کے چلی جاتی ہیں اور غور سے پڑھنے لگتی ہیں وطن کی لگن بھی عجب شے ہے۔

دوسری کوٹھی میں ایک صاحب بہادر کو جو خوشی خوشی اپنے پائیں باغ میں مع اپنی میم صاحبہ کے سیر گشت لگا رہے ہیں ایک سرکاری لفافہ دیدیتا ہے صاحب بہادر غور سے پڑھتے ہیں کہ پڑھتے ہی بشرہ ذرا بدلا اور رنگ میں کچھ تبدیلی سی ہوئی میم صاحبہ نے پوچھا کیا بات ہے مُنھ سے بولے ہمارا بدلی ہوگیا نہ باغ یاد رہا اور نہ سینری۔

ٹِھہ پَوے اِداۓ نوکری اِجّی پَراۓ دس - (پنجابی)

(پرائی نوکری پر افسوس دل دوسرے کے ہاتھ ہی میں رہتا ہے) صاحب بہادر ڈاکیہ کو ذرا گھور کر دیکھتے ہیں بھلا اس میں غریب ڈاکیہ کا کیا قصور اُسے کیا خبر کہ اس لفافہ میں کیا بند ہے اور کیا مضمون رکھتا ہے۔ راستہ میں ایک غریب پھٹے پرانے کپڑے پہنے دم یاس کا پڑھتا آہستہ آہستہ آرہا ہے ڈاکیہ کو دیکھکر بلند آواز سے میرا بھی کوئی خط ہے کہتا ہے۔ اُسکے ساتھ ایک دوسرا آدمی بھی بول اُٹھا اگر میرا ہو تو مجھے بھی دے دو۔

ڈاکیہ آہستگی سے ایک کا خط نکال کر دیتا ہے اور دوسرے کو جواب دیتا ہے

وہ آدمی خط کھول کر پڑھتا ہے اُس میں لکھا ہے کہ

نمبر دس ہزار دو سو چودہ میں تمہارے نام پر ایک لاکھ ؏ ہزار کی لاٹری نکلی ہے۔

مکتوب الیہ شادی مرگ ہو جاتا ہے دوسرا آدمی بھی لاٹری ڈال چکا تھا اپنے نام پر کوئی اطلاع نہ پاکر یہ کہتے ہوئے جلدی جلدی سینہٴ بریاں پر ٹھنڈا ہاتھ رکھ کر رخصت ہوتا ہے قسمت کے کھیل ہیں آخر جُوا جُوا ہے۔ اچھے بچے گناہ تو نہ ہوا۔ مال حرام کبھی رہ نہیں سکتا

دیکھو ایک ہی وقت ایک ہی تھیلے ہیں سے دو قسمتیں کس رنگ اور روپ کی نکلی ہیں اور دونوں کا حشر کیسا مختلف ہوا ہے۔ ناکامیاب یہ کہتا ہوا رخصت ہوتا ہے

ترا کہ گفت کہ مائل بہ بوستاں باشی
بنوش یک دو سہ جامے و خود گلستاں باشی

اور دوسرا بہ لبِ سوزاں یہ کہتا ہوا سر پر کپڑا رکھ گزر جاتا ہے۔

منزل بہ کوئے سوختہ جاناں خریدہ ایم
مارا بجائے مُہر بود بر قبالہ داغ

عالم و عالمیان کی دورنگی کا یہ حال ہے اور یہ ہے کیفیت طالع روشن اور طالع واژگوں کی۔

آگے کی دُکاں پر ڈاکیہ ایک نیلا لفافہ دیتا ہے جو کسی قدر وزنی ہے مکتوب الیہ لپک کر لے لیتا ہے کسی مطلوب کی چٹھی ہے پڑھتا ہے اور ہنستا ہے اور ساتھ ہی ٹہلتا بھی جاتا ہے غریب کا سارا دن اُسی میں گزر گیا۔

چرا بیاد تغافل کنند خوش چشماں بہ مشتاقے
کہ با صد آرزو چشم تماشا از شما دارد

تھوڑی دیر کے بعد ایک گھبرایا ہوا شخص آتا اور پوچھتا ہے کیوں جی کوئی میرا خط اور تار بھی ہے ڈاکیہ ایک تار نکال کر دیتا ہے مکتوب الیہ پڑھتے ہی خوش خوش دوڑ جاتا ہے کیونکہ اُس میں یہ خبر تھی کہ اس کا بھائی جو ولایت کے سفر میں تھا پرسوں بمبئی بندر پر اُترے گا۔

ڈاکیہ مٹھائی مانگتا ہے وہ حضرت ہیں کہ جواب ہی نہیں دیتے ہاتھ سے کچھ اشارہ کرتے جاتے ہیں شاید جس کا مطلب یہ ہے کہ پھر سہی۔

ہست تا صاف مشام طلب ما ورنہ
بوے یار از در و دیوار شنیدن دارد

اب بیگ خالی ہوتا جاتا ہے چٹھیاں جتنی تھیں سب بٹ چکیں دو تین ایسی چٹھیاں بھی نکلیں جن کا کوئی مکتوب الیہ نہیں ملتا ڈاکیہ پوچھ گچھ کے بعد نشان کرکے تھیلے میں رکھ لیتا ہے اور کچھ سبزی ترکاری خرید کر فراغت پا کر گھر کی راہ لیتا ہے اسقدر تماشے خوشی و غم کے دیکھ کر اپنے گھر میں دم بھر آرام لیتا ہے۔ جتنے غم اور مسرتیں تھیں سب کو اپنے گھر کے دروازہ کے باہر چھوڑ آیا گھر میں داخل ہو کر سب قضیے تقسیم سے پاک تھے تھیلہ بھی خالی پڑا تھا۔ اور اپنا حافظہ بھی کوئی کیفیت یاد نہ رکھ سکا تھیلہ بزبان حال کہہ رہا تھا ایک بار تو پوری کر آیا ہوں اب دوسرے وقت کی ڈاک نہ جانے مجھ میں کیا کچھ بھر جاوے اور خدا جانے وہ کس قماش کی ہو اور اس میں کیا کچھ بھرا ہو۔

جسم بے جا لم زندانی گریہ شد آید مرا
کیسہ دل در دمند غم کا ہی گریہ می آید مرا

ڈاکیہ دن بھر کا تھکا ماندہ تھوڑی دیر کو دو گھنٹہ سو رہتا ہے خراٹے مارنے لگتا ہے خود بدولت سوتے ہیں اور یہ خبر نہیں کہ دم کے دم میں کتنے گھروں میں

آگ لگا آئے ہیں اور کتنے گھروں کی آگ بجھا بھی آئے ہیں۔

گاہے بہ فرق گہہ بہ قدم کردہ ایم سعی

راہ بہر طریق بہ پیمودہ ایم ما

ڈاکیہ غریب کا کیا گناہ وہ جانتا ہی نہیں کہ خط میں کیا کچھ نہاں ہو کر آیا ہے اور اُن کی کیا کچھ کیفیت ہے وہ عالم الغیب تو نہیں کہ لفافوں کے اندر کی تحریر بھی سمجھ لے اور اگر لفافہ کھولتا ہے تو جرم میں پھنستا ہے پیغام کی خوبی اور مضرت پیغام رسان کے ذمہ نہیں رہتی ہے پیغام رسان کا کیا ذمہ اور کیا کفالت ہے اگر ڈاکیہ کا کوئی ذمہ ہے تو یہ کہ وقت پر چٹھی پہنچا دیوے یہ تو لوگوں کا اپنا کام ہے کہ اچھی چٹھیاں لے لیا کریں اور بُری نہ لیں مگر اُن سے بھی یہ کیونکر ہو سکتا ہے لفافہ کیا ہے ایک قسمت سربستہ۔

اسی طرح قدرتی ڈاک رسان بھی لوگوں کی قسمتیں تقسیم کرتے رہتے ہیں اُن کے لفافوں میں بھی بُری بھلی قسمتیں نہاں ہوتی ہیں وہ بھی بعض گھروں میں آگ لگاتے ہیں اور بعض میں پانی چھڑکتے ہیں لوگ تقدیر اور قسمت سے انکار کرتے ہیں یہ ڈاکخانہ کا ڈاکیہ راز قسمت ہی کا تو سودا کرتا پھرتا ہے یہ بھی تو ایک تقدیر ہی ہے اور ایک نصیب یا قسمت اور کیا ہوتی ہے اس کا رنگ و روپ تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

جب ہم یہاں کی چٹھیوں کے اثرات کو روک نہیں سکتے تو کس طرح قدرتی چٹھیوں کے اثرات سے بچ سکتے ہیں جس طرح ڈاکیہ ایک بُری بھلی چٹھی ہاتھ میں دے کر رخصت ہو جاتا ہے اسی طرح قدرت کے ڈاکیے بھی تقسیم کر کے رخصت ہو جاتے ہیں اُن کا اسی قدر کام ہے فرق صرف اسقدر ہے کہ یہ ڈاکیے نظر آ جاتے ہیں اور اُن کی تشخیص نہیں کی جا سکتی اگرچہ وہ بھی ایک طرح سے نظر آ جاتے ہیں مگر اُن کا نام ذرا مشکل سے لیا جاتا ہے۔

ایک ڈاک خانہ خود انسان کی طبیعت میں ہی کھلا ہوا ہے ہر روز کیا ہر لمحہ اس میں ڈاک آتی اور جاتی ہے خیالات کا تموج اور تصورات کا سلسلہ ایک ڈاک رسانی ہے ہم ہر گھڑی چٹھیاں لیتے بھی ہیں اور چٹھیاں اس ڈاک خانہ میں ڈالتے بھی ہیں نری چٹھیاں ہی نہیں آتی جاتیں سلسلۂ تار بھی کھلا ہے ہزاروں کوس تک ایک ہی سکنڈ میں خبر رسانی ہوتی رہتی ہے اور بیچ میں کوئی روک نہیں نہ کسی مصالحہ کی ضرورت ہے اور نہ کسی سامان وغیرہ کی اس میں وائرلیس سے بھی زیادہ تیزی سے آمد و رفت رہتی ہے۔

خوشی کی خبریں بھی آتی ہیں اور غم کی بھی مسرت افزا بھی اور مسرت کش بھی ان میں سے بعض خبریں یقینی ہوتی ہیں اور بعض غلط سلط بھی اس ڈاک خانہ کی خبریں دل و دماغ پر ایک خصوصیت سے اثر کرتی ہیں اور اُن کی فرداً فرداً تقسیم بھی ہوتی ہے ڈاکیۂ خیال ایسا تیز رفتار ہوتا ہے کہ بغیر کسی تردد اور تامل کے صبح سے لے کر شام تک اور شام سے لے کر صبح تک کام میں مصروف رہتا ہے۔ ڈاکیۂ ڈاک تو آرام بھی کر لیتا ہے لیکن ڈاکیۂ خیال بیداری اور خواب دونوں میں تقسیم میں لگا رہتا ہے۔

تعجب ہے کہ لوگ معمولی ڈاکیہ کے تو انتظار میں رہتے ہیں اور اس کی تقسیم کی ہوئی چٹھیاں تو تامل اور محبت سے پڑھتے ہیں اور خیال کا ڈاکیہ جو کچھ منٹ بہ منٹ شب و روز تقسیم کر رہا ہے بعض دفعہ اُس طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے حالانکہ یہ ڈاک بھی ایک لازمی ڈاک ہے اور اسی ڈاک پر زندگی کا دار و مدار اور یہی ڈاک دوسری ڈاک کی موجد اور مفسر ہے۔

جو لوگ اس ڈاک کی چٹھیاں پڑھتے ہیں وہ اُن ممالک کی رفتہ رفتہ خبریں پانے لگتے ہیں جو ممالک اس دنیا کے ممالک سے نیلے اوجھل اور دوسرے رنگ کے ہیں یہاں کی ڈاک یہیں ختم ہو جاتی ہے اور وجدانی ڈاک وجدانی رنگ میں دوسری زندگی میں بھی برابر جاری رہے گی اُس کا سلسلہ یہاں سے شروع ہو کر دور تک جاتا ہے۔

ہر منظر قدرت بجائے خود ایک ڈاکیہ ہے ہر منظر ہر گھڑی ایک ایک چٹھی دیتا ہے جس کا مضمون بہت ہی پُرلطف اور جدید ہوتا ہے۔ ان چٹھیوں کو پڑھنا خود کو ان مناظر قدرت سے آشنا بناتا ہے اور اُن سے آشنا ہونا خود کو رموز قدرت سے واقف کرتا ہے اور رموز قدرت سے واقفیت پیدا کرنا علوم وفنون کی بنیاد رکھنا ہے اور علوم وفنون کاروباری زندگی اور تیز معادی زندگی کا سہارا اور جزو اعظم ہیں۔

اگرچہ اس مادی ڈاک میں بھی مختلف قسم کی چٹھیاں آتی ہیں اور اُس کا سلسلہ بھی ایک حیرت افزا وسعت رکھتا ہے مگر قدرتی ڈاک کا سلسلہ جو وسعت اور جو تحیر رکھتا ہے وہ کچھ اور ہی سماں ہے اور وہی سماں دراصل ایک سماں ہے۔

ما طول و عرض قصۂ خود را نہ دادہ ایم
ایں یک دو سطر خدمت جاناں کنیم عرض

سلطان احمد

غزل

مائل جور اگر وہ بت بے پیر نہیں — میں یہ سمجھوں گا مرے عشق میں تاثیر نہیں
شیون صبح نہیں نالۂ شبگیر نہیں — کیا غضب ہے کہ ترا عشق گلوگیر نہیں
بن گیا شہر خموشاں ہے یہ زندان جنون — یعنے پُرشور ترے حسن کی تاثیر نہیں
سر وہ کیا سر ہے کہ جسمیں نہیں تیرا سودا — دل وہ کیا دل جو ترے عشق کا نخچیر نہیں
چھیڑتی ہے مری وحشت یہ مجھے کہہ کہہ کر — خانۂ عیش ہے یہ خانۂ زنجیر نہیں
دعوت درد تمہیں دیتی ہے اے اہل جنوں — سنبھل تو یہ صدائے لب زنجیر نہیں
کہتے ہیں شامل تقدیر ہے تدبیر۔ مگر — اپنی تقدیر تو شرمندۂ تدبیر نہیں
کیسے سلجھائے مرے عقدۂ تقدیر کو وہ — آپ کا تھا نہ مرا ناخن تدبیر نہیں

خاموشی موت ہے تاراج چمن پر انجم
میں سراپا ہوں زباں بلبل تصویر نہیں

حکیم مظفر حسین انجم دہلوی

علّت و معلول

یہ مسئلہ متنازعہ فیہ ہے کہ موجوداتِ عالم کی کسی شے پر ہستی کا اطلاق ہو سکتا ہے یا نہیں کیونکہ ہر مادی شے کے اجزا ایک دوسرے میں منتقل ہو کر قائم رہتے ہیں۔

مگر یہ امر مسلّمہ ہے کہ ہر ایک ہستی ایک وقت معینہ تک اپنی اصلی ہیئت میں برقرار رہتی ہے اور بعد ازاں زمانہ اسکو فنا کر دیتا ہے۔ دنیا عالم اسباب ہے اور اس کی ہر شے قانون فطرت کے تابع ہے کوئی تبدیل یا تغیر بلا سبب وقوع پذیر نہیں ہوتا۔ یا بالفاظِ دیگر اس کی کوئی نہ کوئی علت ہوتی ہے۔ موجودات عالم کی طرح افعال انسانی پر بھی یہی قانون حاوی ہے۔ اگر بنظر تعمق دیکھا جائے تو علت و معلول کا مسئلہ ہی فلسفۂ اخلاق کی بنا ہے۔ انسان کی ادنیٰ لغزشیں اسکو قعر مذلت میں گرا دیتی ہیں اور بعض اوقات اُسکی ہلاکت کا موجب بن جاتی ہیں۔ علت و معلول کی زنجیر کی کڑیاں کچھ ایسی بے ربط و غیر مسلسل ہوتی ہیں کہ ان کو دیکھ کر عقل انسانی متحیر ہو جاتی ہے۔ نہ آغاز سے انجام کا پتہ چلتا ہے نہ انجام آغاز کا سُراغ لگا سکتا ہے یہ عجز ادراک انسانی کی کمزوری کی بین دلیل ہے۔

علم التواریخ و دیگر قسم کے دوسرے علوم صرف اسی لیے وضع کیے گئے ہیں کہ عقل انسانی کو علت و معلول کی محیر العقول داستانیں ازبر ہو جائیں اور وہ ان سے سبق حاصل کر کے اس اہم مسئلہ کا کلیہ قائم کر سکے۔ تاریخی واقعات اعادہ کرتے رہتے ہیں یعنی جن اسباب نے مل کر کبھی کوئی خاص نتیجہ مرتب کیا ہے اگر وہی اسباب پھر پیدا ہو جائیں تو یقینی وہی نتیجہ پیدا کریں گے۔ غرضیکہ علت و معلول کی زلف برہم سلجھانے کے لیے انسان کو مختلف علوم کے شاندار اشتغال کرنے پڑے مگر نہ اس کی گرہ کھل سکی اور نہ اس کی

طولانی پر عبور ہو سکا۔

(۱) ہوا کا جھونکا چلتا ہے۔ بخارات کے منتشر اجزا مخلوط ہو ہو کر ابر کی صورت میں نمایاں ہو جاتے ہیں۔ آتشگیر مادے برق تاباں بن کر جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ بخارات کے اجزا کا اتصال ابر کی سفیدی کو سیاہی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جب ان کی جسامت ہوا کے اجزا کی قد و قامت اور قوت تحمل سے بڑھ جاتی ہے تو یہ طفلِ شیر خوار کی طرح گہوارۂ سماوی سے نکل کر مادر گیتی کے آغوش میں پناہ گزین ہونے لگتے ہیں زمین انکے استقبال کے لیے فرشِ راہ ہو جاتی ہے۔ شاخیں ان کے خیر مقدم میں آغوش کشا نظر آتی ہیں۔ آب باراں نازنینانِ چمن کو جامۂ عروسی پہناتا ہے اور عالم نباتات کی روح رواں بن کر ذی روح ہستیوں کا کفیل ہوتا ہے۔ صدفِ تشنہ لب کی سیری بحر ذخار سے نہیں ہوتی مگر اس پانی کی ایک بوند سے ہو جاتی ہے جو اس کے دہن میں جا کر ایک ناچیز قطرے سے دُر نایاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ پھر پانی کی بوند صدف کی ہلاکت کا موجب ہوتی ہے۔ صدف کا سینہ چاک ہو جاتا ہے اور خود غرض غواص کے ہاتھ گوہر مقصود آتا ہے۔ یہ گوہر رفتہ رفتہ جوہریوں کے ہاتھ فروخت ہو کر ایوان شاہی تک باریاب ہوتا ہے۔ اور تاج خسروی میں آویزاں ہو کر اس کی زینت اور منزلت کو دو بالا کر دیتا ہے۔ ان تمام معلولوں کی علت صرف ایک ہوا کا جھونکا ہے۔

(۲) تخم کو لیجیے۔ باغبان اس کو قطعۂ زمین میں بوتا ہے۔ آفتاب کی حدت زمین کی تری اور باغبان کے تحفظ و آبیاری سے اس میں نشو و نما شروع ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ پودا اور پھر پودے سے درخت بن جاتا ہے موسم بہار میں کلیاں آتی ہیں پھول کھلتے ہیں جن کی نکہت جانفزائے نکس کا دماغ معطر ہو جاتا ہے وہ اس پھول کی جستجو میں دور دراز کی مسافت طے کرتی ہے۔ اپنے لبوں سے اسکے بوسے

لیتی ہے اور اس کی شیرینی کو بحفاظت اپنے خزانے میں جمع کرتی جاتی ہے۔ خودغرض انسان آتا ہے اور مگس کو فنا کرکے اسکے خزانے پر قابض ہو جاتا ہے۔ شیرینی گُل یعنی شہد کو عطاروں کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے جس کے استعمال سے ہزارہا مریض شفا پاتے ہیں۔ پھر مگس کے خزانے کے در و دیوار کو منہدم کرکے موم کی صورت میں بیچ کر ڈالتا ہے۔ یہ موم شمع بن کر رونق محفل کا باعث اور ہلاکت پروانہ کا سبب بن جاتا ہے ان سب معلولوں کی علت صرف تخم ہی کو قرار دے سکتے ہیں۔

(۳) دُخانی کلوں کی ایجاد کا موجب دیگچی کے سرپوش کی جنبش تھی جو اُبلتے ہوئے پانی کے بخارات سے پیدا ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ انسان نے اس شعبہ میں اسقدر ترقی کی کہ طیارے تک ایجاد کرنے لگا پس اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ دیگچی کے سرپوش کی حرکت نے انسان کو بام فلک تک پہنچا دیا۔

(۴) دہقان ہل چلا رہا تھا یکایک بیل کی ٹھوکر لگی۔ غور سے دیکھا تو مٹی کا ایک تودۂ درخشاں دکھائی دیا اس نااہل نے اس کی قدر نہ کی مگر اہل نظر کے ہاتھوں میں پہنچکر وہ کوہ نور کے نام سے موسوم ہوا۔ اس پتھر کے ٹکڑے نے سلطنتوں میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس کی وجہ سے بیشمار خونریزیاں عمل میں آئیں، اسکی طلب نادرشاہ کو فارس سے کھینچ کر ہندوستاں میں لائی۔ یہ کوہ نور سلطنت فارس کے خزانے کی رونق رہا۔ اور آج برطانیہ عظمیٰ کے بیش بہا تاج کی زینت بنا ہوا ہے۔ ان معلولوں کی علت صرف بیل کی ٹھوکر ہی ہو سکتی ہے۔

(۵) حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو آتش کی جستجو کوہ سینا تک کشاں کشاں لے گئی تھی مگر وہ وہاں سے پیغمبر خدا ہو کر لوٹے۔

یہ اور اس قسم کے واقعات روزانہ ہمارے مشاہدے میں آتے رہتے ہیں۔ علت کی نوعیت اگرچہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور بظاہر نہایت معمولی معلوم ہوتی ہے

مگر اس کا معلول عبرت و بصیرت کی ایک بولتی تصویر بن کر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ قتل و خودکشی کی علتیں ایسی معمولی نظر آتی ہیں کہ ایک خالی الذہن شخص یکبارگی ان کو باور نہیں کر سکتا۔ موجودہ جنگ یورپ ہی پر نظر ڈالیے اسکی علت محض ایک انسان کا قتل ہے۔ اور یہ ایک ایسا معمولی واقعہ ہے کہ تقریباً ہر گوشۂ عالم میں اسکی مثالیں ملتی رہی ہیں۔ اگرچہ معلول کی زنجیر ہنوز نا تمام ہے تاہم اب تک جس قدر اس کی کڑیاں فراہم ہوئی ہیں ان کی بنا پر بوثوق کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت تک متعدد سلطنتیں نیست ہو چکی ہیں۔ اور اس جنگ عالمگیر کی وجہ سے اب تک جو کچھ دنیا کو جانی اور مالی نقصان پہنچا ہے اس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔

دنیا کی ہر سلطنت کے خزانے کا بیشتر حصہ علت و معلول کے مسائل کے طے کرنے میں خرچ ہوتا ہے کسی محکمہ پر غور کیجیے بالآخر اس کی بنیاد اسی مسئلہ پر ہوگی۔ چوکیدار سے دارالامراء کے عہدہ دار تک رات دن اسی سلسلہ کی جستجو میں غلطان و پیچاں نظر آتے ہیں۔

محمود اسرائیلی

غزل

زخم مسرت پہ تبسم نمک افشاں ہو جائے
دل افسردہ مرا رشک گلستاں ہو جائے

میری جمعیت خاطر کا تو ساماں ہو جائے
زلف گر آپ کی ہوتی ہے پریشاں ہو جائے

ثمرۂ یار کہ ہے راحت جاں غیروں کو
ہائے وہ میرے جگر کے لیے پیکاں ہو جائے

یاد میں تیری ہو آغوش کشا دست طلب
اور مری چشم تصور سے وہ پنہاں ہو جائے

شکوۂ جور بھی کرتے ہوئے ڈرتا ہوں میں
کہیں ایسا نہ ہو وہ سن کے پشیماں ہو جائے

خانۂ دل سے نکل کر کبھی اس کی تصویر
دیدۂ شوق میں بھی آ کے نمایاں ہو جائے

قتلگہ میں نظر آجائے گلستاں کی بہار
خون عشاق سے رنگیں ترا داماں ہو جائے

گر یہی مشق سخن ہے تو کسی دن محمود
کیا تعجب ہے کہ تو صاحب دیواں ہو جائے

محمود اسرائیلی

لکھنے کی ابتدا

لکھنا اظہار مافی الضمیر کا ایک ایسا زبردست وسیلہ ہے جس کے واسطے سے انسان نے جہالت کی قید سے رہائی پاکر تمدن کے وسیع اور پرتکلف میدان میں قدم رکھا ہے اور علم و عمل کے خوشنما، دلفریب اور ہرے بھرے باغوں کی سیر کرنا نصیب ہوئی ہے۔ ہزاروں برس پہلے کی قوموں کے حالات اُن کے وجود کے متعلق معلومات اُن کی تعجب خیز طرز معاشرت و معیشت، اُن کے ایجادات و اختراعات کی کیفیات جو صفحۂ دنیا پر آباد رہ کر بے نام و نشان اور معدوم ہو چکی ہیں، ہمیں لکھنے کی بدولت حاصل ہوئی ہیں۔

لکھنا نہ ہوتا تو انسان کا علم بہت کم، بالکل ہی ناکافی، اور محدود ہوتا۔ اور تہذیب و شائستگی اخلاق و عادات میں ذرا سی بھی خوبی اور ترقی نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔ یہ بھی خبر نہ ہوتی کہ موجودہ وقت سے پیشتر کے واقعات اور حالات کیا ہیں، اور کیا کیا سانحات اور حادثات گزر چکے ہیں نہ وہ اُن خوبیوں، نیکیوں اور اوصاف کا مالک ہو سکتا تھا، جو اُس کے جد و آبا میں موجود تھیں اور نہ وہ اُن افعال، اعمال، حرکات سکنات سے محترز رہ سکتا تھا جن کو اُس کے بزرگوں نے برا سمجھ کر ترک کر دیا تھا۔

لکھنا نہ ہوتا تو ایک شخص کی تجربہ کی ہوئی بات سے محدود سے چند لوگوں کے سوا اُس کے زمانہ کے آدمی، اور آنے والی نسلیں مستفید نہیں ہو سکتی تھیں ... اور مختصر یہ کہ دنیا میں روحانی اور مادی پہلو سے جو دلچسپ سماں آج ہمیں نظر آرہا ہے وہ کبھی نہ دکھائی دیتا۔ ایک یورپی مصنف کتابوں کی تعریف و توصیف میں اس طرح رطب اللسان ہے
میرے مکان کے ایک کونے میں کتابیں رکھی ہیں، جو بہت نادر و نایاب، اور

عجیب و غریب ہیں۔ اور جو سب کی سب میری ہی ملکیت ہیں۔ ان کی غرابت اُس مشہور پیالے سے زیادہ ہے جس کا ذکر کتاب الف لیلہ میں کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ یہ کتابیں نہ صرف مجھے سارے جہان کی سیر کرا دیتی ہیں، بلکہ گزشتہ زمانوں اور قرن ہائے قدیم کے مناظر حکایات اور واقعات کا لطف بھی بہم پہنچاتی ہیں۔ میں کتابوں کے ذریعہ قدیم زمانہ کے بزرگوں جواں مردوں کو اپنی نظر سے مجسم دیکھ سکتا ہوں گویا اتنی مدت گزرنے کے بعد بھی وہ زندہ ہیں اور میرے سامنے کھڑے ہیں۔ میں کتابوں کو اپنے حظِ نفس اور تفریحِ طبع کے لیے کھول سکتا ہوں اور اس لیے بھی کہ انسان کے بہت زیادہ مشہور و معروف بہتر و برتر زبردست نیک اور عمدہ کاموں اور کارناموں کے کرنے، اور اُن کا اعادہ کرنے کی کوشش کروں کبھی شعرا میرے سامنے دیوانوں کو پڑھتے نظر آتے ہیں، کبھی فصیح و بلیغ صاحب اپنے خطابوں کی تجدید میں مصروف دکھلائی دیتے ہیں، نکتہ سنج اپنی سخن سنجی اور بذلہ گوئی سے روحانی فرحت بخشتے ہیں۔ فلسفی اور حکماء علماء اپنے مفہومات کی توضیح و تشریح میں مجھے مصروف کرتے ہیں۔ عابد زاہد واعظ و ناصح ہدایت و نصیحت کے لیے موجود ہوتے ہیں۔ اور مختصر یہ کہ میں اپنی کتابوں کی مدد سے خطِ استوا سے قطب تک اور دنیا پیدا ہونے سے اس وقت تک جس جگہ اور جس زمانہ میں جانا چاہتا ہوں با آسانی جا سکتا ہوں" کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔

بیٹھ کر سیر ملک کی کرنا　　یہ تماشا کتاب میں دیکھا

اس خیال کا صحیح ہونا بہت ممکن ہے کہ پہلا قدم جو لکھنے کی طرف بڑھایا گیا وہ ہی نقوش اور لکیریں تھیں جو غاروں میں رہنے والے کھینچتے تھے اور اپنے مفہوم مطالب کو اشاروں کے ذریعہ ادا کرتے تھے۔

آمریکا کے مندیوں نے اس معاملہ میں ایک حد تک ترقی کی تھی۔ وہ لوگ اُن عظیم الشان واقعات کو جو وقتاً فوقتاً واقع ہوتے تھے، ہو بہو نقشوں کی شکل میں اور تصویروں کے

ذریعہ لکھ کر محفوظ کر لیتے تھے۔

وہ کتابت جسے "خط میخی" کہتے ہیں اور جو اسیریا (شام) اور بابل کے لوگوں میں رائج تھی اُسکی اصل ان ہی تصویروں اور شکلوں سے ماخوذ ہے۔سورج کی تصویر کو اس طرح لکھتے تھے کہ چار لکیروں کو باطراف یکدیگر قائم کر کے اک شکل بنا لیتے تھے پھر اس شکل کو قائم و مستحکم رکھنے کے لیے اُن میخوں سے جو نرم مٹی کی بنائی جاتی تھیں اور جنھیں آوے میں پکایا جاتا تھا منقوش کرتے تھے اسی وجہ سے اس خط کو خط میخی کہتے ہیں۔

اینٹوں کے ٹکڑوں اور ٹھیکریوں کے ٹکڑوں کو بھی لکھنے کے واسطے استعمال کرتے تھے ہزاروں خشتی کتابیں جو قدیم زمانہ میں لکھی گئی تھیں اب دستیاب ہوئی ہیں تحریر و کتابت کے اس رواج کا ۳۸۰۰ قبل مسیح سے پہلے تک کا پتہ لگتا ہے۔اور ولادت مسیح کے بعد بھی بہت مدت تک اس کا رواج بدستور رہا ہے۔

بابل میں کیلستھینیز[51] کو ۱۹۰۳ کلدانی سال کے مشاہدات اجسام فلکی ہاتھ لگے تھے جو پختہ اینٹوں پر ثبت تھے۔اسی طرح بطلیموس[52] مصری ہیئت دان کو بھی بابلی جدول خشتی ہاتھ لگی تھی جس میں ۷۴۷ قبل سے لے کر اس کے زمانہ تک کے واقعات کسوف خسوف کے نتائج مندرج تھے۔

ہیروگلیفیک | یہ بھی کتابت تصویری کی ایک قسم تھی جس سے قدیم مصری کام لیتے تھے۔ان میں سے بعض تصاویر انسان کے خیالات کو ظاہر کرتی تھیں۔مثلاً ایک

---

[51] یہ حکیم ارسطو کا بھتیجا اور شاگرد اور سکندر کا ہم سبق ۳۶۰ قبل مسیح میں پیدا ہوا اور اپنی صاف گوئی کے باعث سکندر کے حکم سے ۳۲۸ قبل مسیح میں قتل ہوا۔

[52] بطلیموس ارسینو نامی ایک حسینہ جمیلہ خواص کے بطن سے شاہ فیلقوس کا بیٹا اور سکندر کا علاقی بھائی تھا بچپن میں ایک مرتبہ دونوں کو باپ نے جلاوطن کر دیا تھا اس وقت وہ برابر سکندر کے ہمراہ رہا کوئی ایسی جنگ یا اہم ایسی مہم نہ تھی جس میں اس نے سکندر کا ساتھ نہ دیا ہو وہ اول مصر کا گورنر اور بعد میں مطلق العنان فرمانروا بن گیا تھا۔

دائرہ مستطیل مرتفع کو ترسیم آفتاب کے لیے کھینچتے تھے اور شوق و شغف کے اظہار کے لیے ایک عورت کی تصویر بناتے تھے جو طنبورہ بجاتی ہوتی تھی یا ایک مرد کی صورت بناتے تھے جو ناچنے میں مشغول ہوتا تھا۔ اسی طرح مجسم عیاری کے واسطے گیدڑ کی شکل بناتے تھے۔ اور انسان کی حرکت کو دو پاؤں کی تصویر کے ذریعہ مصوّر کرتے تھے۔

ہیروگلیفیک کی ایک اور بھی قسم تھی جس سے اشیاء کے بجائے آوازیں ظاہر ہوتی تھیں اور جو اشکال حرفوں کے اظہار کے لیے بناتے تھے وہ یا تو کسی حیوان کی تصویر ہوتی تھی یا اور کسی چیز کا خاکہ ہوتا تھا۔

کسی زمانہ میں مصری الف باے (۲۹) حرفوں سے مرکب تھی جو بعض معلومہ اشیاء کے نمایندے تھے پھر تقریباً (۹۰) شکلیں اضافہ ہوئیں اور پھر ان اشکال میں اسقدر زیادتی اور بہتات ہوئی کہ (۱۷۰۰) شکلیں ہوگئیں۔ ان کو پتھر یا لکڑی پر چپکا کر کھودتے تھے اور کاغذ پر لکھتے تھے۔ جب ان کے بناے ہوئے کاغذ (پپیرس[۵]) پر لکھنا چاہتے تھے تو لکڑی کے قلم سے کام لیتے تھے۔ وہ دوات کے بجاے ایک سطح تختہ کے ٹکڑے کو جسکے سرے پر نیچی چھید ہوتے تھے استعمال کرتے تھے اور سیاہ قرمزی (سرخ) اور سبز رنگ کو کام میں لاتے تھے۔

---

۵ کاغذ کی ایک بہت ہی قدیم قسم (پپیرس) سے بنتی تھی پپیرس ایک درخت کا نام ہے جو ملک مصر میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کا [illegible] [illegible] سے ذرا موٹا ہوتا ہے۔ اور اس کی بلندی دس قدم [illegible] ہوتی ہے اور اسکی پھننگوں میں [illegible] کاغذ کو اس کی اندر چھال سے [illegible] طرح بناتے ہیں کہ پہلے رود نیل کے پانی میں [illegible] کر اور کوٹ [illegible] [illegible] پر اس قدر رکھتے ہیں کہ وہ سطح ہو جاتا ہے۔ اس صنعت نے یہاں تک ترقی کی [illegible] ایک مصری کاغذ ساز نے نہایت فخر و مباہات سے دعویٰ کیا تھا کہ میں کاغذ کی تجارت [illegible] ایک لشکر نوکر رکھ سکتا ہوں۔ انگریزی زبان میں (پیپر) کاغذ کو کہتے ہیں یہ لفظ یونانی کلمہ پپیرس [illegible] ہے۔ یونانیوں میں سکندر اعظم کے عہد تک اور بعد بھی اس کاغذ کا رواج رہا اور مشرق و مغرب کے ممالک میں [illegible] تک متداول رہا۔ مصری کتابیں جو پپیرس کاغذ پر لکھی ہوئی پائی گئی ہیں اُن کے متعلق خیال ہے کہ [illegible] قبل مسیح کی ہیں۔

ان کو بطور اُفق کے لکھ کر سیاہ لکیروں کے ذریعہ ایک دوسرے سے الگ کر دیتے تھے کتابت کی حسب ذیل دو قسمیں اور بھی رائج تھیں۔

(۱) ہیراٹیک | اس کے معنی ہیروس مقدس کے ہیں وجہ تسمیہ یہ ہے کہ کتابت کی یہ قسم ملاؤں (آقا یا بادشاہ) کے لیے مخصوص تھی یہ کتابت کئی درجہ تک ہیراگلیفیک کا مخفف تھی جو خط شکستہ کی شکل میں منتشکل ہوتی تھی اور اصلی خط سے چنداں مشابہت نہیں رکھتی تھی۔ اس کو سلطنت کے دفاتر، مذہبی رسالوں اور شرعی کتابوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔

(۲) ڈیماٹک | ڈیموس کے معنی (آدمی) کے ہیں۔ چونکہ اس خط کو عام لوگ اور عوام الناس استعمال کرتے تھے اس لیے اس کا نام ڈیماٹیک رکھا گیا۔ یہ خط بھی ہیراگلیفیک ہے جو کسی قدر تعدیل پاکر بہت کچھ سیدھا سادھا ہو گیا تھا اور صرف متداول کاموں میں مستعمل ہوتا تھا۔ یہ خط سنہ ۶۰۰ قبل مسیح سے لے کر سنہ ۳۰۰ء تک رائج رہا۔ اس وقت عیسائی قدیم یونانی الف باے کو کام میں لاتے تھے۔

ترجمہ خط ہیروگلیفیک | سیاہ پتھر کے ایک ٹکرے کے دریافت ہونے سے جو شہر (روزیٹا) میں سنہ ۱۷۹۹ء میں نکلا ہیروگلیفیک اور ڈیماٹیک اور یونانی تحریریں لکھی تھیں) اس خط کے ترجمہ میں بہت کچھ آسانی ہوئی۔ اس پتھر کے نوشتہ جات کا مضمون فتوائی تھا جس کو ملایان مصر نے ممالک (ممفیس) میں بطالمی چہارم کی توقیر و تکریم کے لیے تقریباً سنہ ۱۹۶ قبل مسیح میں لکھا تھا۔

اسی طرح سنہ ۱۸۰۲ء میں ملک مصر سے (روسیٹا) پتھر دریافت کر کے جارج سوم شاہ انگلستان کے حضور میں پیش کیا گیا۔ اور شاہی حکم سے لندن کے عجائب خانہ میں رکھا گیا۔ اس کا رنگ سیاہ اور شکل و صورت بھدی اور بھونڈی تھی اور اس پر تین زبانوں میں ایک [illegible] لکھا ہوا تھا جن میں سے ایک کتبہ ہیروگلیفیک زبان میں تھا۔ مسٹر ینگ اور [illegible] دو انگریزوں نے باقی تحریر اس کی مدد سے اسکے پڑھنے میں

کامیابی حاصل کی اور اجپٹولوجی (مصر کے علوم وفنون) پر جو فولادی تالا لگا ہوا تھا اُسکی کُنجی مل گئی ڈاکٹر ینگ نے یہ بھی انکشاف کیا کہ حروف ہیروگلیفیک مخصوص اسامیوں میں آوازوں کے بجائے مستعمل تھا - اسی طرح (چمپولیون) ایک فرانسیسی نے بھی بعض دوسرے اہم انکشافات دکھائے اور اب وہ سب کتبے جو ہیروگلیفیک میں لکھے ہوئے تھے ترجمہ ہو چکے ہیں۔

۱۸۶۵ء میں پروفیسر لیپس نے شہر صُعن میں ایک چٹائی پٹیا پایا جو قدامت میں روسٹیہ پتھر سے بھی قدیم تھی اور اس پر یونانی زبان اور مصر کے ہیروگلیفیک میں عبارت کندہ تھی۔

۱۸۴۲ء میں ایم بوٹا فرانسیسی سفیر نے دریائے دجلہ کے کنارے کے کھنڈرات کو کھدوانا شروع کیا پھر یالارڈ کی زیر نگرانی ایک تحقیقاتی مہم یہاں پہنچی - چنانچہ ان دونوں کی جان توڑ کوششوں سے بہت سی تحریریں زمین کے اندر سے دستیاب ہوئیں اور اسیریولوجی (آسوریہ کا علم وفن) کے متعلق انسانی معلومات میں قیمتی اضافہ ہوا۔ یہ تحریریں تکونیہ حروف رکھتی تھیں اس لیے انگریزی میں "کُنی فارم الفبٹ" کہتے ہیں اور یہ سب سے پہلے موسیوپٹامیہ (ملک شام یا عراق عجم) میں پائی گئیں۔

خطوط الف بائے فنیقیہ جو مشرقی بحر روم کے ساحل پر واقع تھا جس کو غور بھی کہتے ہیں اور زبور میں کنعان کے نام سے موسوم کیا گیا ہے ایک چھوٹا سا خطہ تھا جس کی جنوبی اور شمالی حد سیریہ (شام) اور (صوبہ) یہودیہ کے مابین واقع تھی اور مغربی سرحد بحر روم (مڈیٹرینین سی) سے ملتی تھی - وہاں کے رہنے والے زمانہ قدیم میں مصریوں سے تجارت کیا کرتے تھے - اس بنا پر انھیں ضرورتاً مصریوں کی طرز کتابت کو سیکھنا پڑا - اُنھوں نے دیکھا کہ وہ تمام چیزیں جو لازم ہیں ایک مختصر عدد علامتوں میں سے ہوتا ہے جو آوازوں کا نمایندہ ہے - خیال ہوتا ہے کہ الف گائے کے نام کا ظاہر کرنے والا تھا

اور گائے کی سر اور کان کے ذریعہ توضیح ہوتی تھی۔ میم کے معنی پانی کے تھے اور اس کو بطور معوج ومنحنی جو موج آب کی طرح ہوتا تھا لکھتے تھے۔ ایک مرتفع مستطیل دائرہ کو آنکھ کے بجائے قرار دیا تھا۔ اور رفتہ رفتہ آنکھ کی شکل دائرے کی صورت پیدا کر لیتی تھی۔ یعنے پہلے ایک نقطہ اسکے بیچ میں ہوتا تھا پھر نقطہ کو اُٹھا دیتے تھے غرض کہ الف بائے فینیقیہ قدیم صرف (۶ - الف) حرف رکھتی تھی۔ جب دوسری قوموں خصوصاً بنی اسرائیل نے انھیں محکوم بنایا ان کی دولت وحکومت پر قابض ہو گئے اور انھیں منہزم اور منتشر ہونا پڑا تو حرفوں کی شکلوں اور اُن کی آوازوں میں بعض جزوی اور نمایاں تغیرات ہو گئے اور اس کے علاوہ جدید حروف بھی اضافہ ہوئے۔

یونانیوں نے فنِ تحریر کو فنیقیوں سے سیکھا ہے اور تقریباً ۱۵۱۹ قبل مسیح میں ایک یونانی کاڈمس نامی نے فینیقی حروف کی ترویج اپنے ملک میں کی ہے یہی وجہ ہے کہ یونانی انھیں حروف کا موجد سمجھتے ہیں۔ لیکن تحقیقات اور چھان بین سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مصریوں کی تصویری تحریر اور اہل بابل[1] کے تکونیہ حروف یہ سب فینیقیوں کے زمانہ کے پہلے کے ہیں۔ ہاں اسمیں شک نہیں کہ انھوں نے ان دونوں خطوں کو سیکھا، ان میں ترمیم تنسیخ کاٹ چھانٹ کی، اور بہت کچھ اضافہ کرکے ایک جداگانہ صورت پیدا کر دی۔

اب الف بائے عبرانی (سامی) بائیس[22] حرف رکھتی ہے لاطینی قدیم (لیٹن) اکیس[21] کیس حرف انگریزی جدید چھبیس[26] اور موجودہ فارسی بتیس[32] مختصر یہ کہ موجودہ حروف کا وہی حال ہے جو کئی ہزار برس قبل مسیح تھا جب الف بائے اصلی نے تشکیل پائی تھی اور اُسکی قسموں اور بعض دوسری صورتوں کو اہالی فینیقیہ اور دوسری قوموں نے سیکھا اور استعمال کیا تھا۔

محمد اسمعیل ہاتف

---

[1] شہر بابل یا خالدیہ کو ۱۵ بعد طوفان نوحؑ ۲۲۳۵ قبل مسیح میں نمرود نے دریائے فرات کے مشرقی جانب مربع شکل میں آباد کیا تھا یونانی مورخوں کے بیان کے مطابق اس شہر کا رقبہ سو میل تھا فصیل ۳۰ گز سے زیادہ بلند تھی اور اسقدر چوڑی کہ اسپر چار گھوڑوں کی گاڑی بخوبی پھر سکتی تھی اور بعہد بلیشیفر ۵۳۹ قبل مسیح میں فارسیوں کے فتح کرنے سے سلطنت کے ساتھ اسپر بھی زوال آگیا ۱۲۱۳ قبل مسیح میں (جیسا کہ تکونیہ حروف کے کتبوں سے ظاہر ہوا ہے) یہ شہر سمندر کے بالکل کنارے واقع تھا مگر آجکل (۱۵۰) میل دریائے فرات سے اوپر آباد ہے۔ اور اس مقام کو حلہ کہتے ہیں۔

تم سے مل کر

تم سے مل کر میرے دل کو سکون حاصل ہوا میری روح میں تازگی پیدا ہوئی میرا شجرِ زندگی تر و تازہ ہو گیا۔ میرے دماغ نے جو غیر معمولی راحت تم سے مل کر پائی وہ میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ دل و دماغ کو جو تقویت ہوئی تو وہ ہوائی قلعوں کی تعمیر میں مصروف ہو گئے ہائے افسوس کہ آج میں کہتا ہوں کہ وہ ہوائی قلعہ تھے مگر کاش ان کے بننے اور بگڑنے سے بلکہ ان کی بنیاد قائم ہونے سے قبل یہ معلوم ہو جاتا کہ وہ خواب ہوں گے تو دعا مانگتا۔ کہ ان کی بنیاد نہ پڑے میں تم سے مل کر نشۂ الفت میں ایسا سرشار ہوا کہ ایک مدت کے لیے ایک قلیل مدت کے لیے یہ بھی بھول گیا کہ تم سے ملنے کی کتنی اور کیا کیا کوششیں کی تھیں کیونکر تم تک پہنچا تھا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ جب تک میں نے تم کو نہ دیکھا تھا تو دل نے تمھیں دیکھنے کی خواہش میں کیا کیا نہ کیا وہ کچھ کیا جو کہ نہ کرنا تھا۔ اُف! روزانہ آنا ایک کی نہیں، ہر ایک کی نہیں، ہر ایک کی، تمھاری نہیں، تمھاروں کی۔ تمھاروں کی نہیں غیروں کی منتیں کرنا اور خوشامد کے ہر ایک طریق سے کام لینا مدتوں کی آرزوؤں کاوشوں اور خوشامدوں کے بعد کہیں کچھ اثر کسی کے دل میں پیدا ہوا نہیں نہیں یہ خوشامدوں کا اثر نہیں تھا بلکہ میرے جذبۂ دل کا اثر تھا جس نے کسی کے پتھر سے سخت دل کو پگھلایا۔ یہ سب وہ مراحل تھے جو میں نے طے کیے اور مشکل سے نہیں جانکاہی سے طے کیے مگر تم سے مل کر یہ سب کوششیں حرفِ غلط کی طرح مٹ گئیں۔ تم سے ملا۔ تم سے مل کے میں نے اپنے آپ کو تباہ کر دیا۔ پہلی ملاقات کا ہوشربا منظر تم کو شاید نہ یاد ہو مجھے یاد ہے۔ صاف شفاف کمرہ میں لیمپ کی روشنی تھی پلنگ پر تم جلوہ گر تھے اور میں محوِ حیرت کسی کو دیکھ رہا تھا۔ یہ بھی مجھے خوب یاد ہے

کہ میرے تمھارے ہاتھ ملے اور تمھارے ہاتھ کی مقناطیسی قوت نے میرے دل و دماغ میں بجلی کی رَو دوڑا دی لیمپ کی روشنی نہیں روشنی کی کرنیں تمھارے چہرہ پر پڑ رہی تھیں اور شرم سے جھکی ہوئی نظریں قیامت ڈھا رہی تھیں تمھارے دل میں کسی نئے آنے والے کا خیال اور اُس کے استقبال کا جذبہ پہلے سے تھا اور ضرور تھا مگر حیا کی بندش نے تمھاری یہ آرزو پوری نہ ہونے دی ہمت کی ہو گی لیکن حیا کی روک تھام غالب رہی اور نظروں ملنے تک کا موقع نہ دیا...... آہ یہ ہی منظر کسی متلاشی محبت کے مٹ جانے کو کچھ کم نہ تھا کہاں پر پھر کسی کا اصرار نیچی نظریں کیے اور سمٹے سمٹائے ہوئے اس کا زبان حال سے اظہار کہ کچھ اور ٹھہرو۔ یہ سب وہ باتیں تھیں جنھوں نے مجھے مدہوش کر دیا تھا۔ میں اپنے آپ میں نہ تھا۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی گویا خوشی کا میں ہی تنہا مالک ہوں مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ خوشی عارضی ہے اور تم سے مل کر جو نشۂ سرور پیدا ہوا ہے وہ بہت جلد بے اعتنائی کی ترشی سے اُتر جائے گا اور اس کے بجائے قدرت میرے لیے ایک دائمی کیفیتِ رنج و غم پیدا کر دے گی۔ ایک دفعہ نہیں میں کئی دفعہ تم سے ملا مگر جو وقفہ آپ سے ایک دفعہ ملنے کے بعد دوسری دفع ملنے تک ہوتا تھا وہ مجھ پر کیا کیفیت پیدا کرتا تھا اس سے میرا ہی دل خوب واقف ہے۔ دوسری دفعہ ملا لیکن پھر بھی تمھاری شرم نے گرمجوشی سے آرزوؤں کو پورا نہ ہونے دیا تم نے کسی قدر جسارت سے کام لیا پُر شوق نظروں سے دیکھتے ہوئے مجھے لینے کو بے بڑھیں لیکن بُرا ہو اُس حیا کا جس نے قدم نہ اٹھنے دیا اس منظر کا اندازہ اہل دل اور صرف اہل دل کر سکتے ہیں جنھوں نے کچھ دیکھا ہو جن کے دل میں کچھ درد ہو۔ آہ کیا یہ باتیں ایسی نہیں جنھیں کوئی دل رکھنے والا دیکھے اور اپنے ہوش و حواس قائم رکھ سکے کسی کا بیباک سے آگے بڑھنا لیکن حیا اور ناز کا قدم نہ بڑھنے دینا کچھ کہنے کی کوشش کرنا لیکن حجاب و ناز کا نہ نکلنا ایک نظر دیکھنا اور آنکھیں چار ہوتے ہی نگاہیں نیچی کر لینا میرے لیے یہ ادائیں کیا تھیں میں کیا بتاؤں کیا تھیں اور

کیا ثابت ہوئیں۔ آہ کاش وہ وقت میری زندگی کا آخری وقت ہوتا مگر قدرت کو تو یہ منظور نہ تھا کہ میں حیات کے دائمی سرور سے بہرہ ور ہوں آہ کیا قدرت کو یہی منظور تھا کہ تم سے مل کر میں زندہ رہوں اور اپنے آپ کو زندہ درگور خیال کروں بعد کی ملاقاتوں میں تمھارا خاصہ بے تکلف ہو جانا اور بار بار اس کا اظہار کرنا کہ مجھے تم سے محبت ہے تمھارے انتظار میں وقت خدا جانے کس کس مصیبت سے گذارتی ہوں سوچتی ہوں کہ تم سے کیا کیا باتیں کروں گی مگر تمھارے آتے ہی وہ سب بھول جاتی ہوں صرف تمھارے پاس بیٹھے رہنے تمھاری محبت آمیز باتیں سننے کو جی چاہتا ہے۔ میں تم سے ملنا تم سے بات کرنا اپنی زندگی کے لیے اپنی راحت کے لیے ضروری خیال کرتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ تم اور میں ساتھ رہ کر زندگی گذاریں اور آخر میں کہنا کہ میں کیا بتاؤں کہ میرا دل کیا چاہتا ہے .... یہ گفتگو میرے لیے اُس وقت شہد تھی مگر آج جو کچھ اثر کر رہی ہے وہ ایک ایسا زہر ہے جو نہ زندہ رہنے کا لطف اُٹھانے دیتا ہے اور نہ مرنے دیتا ہے۔ گورے ہاتھوں پر ریشمی چوڑیاں کیا بہار دیتی ہیں یہ کوئی وہ بتائے جس نے کبھی یہ منظر دیکھا ہو یورپ تو فریب قریب بے نیاز حسین اور زیور شرم سے آراستہ حسین کے دیکھنے ملنے باتیں کرنے کا لطف صرف وہی جان سکتا ہے جس نے مصنوعی لوازمات سے پاک حسن دیکھا ہو۔ افسوس قدرت کے ہاتھوں نے مجھے اس سے جدا کر دیا۔ یہ نہیں جانتا ہوں نہ وہ کہ قدرت نے ایسا کیوں کیا۔ میں اُسے ظالم کہوں گا اس نے مجھ پر ظلم کیا ہے اس نے میری زندگی کو تباہ کر دیا ہے مجھے قدرت کے ان تماشوں کی ضرورت نہیں میں قدرت کی دستبرد کو ظلم سمجھتا ہوں۔ آہ مجھے جس وقت آخری ملاقات کا خیال آتا ہے اور تمھاری پُرنم آنکھوں کا تصور بندھتا ہے تو آہ جب کہ تم سے مل کر تم سے دور رہوں۔ ناقابل برداشت روحانی اذیت پاتا ہوں۔ قدرت تو نے ظلم کیا ہے تو تم بھی کر مجھے دنیا میں رہنے کی ضرورت نہیں میں دنیا سے بیزار ہوں۔ یہ خیال مجھے اور بھی تکلیف

دیتا ہے کہ زندگی میں میری اور اس کی جدائی ایک انقلاب پیدا کر دے گی اگر مجھے کسی سے محبت ہے تو قدرت ظلم کے بعد تجھے رحم کرنا چاہیے اور تیرا رحم یہی ہے کہ یا تو مجھے اُس سے پھر ملا دے یا دنیا سے ایک ایسے وجود کو مٹا دے جس کو ممکن ہے کہ وہ بے وفا خیال کرتی ہوں مگر نہیں وہ مجھے بے وفا نہیں خیال کرتیں وہ مجھے جانتی ہیں وہ مجھ سے واقف ہیں اگر وہ مجھے بے وفا سمجھتی ہیں تو مجھ سے انھیں محبّت نہیں ہے۔ کسی سے ملنے سے قبل میں آدمی تھا۔ ملنے کے ایام میں انسان کامل ہوا مگر ملنے کے بعد اب میں آدمی نہیں ہوں آدمی اشرف المخلوقات اس لیے ہے کہ اس میں صحیح ادراک و عقل ہوتی ہے مگر میری عقل گم ہو گئی میرا دماغ خراب ہو گیا میں انسان تو انسان حیوان بھی نہیں رہا۔

زمانہ کے انقلابات اکثر عبرت انگیز ہوئے مگر ان سب انقلابوں کی حقیقت آج مجھے بانی کا بُلبلہ معلوم ہوتی ہے اور میں کہتا ہوں کہ انقلاب صرف اُس چیز کا نام ہے جو ایک عورت کی ذات۔ ایک عورت کی جدائی اور ایک عورت کے خیال سے پیدا ہوتا ہے۔ دنیا کے نفس پرست لوگوں کے لیے ہر عورت خواہ وہ کیسی ہی کیوں نہ ہو بہت کچھ انقلاب پیدا کر سکتی ہے مگر میرے شیرازۂ زندگی کو منتشر کرنے والی صرف وہ عورت ہو سکتی ہے اور ہے جو عورت ہو۔ اور وہ

کون ہے!

— تم —

یہ مجھے اسوقت معلوم ہوا جب میں تم سے جدا ہوا ہوں یا جب کہ میں تم سے محبت کی باتیں کر رہا تھا۔ تمھاری محترم اور پاک نظریں مجھے پڑھ رہی تھیں کاش تم میرے پہلے ہوتیں اور میں تمھارا رہ لیتے۔

اطہر

ہماری تاریخ کا ایک ورق

ذرا ہی دیر کو للہ آ بیٹھو مرے دل میں دکھاؤں لطف وہ دیکھا نہ ہو جو رقص بسمل میں

"جو لوگ اپنے اسلاف کے کارنامے فخر و ناز کے ساتھ یاد نہیں کرتے وہ گویا خود بھی کبھی ایسا کام نہیں کریں گے" (لارڈ مکالے)

مسلمانوں کا علمی شغف ہجرت کی دوسری صدی سے شروع ہوتا ہے۔ خلفائے بنی اُمیہ اور بنی عباس کی شہرۂ عالم فیاضی نے دلوں میں اُمنگ اور حوصلوں میں بلندی پیدا کر کے اس شغف علمی میں چار چاند لگا دیے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک مختصر مدت میں وہ جملہ اصناف علم و فن کے گرانقدر مخازن کے مالک بن گئے تحقیق و تشویق کے میدان میں جھنڈے گاڑ دیے۔ اور کچھ اس سرعت اور تیز گامی سے چلے کہ جمیع اقوام متمدنہ کوسوں پیچھے رہ گئیں۔ اور جب مڑ کر دیکھا تو کوئی ہمسر و ہمتا نظر نہ آیا۔ یونان کے تمام علوم و فنون اُمنڈ آئے۔ خالد بن یزید نے ماہرین یونانی ادب و زبان کو جمع کیا۔ اور تراجم کی خدمت تفویض کی۔ عبدالملک کے عہد میں زبان عربی دولت اسلام کے محکموں میں ترویج پذیر ہوئی جس کا اثر تدریجاً مصر و شام اور عراق کی معاشرت پر پڑنا شروع ہوا۔ اور عربی ان بلاد و امصار کی مادری زبان بن گئی۔ مابعد ہارون رشید عباسی نے تصانیف و تراجم کا ایک یادگار عصر اور عدیم المثال محکمہ بیت الحکمۃ کے نام سے قائم کیا۔ اس محکمہ میں یونانی، سریانی فارسی اور سنسکرت زبانوں کے باکمال ماہر جمع ہوئے۔ ثابت بن قرہ، حبیش بن الحسن۔ ابن اسحق وغیرہ نامور عیسائی مترجمین پانچ پانچ سو اشرفی ماہانہ پر متعین کیے گئے۔ اور دو سو برس کے اندر اندر یونان اور روم کا سارا علمی خزانہ بیت الحکمۃ میں منتقل ہو گیا۔ فضل برمکی نے اپنے اہتمام سے کاغذ سازی کا کارخانہ جاری کیا۔

مامون رشید نے بایں شرط والی یونان سے دائمی صلح کر لی اور ایکسو چالیس من سونا دینے کا وعدہ کیا۔ کہ وہ چند روز کے لیے حکیم لیسو کو فلسفہ آموزی کے لیے امیرالمومنین کے پاس بھیجدے مامون رشید کی حب علمی کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ وہ مترجمین کو کتاب کے ہموزن سونا تول دیتا تھا۔ یہی وہ خلیفہ اولین ہے جس کے عہد میموں میں دمشق بغداد اور شماسیہ میں رسدگاہیں قائم کی گئیں۔ صحرائے بحار میں اس کی تجربتًا تحقیق خاص کی گئی کہ محیط کرۂ ارض ۲۴ ہزار میل ہے۔

صدی چہارم سے قبل کہ دائرۂ اسلام میں کوئی سررشتۂ تعلیم نہ تھا۔ ہم کو یزید بن ہارون المتوفی ۲۰۶ھ کے حلقۂ درس میں ستر ہزار طلبا و متعلمین کا ہجوم نظر آتا ہے۔ جب امام بخاری نے لکھر دینا آغاز کیے ہیں تو قریبًا دس ہزار اہل مناظرہ محدثین حفاظ اور فقہا شامل تھے۔ ایجاد و اختراع کے چمن میں بھی عجیب عجیب پودے لگائے اور نئے نئے نکہت بیز پھول کھلائے۔ چنانچہ عربی میں چار سو مستند کتب تواریخ زیور تالیف سے آراستہ ہوئیں۔ امام غزالی نے تہافت الفلاسفہ علم کلام میں سب سے پہلی کتاب ترقیم فرمائی اور ثابت کیا کہ اصلی مسائل اسلام سے جس قدر فلسفہ مختلف اور متضاد الفہم ہے خود غلط ہے۔ ایک نامور فلاسفر ثابت و مشتقی نے بعہد یزید ثانی آلات جاذب برق ایجاد کیے جن کے ذریعہ سے بادلوں سے بجلی جذب کی جا سکتی تھی۔ دربار خلافت سے اس فقید المثال ایجاد پر پانچ لاکھ روپیہ عطا ہوا۔ عبدالملک بن مروان کے عہد میں جنگی جہاز بنائے گئے۔ لوہا پگھلا کر ڈھالا گیا ۶۰۰ھ کے قریب میں علی بن تغلب گھڑی سازی میں شہرہ یاب ہوا۔ زبیدہ خاتون نے شموم عنبری کو بزم تکلف میں جگہ دی۔ انگریزی سال میں جو کسر چار صدیوں میں نکلتی ہے۔ وہ خیام نے ۳۳ برس میں نکال دی اور برائے نام ایک دن میں کچھ کم فرق رہ گیا اگر نہ رہتا تو یہ بھی نہ رہتا۔ میزان الحکم میں وہ اصول بیان کیے جن سے مرصع جڑاؤ زیورات کا وزن بغیر توڑے اور جواہرات الگ کیے دریافت کیا جاتا ہے میزان ارشمیدس

اسلام کی ایک نادرۂ روزگار تصنیف ہے جس کے اصولوں سے نقرہ و طلا کا کھرا کھوٹا مع وزن کے متحقق ہوسکتا تھا۔ زمانہ اس پر جس قدر ناز کرے کم ہے۔

شیخ ابوالقاسم بن اندلسی معروف بہ البقاس نے ایک معرکۃ الآرا کتاب التصریف تحریر کی تھی اس میں زخم کا جلانا۔ آلات کے ذریعہ اپریشن کرنے کے قواعد امراض رحم و معدہ وفتق اور پتھری نکالنے کا اپریشن۔ عوارض چشم میں اپریشن کرنے کے قواعد۔ ٹوٹی ہوئی ہڈی جوڑنے کے اصول خصوصیت سے باوضاحت بیان کیے گئے ہیں۔ یہ مایہ ناز حکیم اکثر آلات جراحی کا موجد گزرا ہے۔ خصوصاً پتھری کے خارج کرنیکے آلات اسی کی ایجاد ہیں مختلف یورپی زبانوں میں ترجمہ ہوئی۔ کچھ زمانہ پیشتر یورپ کی جراحی کا دارومدار اسی کتاب پر تھا۔ بوعلی سینا کا "قانون" جو فن طب کی مکمل کتاب ہے یورپ میں ایسی مقبول ہوئی کہ آج سے پچاس برس پیشتر تک داخل درس رہی۔ ابومنصور بن بشیر بڑا سرکردہ اور نامور طبیب گزرا ہے جس کو امراض اعصابی میں یدطولیٰ تھا۔ حمام مائیہ کے اصول کا موجد ہوا ہے۔ یورپ میں یہ فن رواج پا رہا ہے جس کو ڈاکٹران ہند ڈاکٹری ایجاد سمجھ کر بے جا ناز کر رہے ہیں۔ رشید الدین علم طب و نباتات کا ایک سرآمد عصر عالم تھا جو ایک گروہ اطبا کا سردار بھی تھا اُس نے جبل البنان کے اطراف میں تحقیق نباتات کی غرض سے ان اطبا کو مقرر کیا تھا ہر پسندیدہ بوٹی کا فوٹو لیا جاتا اور علمی طور پر جانچ کرکے خواص بھی فوراً لکھدیے جاتے اس طرح علم الادویہ میں یہ ایک مبسوط کتاب ہوگئی۔ کالجوں اور شفاخانوں میں طبی عجائب خانے بھی تھے جس میں جڑی بوٹی دکھلانے کی غرض سے باغات لگائے گئے تھے۔ یہ باغ میلوں وسیع ہوتے تھے۔ چنانچہ دسویں صدی عیسوی میں ایک نہایت وسیع طبی باغ غرناطہ میں اور مثل اُسکے ایک اور باغ قرطبہ میں بعہد عبدالرحمٰن اول موجود تھا جس کو اہل یورپ تسلیم کیے ہوے ہیں۔ سب سے پہلا دنیا میں جندیساپور کا کالج اور شفاخانہ ہے جو قرونِ اولےٰ اسلام میں قائم ہوکر زمانہ منصور تک شہرہ یاب رہا۔ برجیس ابن جبرئیل مشہور

مشرقی طبیب اس کالج کا پروفیسر تھا۔ ماسویہ ابن یوحنا اس کالج کا تعلیم یافتہ تھا۔ ابن سہیل نامی طبیب بھی اسی کالج کا متعلم تھا۔ جس نے تمام امراض کے نسخے جدولی صورت میں ترتیب دیے۔ اس اصول کی ایسی مقبولیت ہوئی کہ آج یورپ کے شفا خانوں میں اسکا رواج ہے۔ صاحب طبقات ناصری ابن عیسیٰ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ ۱۳۲ھ میں عثمان ابن سعید دمشقی نے ایک عظیم الشان کالج و شفا خانہ قائم کیا۔ جس میں ابن عیسیٰ پروفیسر مقرر ہوا۔ اور مکہ معظمہ اور بغداد شریف کی انسپکٹری پر مامور کیا گیا۔ یہ طبیب سفری شفا خانوں کا موجد گزرا ہے۔ جس نے ابن قرہ کی نگرانی میں کافی انتظام کیا کہ گاؤں بہ گاؤں بلا معاوضہ گھوم کر چارہ سازی کریں۔ عضد الدولہ نے جب شفا خانہ مع کالج الرازی کی صدارت میں جن کی قابلیت اور تبحر کو اس وقت یورپ تسلیم کیے ہوئے ہے۔ قائم کرنا چاہا۔ تو اسکی بدقسمتی سے قبل تکمیل علامہ کا انتقال ملک کو ماتم کدہ بنا گیا۔ اس شفا خانے اور کالج کے افتتاحی جلسے اس گرم جوشی سے ہوئے کہ ہنوز اس ترقی و تہذیب کے زمانے میں کسی دار العلوم کے افتتاحی جلسوں میں یہ بات حاصل نہیں ہوئی۔ غرض اس شفا خانہ میں ہر مریض کے واسطے جدا جدا وارڈ تیار رہتے کہ تھے جن میں ہر مریض ایک دوسرے سے جدا رہتا۔ اسی طرح ہر طبیب کے لیے علیحدہ علیحدہ مکانات تیار رہتے تھے۔ ان شفا خانوں میں آجکل کی طرح رجسٹر بھی تھے جن میں مریض کے حالات مع مشاہدات درج ہوتے تھے۔ اسی طرح مصر۔ دمشق۔ مرو۔ [illegible] اور اصفہان وغیرہ میں عالی شان اور نامی کالج و شفا خانے تھے۔ بقول ایڈورڈ گبن مشہور یورپی مورخ و مصنف یورپ کے تاریکی کے زمانے میں افریقہ اسپین [illegible] میں عربوں کے قائم کردہ طبی مدارس جاری تھے۔ ہسپتالوں کا قیام بھی یورپ نے عربوں سے لیا۔ چنانچہ ۱۲۰۳ء میں قاہرہ میں ایک بہت بڑا پاگل خانہ موجود تھا۔ حالانکہ یورپ میں اسکی ابتدا کم و بیش ایک صدی بعد ہوئی۔ ابن الصیائغ نے علم الارتقا کی بنیاد ڈالی۔ ابو موسی خوارزمی نے

جبر و مقابلہ کی بنائیں اُستوار کیں۔ ابوالبرکات بغدادی نے ارسطو و افلاطون کے بالمقابل حکمائے اسلام کا ایک جدید فلسفہ ترتیب دیا۔ ابن فرناس نے ہسپانیہ میں ہوائی جہازوں کا قاعدہ ایجاد کر لیا۔ اندلس کے عربوں نے ایک آتشبار کڑکتا ہوا آلہ ایجاد کیا جسے وہ عادہ کہتے ہیں اور آجکل کی اصطلاح میں توپ کہی جاتی ہے۔ ابن الہیثم نے علم المادہ علم الاوزان میں تبحر حاصل کر کے غرق شدہ جہازوں کو تیرا لینا اختراع کر لیا۔ ابن یونس نے علم الہندسہ میں کمال پا کے ایک تحیر خیز ایجاد کی کہ وہ اس سے مراکش میں کارخانہ آب رسانی (واٹر ورکس) کھولتے ہیں۔ پانی کے پمپ بناتے ہیں مشہور فلاسفر و مورخ ادریسی نے جابجا تشریح کی ہے کہ اس کل کے ذریعہ گھر گھر میں سڑک سڑک پر نلوں میں پانی پہنچاتے ہیں۔ مراکش کے دارالسلطنت میں جابجا پن چکیاں تھیں۔ ہر مکان میں نل تھا۔ صبح اٹھتے تھے تو تمام گلی کوچے مکان سڑک نلوں سے دھلے صاف ملتے تھے۔ یہاں سے یہ صنعت اندلس گئی اور وہاں سے یورپ نے لی پنبہ کی صنعت و ترویج یورپ میں عربوں سے ہوئی۔ شکر کے ذریعہ شیریں کام کیا۔ یہ معلوم کرنا دلچسپ ہوگا کہ انگلستان میں شیشہ کا رواج ملکہ الزبتھ سے پہلے نہ ہوا تھا حالانکہ طلیطلہ میں ایک عرب کو شک میں شفاف اور تاریک دونوں قسم کے شیشوں کا پایا جانا تاریخ سے سکسن زمانہ ہی میں معلوم ہوتا ہے۔ جغرافیہ دلچسپ مشغلہ تھا سائبیریا اور افریقہ کے ایسے مقامات میں پہنچے جہاں کا حال دنیا کو بہت کم معلوم تھا۔ شکر بھی عربوں کی ایجاد ہے ورنہ اس سے قبل یورپ میں شہد استعمال ہوتا تھا۔ تعلیم قرآن سے اسلام میں فلسفہ و حکمت کے اسکول اور کالج پیدا ہوئے جنھوں نے دور ترقی میں یونیورسٹیوں کی شکل اختیار کر لی۔ اس کا یہ روشن و تابناک نتیجہ تھا۔ کہ وسط افریقہ جو اس براعظم کا دور ترین حصہ ہے جس کو اس بیسویں صدی کی روشنی میں بھی تاریک و ڈارک براعظم کہا جاتا ہے۔ وہ ترقی کے اعتبار سے اپنے عہد کی بڑی سے بڑی یورپین سلطنتوں سے ترقی و تہذیب میں بہتر تھا ترویج علوم کے لیے سوسائٹیاں

کثرت سے قائم تھیں۔ یہ ذوق ہر کہ و مہ کے اندر موجود تھا۔ یہاں تک کہ عورتیں بھی خالی نہ تھیں۔ وہ ہر قسم کی علمی مجالس میں کثرت سے شریک ہوتی تھیں۔ ان میں بعض اعلےٰ درجہ کی جراح گزری ہیں۔ حالانکہ اب تک یورپ کی کسی عورت کو یہ فخر شاید ہی نصیب ہوا ہو۔ وہ یونیورسٹیوں تک میں بطور اعلےٰ پروفیسر کے فاضلانہ درس دیتی تھیں۔ ڈاک کا انتظام نہایت وسیع تھا کبوتروں کے ذرائع سب سے اعلےٰ اور سہل تھے جن کی خرید و خورش میں ملک عراق میں ۷ لاکھ ۷۰ ہزار روپیہ کا خرچ تھا۔ ۹۳۰ چوکیاں تھیں۔ مراسلات پر کسی قسم کا محصول نہ تھا۔ ہشام کے عہد میں محض عملہ کا خرچ ایک لاکھ روپیہ تھا۔ پوسٹل گائڈ بشمول فاصلہ موجود رہتے تھے۔ ایکہزار کوس کی ضروری اطلاعیں خبریں آسانی سے جلد مل جاتی تھیں۔ دو سو برس برابر حاکم بامر اللہ کے عہد تک یہ طریقہ عمدگی سے جاری رہا۔ شہری اطلاعات کا انتظام غضب کا تھا۔ مامون رشید نے ۔۔۔ بڑھیاں عورتیں مقرر کی تھیں جو دن بھر گھوم کر کچا چٹھا بیان کر دیتیں۔ سوا خلیفہ کے کوئی نام تک سے واقف نہ تھا۔ یہ سلسلہ عالمگیر پر ختم ہو گیا تمام ہند کی سرحدوں اور مخدوش مقامات پر پرچہ نویس بشکل صوفی مجذوب وغیرہ موجود رہتے تھے مستنصریہ (۶۲۵ھ / ۱۲۲۷ء) کالج چھ سال میں تیار ہوا۔ کتب خانہ شاہی سے ۱۶۰ اونٹوں پر لد کر کتابیں لائی گئیں کاغذ قلم روغن مکان سب مفت تھا۔ ایک اشرفی ماہوار علاوہ ہر طالب علم کو ملتی تھی۔ دربار سے ۴ ½ لاکھ کی جاگیر وقف تھی۔ نظامیہ کالج جس میں چھ ہزار طلبا زانوے ادب تہ کیا کرتے تھے اور جس کا سالانہ نظام الملک نے ۱۵ ہزار دینار مقرر کیا تھا۔ ایک دوسرا عظیم الشان کالج تھا گویا ۔۔۔ سے باقاعدہ درسگاہوں کی تعمیر شروع ہو گئی تھی۔ خاص شہر بغداد میں سات سو مدرسے قائم ہوئے۔ اب یہ وہ مبارک زمانہ تھا کہ اسلامی تمدن کا آفتاب عظمت خط استوا سے گزر رہا تھا۔ ہر جانب علم و فن کے دریا لہریں لے رہے تھے در و بام سے نقل و علم کی صدائیں بلند ہوتی تھیں جسے دیکھو باغ علم میں تمدن و تہذیب کی

شاخ پر بیٹھا مثلِ بلبلِ ہزار داستاں چہک رہا تھا نئے نئے نغمے تھے عجیب عجیب زمزمے۔ ہر روز گلبن حکمت میں ایجاد و اختراع کے سرسبز و خوش رنگ کلے پھوٹتے رہتے تھے۔ چنانچہ بغداد کے بعد اصفہان میں ۴۸۔ قرطبہ میں ۸۰۔ بیت المقدس میں ۳۸۔ دمشق میں ۴۰۔ قاہرہ میں ۲۰ نیشاپور میں ۵ شہرۂ زماں اور نامور عظیم الشان مدارس و کالج مختلف اوقات میں قائم ہوئے۔ اندلس میں بعہد حکم وہ علمی ترقیاں ہوئیں کہ ہارون و مامون کا نام بھی ماند پڑ گیا۔ دربار عباسی بھی حکم کی رقیبانہ حوصلہ مندیوں کا مقابلہ نہ کر سکا۔ ہر جگہ سفیر و وکیل نایاب و نادر کتب کی تلاش میں مقرر کیے گئے کہ ممالک مشرقیہ میں بھی جو کتاب تصنیف ہو بغداد سے پہلے اسپین آئے۔ چنانچہ علامہ ابوالفرج اصفہانی کی کتاب الاغانی کے لکھے جانے کی جس وقت خبر پہنچی تو حکم کے قاصدوں نے کتاب تمام ہونے سے قبل ایک ہزار اشرفیاں مصنف کی خدمت میں پیش کیں کہ پہلا نسخہ کتب خانۂ شاہی کے لیے محفوظ رکھا جائے۔ حکم کے کتبخانہ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ کہ صرف عربی دیوانوں کی فہرست ۸۰ صفحہ پر تھی علامۂ مقری نے مجموعی تعداد کتب چار لاکھ لکھی ہے زیادہ تر منتخب و چیدہ کتب تھیں۔ شیر شاہ اپنے زمانے کے زبردست فاضل شیخ بدھ کی اس درجہ وقعت کرتا تھا کہ خود ان کی جوتیاں سیدھی کر کے سامنے رکھ دیتا۔ سلطان فیروز شاہ بہمنی اس درجہ شغف علمی رکھتا تھا۔ کہ ہر ہفتہ میں تین روز خود طلبا کو درس دیتا۔ علما و مشائخ سے برادرانہ برتاؤ کیا کرتا تھا۔ عربی، فارسی، ترکی، روسی، بنگالی، چرکسی، افغانی، مرہٹی، گجراتی، فرنگی، گرجی وغیرہ سب زبانیں جانتا تھا۔ ریاضی میں اعلیٰ پایہ رکھتا تھا۔ اس نے ۸۱۰ھ میں دولت آباد میں ایک رصدگاہ تعمیر ہونے کا حکم دیا اور اہتمام فاضلِ عہد حسن گیلانی کے سپرد ہوا۔ سید اسمٰعیل عادل شاہ والی بیجاپور نے مولانا شہید شاعر قمی کو جو کمالات شاعری میں بے نظیر تھا عواطفِ خسروانی سے حکم دیا کہ خزانہ میں جا کر جس قدر زر تجھ سے اٹھ سکے اٹھا لا۔ چنانچہ وہ پچیس ۲۵ ہزار ہوں طلائی اٹھا لے گئے اس

بادشاہ نے ایک دن میں پچاس ہزار ہوں علمائے بیجاپور میں تقسیم کردیے۔ ایک عظیم الشان دارالعلم جونپور میں نویں صدی ہجری میں قائم کیا گیا تھا جس سے بڑا دارالعلوم دیار ہند میں تعمیر نہیں ہوا تھا۔ مولانا قاضی شہاب الدین جونپوری مدرس اول تھے سلطان ابراہیم اس درجہ وقعت و عزت کرتا تھا کہ دربار میں اپنے سامنے نقرئی کرسی پر بٹھاتا تھا۔ ایک بار اُن کی بیماری میں عیادت کو گیا تو پاس بیٹھ کر کٹورہ پانی کا اُن کے سر پر سے اُتار کر خود پی گیا اور بارگاہ ایزدی میں دعا مانگی کہ الٰہی مولانا کی تکلیف مجھے دے اور ان کو شفا عنایت کر۔ ماہم بیگم کی علمی قدردانی نے بھی دہلی میں ایک عظیم الشان کالج قائم کرادیا تھا شہزادی زیب النساء بیگم نے ایک ایسا بے نظیر کتب خانہ بنایا تھا جس کا شہرہ ایران و توران سے آگے پہنچ گیا تھا۔ شہنشاہ جہانگیر نے حیاتی کاشی کو ایک نظم کے صلے میں زر سرخ و سفید سے تلواکر چھ تھیلیاں مرحمت کیں۔ سلطان الحکماء جب شاہ مصر سے کبیدہ ہو کر چل دیے ہیں تو قدردانی کا یہ عالم تھا کہ تمام مصر پیچھے ہو لیا آخر بادشاہ بصد منت واپس لایا۔

ان واقعات پر نظر ڈالو اور چشم عبرت سے خون کے آنسو بہاؤ۔ یہ فیاضیاں تھیں جب اس کان سے ہیرے نکلتے تھے۔ اس نوعیت کی قدردانیاں تھیں جب اسلامی چمن رنگارنگ گلوں سے مہک رہا تھا۔ آہ! ے

کبھی یہ دل تماشاگاہ تھا نقش مسرت کا — اب اس میں حسرت و رنج و تمنا سیر کرتے ہیں

اُف! آج اُمید و کامرانی کی وہ شمع دل افروز جو کاشانۂ غیر میں ضوفشاں ہے وہ کبھی ہمارے ایوان تقدیر میں بھی جو اس وقت یاس و بیم کے کھنڈرات ہیں روشن تھی۔ آج باغ و بہار کے سرور و نشاط سے اغیار گذر رہے ہیں کامیابیاں حاصل کر رہے ہیں کل ہمارے خس خانوں میں بھی دیار حجاز سے نکہت تازہ نسیم لاتی اور خود چل کر آتی عبدالرحمٰن ثالث کی شمشیر خون آشام سے فرانس، جرمن، اٹلی، یونان کے شہریار لرزتے تھے۔ ہیبت سے

کانپتے تھے۔ اُس کی خوشنودی کے لیے مدینۃ الزہرا کی مایۂ روزگار عمارت کو بیش بہا اور نادر مصالح بھیج کر جان بچاتے تھے۔ اس کا عہد تاریخ اندلس کا ایک زریں باب ہے۔ طب ہیئت تاریخ۔ جغرافیہ۔ ایجادات۔ کیمیا اور طبیعیات نے اسقدر عروج پایا کہ آخر ترقی یورپ کا باعث بنی۔ دارالخلافہ اندلس قرطبہ ہی پہلا شہر ہے جس کی سڑکیں پختہ کی گئیں اور شب کے وقت ان پر لالٹینوں کی ضیا بار روشنی کی گئی۔ صرف کیمپ میں اسقدر تیز اور صاف روشنی ہوتی تھی کہ میلوں اس کی روشنی میں چل پھر سکتے تھے۔ آج لوگ یورپین طرز معاشرت اور تہذیب سے مرعوب ہوکے اسلامی ترقیوں کے منکر ہیں اور کوٹھیاں فرنیچر دیکھ کے حیران رہ جاتے ہیں لیکن قرطبہ میں صدیوں پہلے جب کہ یورپ کے اکثر حصص گہوارۂ توحش و بہیمیت بنے ہوئے تھے عرب اعلیٰ زندگی بسر کرتے تھے۔ اندازہ ہے کہ تقریباً دو لاکھ مکانات قرطبہ میں ایسے تھے جن کی ساخت اعلیٰ پتھر کی تھی ہر مکان کا دروازہ سنگ اسود اور چبوترہ سنگ رخام کا ہوتا تھا۔ اور ہر مکان کے ساتھ ایک سرسبز و سدابہار چمن ملحق رہتا تھا۔ خیال کرو اور سوچو کہ یہ حیات کیسی پُرلطف ہوگی اور تمدن اسلامی کا آفتاب اقبال دنیا پر کیسی سرور افزا و نشاط انگیز شعاعیں ڈال رہا ہوگا۔ ابن فرناس۔ ابن رشد۔ ابن ماجہ۔ ابن طفیل۔ ابوالحسن (جس نے شعاع کو ثابت کیا کہ خود ہر چیز کی تصویر آنکھ میں منتج ہے۔ اس اثبات کا نتیجہ آج فوٹو کی ایجاد ہے۔ اس وحید عصر عالم نے علم ہوا ایجاد کیا۔ اسی کا قول ہے کہ ہوا جس قدر بلند ہو اُتنی ہی سُبک و لطیف ہوتی ہے)۔ خیام۔ محقق طوسی۔ بوعلی سینا۔ غزالی۔ رازی۔ ابوریحان بیرونی۔ شیخ جبالی اور حکیم گیلانی وغیرہم سب ایک ہی درخت کے ثمر ایک ہی لڑی کے موتی ہیں۔ غرناطہ میں ۱۳۰ پن چکیاں دن رات چلتی تھیں۔ اشبیلیہ میں ایک لاکھ کارخانے تھے جہاں زیتون کا تیل نکلتا تھا۔ تصنیف و تالیف کا بحر ایسا موج زن تھا کہ ایک وقت میں قرطبہ میں ۵۱۰۔ مالقہ میں ۵۰۔ مرسیہ میں ۶۲۔ پرتگال میں ۲۵ [illegible] اور مرسیہ میں ۱۰ کتابیں [illegible] گئیں۔ [illegible] جہاں سے ہم نے تعلیم پائی ۱۲۵۰ھ میں پوپ ہونے پر اٹلی میں

اس نے دو مدرسے کھولے۔ ارقام ہندسہ کو عرب سے سیکھ کر یورپ میں رواج دیا بحسب روایت مورخ مقریزی قاہرہ میں ۴۰ کتب خانہ تھے۔ ایک پبلک لائبریری بھی تھی۔ جامع ازہر میں دور دراز ممالک کے بارہ ہزار طلبا فقہ حدیث منطق لغت فلسفہ ریاضی نجوم اور تاریخ کی تعلیم پاتے تھے۔ جن میں ریاضی و تاریخ کے موجد مسلمان ہی ہیں جنھوں نے ہر دو علوم کو علم کے درجہ تک پہنچایا۔ یونیورسٹی خاص مراکو میں مصر اندلس اور فرانس سے طلبا آتے تھے۔ یہ یونیورسٹی ۲۴۵ھ کے پس و پیش میں قائم ہوئی تھی۔ اس سے پہلے دنیا میں کوئی یونیورسٹی نہ تھی۔ سلطان محمود غزنوی نے ایک عدیم النظیر اور نفیس روزگار مسجد جامع بنائی جس میں سنگ مرمر اور سنگ رخام کے مثمن مسدس مدور مربع طرز کے تراشیدہ لگائے گئے تھے نقش و نگار کی بہار اور نقاشی و صناعی کی دلفریبی دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ فرش فروش جھاڑ فانوس و دیگر سامان آراستگی و زیبائش پہروں آنکھوں کو مصروف رکھتا تھا ولید کی جامع مسجد دمشقی اور بغداد شریف کی جامع عباسی اگرچہ گراں خرچ تھیں لیکن یہ مسجد محمودی ایشیا میں بے نظیر تھی اور عروس الفلک کہلائی جاتی تھی۔ قریب مسجد ایک عظیم الشان کالج بھی منقول و معقول کی تعلیم کے لیے قائم کیا طلبا مفت تعلیم پاتے تھے مسافر طلبا کو کتب و سامان خوراک بھی ملتا تھا۔ کالج کے متعلق ایک بڑی لائبریری تھی جس میں دور و دراز سے کتب نادرہ منگا کر جمع کی گئی تھیں۔ ابن ہیثم نے معرکۃ الآرا مسئلہ روشنی کی حرارت و جسمیت کو نہایت زبردست دلیلوں سے لباس ثبوت پہنایا۔ سرزمین ہند کا قابل فخر بادشاہ شیر شاہ سور ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ اُس نے اپنے مختصر عہد میں جس قدر رفاہ عام کے کام انجام دیے اُس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ قلعہ رہتاس گڈھ (پنجاب) سے ستار گاؤں (بنگالہ) تک (چار ماہ کا رستہ ہے) آگرہ سے برہان پور تک۔ آگرہ سے چتوڑ تک اور لاہور سے ملتان تک چار مہتم بالشان اور بے بدل سڑکیں بنائیں جن پر دو طرفہ میوہ دار درخت کوس کوس بھر پر ایک ایک سرا۔ ایک ایک مسجد ایک ایک کنواں۔ ہر مسجد میں ایک

موذن ایک امام تھا۔ مسافروں کے کھانے پکانے اور خدمت کے لیے ایک ہندو ایک مسلمان کو ہر سرا میں متعین کیا۔ سب سڑکوں پر سترہ سُو سرائیں تعمیر ہوئیں۔ ہر سرا میں جدا جدا مکان تھا۔ مویشی کے لیے چارہ تک مفت ملتا تھا۔ ہر سرا میں ایک جمعدار چند چوکیدار حفاظت کو مقرر تھے۔ انتظام کا یہ عالم تھا کہ ایک بڑھیا اشرفیوں کا طباق لیے جہاں چاہے چلی جائے۔ چور کی مجال نہ تھی جو آنکھ اُٹھا کر دیکھتا۔ ان سرائوں کے اخراجات کے لیے بہت سے گاؤں وقف تھے۔ عالمگیر نے بھی نل لگا کر آب رسانی کا سررشتہ قائم کیا تھا۔ زبیدہ بیگم نے نہر زبیدہ جاری کر کے شہرتِ دوام کا دامن تھام لیا۔ نورجہاں و جہاں آرا نے عالیشان سرائیں تعمیر کرائیں جن کا ذکر برنیر حسرت کے ساتھ کرتا ہے کہ کاش پیرس میں بھی کچھ ایسی عورتیں ہوتیں تاکہ مسافرین کو حیرانی نہ ہوتی۔ شیر شاہی لنگرخانوں کا خرچ پانچسو اشرفی روز تھا جہاں غربا کو عمدہ کھانے ملتے تھے۔ اس کے علاوہ معذورین اور پردہ نشینوں کے روزینے مقرر تھے۔ شہنشاہ عالمگیر ایک لاکھ چالیس ہزار روپیہ (۱۴۰۰۰۰) سالانہ فقرا کو تقسیم کیا کرتا تھا۔ عہد ولید میں اندھوں معذوروں کی امداد کو علاوہ وظیفوں کے ایک آدمی نوکر رکھا جاتا تھا جس کے مصارف سرکار سے ملتے تھے۔ غرض غربا پروری اور مسکین نوازی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا جاتا تھا۔

سولھویں صدی عیسوی تک دنیا کے ہر حصہ میں اسلامی حکومتیں موجود تھیں تونس میں دولتِ بربریہ۔ الجزائر میں حکومت عرب۔ مراکش میں شرفائے بنی فاطمہ سوڈان و مصر و شام میں ترکانِ عثمانی اور ایران میں سلطنتِ صفویہ قائم تھی۔ توران و ترکستان و ماوراءالنہر و قبچاق میں (وہ ملک جو ایشیائی روس کہا جاتا ہے) دولت ازبکیہ کی متعدد شاخیں اعلائے اسلام کر رہی تھیں۔ ارض کریمیا کے حاکم بھی مسلمان ہی تھے۔ اور ہندوستان کی سبھی حکومت بھی اُن دنوں سلاطین تاتار ہی کے زیر فرمان تھی۔ زنجبار، مڈگاسکر، سقوطری دار السلام

و ذالی واحات غرض کہ برّاعظم افریقہ کی تمام چھوٹی چھوٹی ریاستیں اسلامی۔ جواب محکوم ہیں آزاد وخودمختار تھیں اور پورے برّاعظم کی شہنشاہی مسلمانوں پر ہی مسلّم تھی اسی طرح سواحل عرب بحرین وخلیج فارس ومجمع الجزائر جاوا وفلپائن وجزائر غربی وشرقی ہندوستان وغیرہ وغیرہ جنمیں آج ایک بھی آزاد نہیں۔ اُس زمانے میں سب فرمانبردارِ عرب تھے۔ اور اغیار کا کوئی اثر نہ تھا۔ ہندوستان میں سلطنت مغلیہ اور روم میں دولت اسلامیہ عثمانیہ کا شباب تھا تخت دہلی کو شہنشاہ اکبر اور تاج قسطنطنیہ کو سلطان سلیمان خان اعظم سے عزت حاصل تھی جس کی فتوحات کا سیلاب ہنگری و پولینڈ تک پہنچ چکا تھا اور دنیا کی بڑی سے بڑی طاقتیں اُس سے لرز رہی تھیں۔ امریکہ و اسٹریلیا کے خطے ان دنوں بالکل مجہول حالت میں تھے۔ اُن کو مستثنیٰ رکھتے ہوئے بھی کرۂ ارض کا دو کروڑ مربع میل سے زائد رقبہ مسلمانوں کے زیر حکومت تھا۔ جس میں پچیس ۲۵ عظیم الشان اسلامی سلطنتیں قائم تھیں اور ۹۰ فیصدی انسانی آبادی اُن کے ماتحت تھی۔ دنیا کا کوئی ایسا حصہ نہ تھا جس پر اُن کی سطوت وجبروت کا سکہ نہ بیٹھ چکا ہو اور کوئی ایسی قوم نہ تھی جو اُن کی یا اُن کے تمدّن کی محکوم نہ رہی ہو۔ غرضیکہ مسلمانوں سے کائنات کے خزانوں کو ہمیشہ اپنے استقلال سے رکھا اعتدال سے برتا پردہ عالم پر رنگا رنگی وسریع عروج کی حیرت انگیز مثال قائم کی۔ اُدھر میدان شجاعت وجانبازی میں کسریٰ وقیصر کو نیچا دکھایا ادھر معرکہ فضیلت میں یونان کو دبایا۔ یورپ کو سکھایا۔ اندلس فتح کیا۔ آسمان علم سے ایجاد کے تارے توڑ لائے۔ علم وہنر کے دریا بہا دیے۔ فلک علم کا مہر عالمتاب اگر بغداد وقاہرہ کے میناروں پر جگمگایا تو نہایت شان وعظمت قرطبہ وغرناطہ کے گنبدوں پر چمکا۔ جو بیج حضور آقائے نامدار صلے اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں خاک پاک مکہ میں بویا گیا وہ بسرعت وحیرت بڑھا پھلا پھولا۔ اُسکا درخت زیر سایہ افضائے عالم پر محیط ہو گیا۔ ایک دنیا نے اُس سے راحت وعافیت پائی۔ مگر افسوس ہم نے خود اسکی جڑ پر تیشہ زنی شروع کر دی اور نتیجہ وہی ہوا جو ہم ناعاقبت اندیشوں کے لیے مقدر تھا ہماری صورتیں مسخ ہو گئیں ہمارے اخلاق بگڑ گئے نہ وہ ہم رہے

نہ وہ ہماری محسود عالم ترقیاں۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہم اُن اسلاف کے خلاف نہیں۔ آہ! اب ہم میں زمانہ سے سبق لینے اور عبرت آموزی کرنے کا مادہ بھی نہیں رہا صفت ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور بدرجۂ اتم ہم میں پیدا ہوگئی کبھی ہم وادی الکبیر پر وضو کرتے تھے تو گنگا پر نماز ہوتی تھی۔ دوزخ میں سوتے تھے تو صبح جنت میں نمودار ہوتی تھی۔ وانتم الاعلون ان کنتم مومنین کا توقع بار اور دلفریب سبق بھلا دیا بمت اعرض عن ذکری کی وعید و تاکید کو فراموش کردیا۔ اس لیے ضربت علیھم الذلت کے مورد بنے اور لہ معیشۃ ضنکا کی شرمناک پُرانذوہ سزا پائی۔ آج ہم کرب و نکبت کے قصر آب میں تختہ بند ہیں مگر احساس نہیں۔ ذلت و تحقیر کی جوتیاں کھاتے ہیں مگر شرم نہیں آتی۔ کیونکر مانیں کہ ہم ایک عظیم الشان و غیور قوم کے خلف ہیں دنیا ہم پر ہنستی ہے قہقہہ لگاتی ہے مگر ہماں "چنیں خفتہ اند کہ گوئی مردہ اند" کے مصداق بنے ہوئے ہیں ہماری ترقی کی بنائیں علم قرآن کی اتباع پر استوار ہوئیں۔ اول ہم نے علم سیکھا مسلمان بنے واعتصموا بحبل اللہ کی ریشمی ڈوریاں تھامیں۔ یکدلی یکجہتی کے پھول چنے۔ نفاق و شقاق کے کانٹے ہٹائے۔ ایک ہی خمخانہ کے جرعہ نوش بنے غیریت کے نقاب اٹھ گئے پھر کیا تھا نازنین مقصود بہ آغوش وا سامنے آگئی۔ دل آرائی کے جھوٹے نظر آئے۔ روح اسلام ایک پھریری لے کر شاداب ہوگئی۔ اور آن کی آن میں وہ کوہ شکن طاقت آگئی۔ کہ قیصر و کسریٰ کی وسیع و مقتدر حکومتیں پاؤں پڑی ہوئی دکھائی دیں۔ اور دیکھتے دیکھتے مسلمان دنیا پر چھا گئے اور وہ سطوت و اقتدار حاصل ہوا کہ عالم حیران رہ گیا۔ اور اُفق عرب سے ایک ایسی تیز اور نورانی روشنی آنی شروع ہوئی کہ دنیا کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ مراکو سے چین تک اور ہند سے روس تک ایک عالم جگمگا اٹھا۔ وہ شمع جہاں افروز جو برسوں گھر گھر ضو فشانیاں کرتی رہی تھی آج باد مخالف کے جھونکوں سے جھلا رہی ہے۔ بحر خونیں ہماری کشتی اُمید کو سپرد تلاطم یاس کر رہا ہے۔ وہ شجر جس پر آج خزاں کی حکمرانی ہے۔ کل موسم بہار کے روح پرور جھونکے اس کے محکوم تھے۔ یہ خشک جھیلیں اور نم نا آشنا آبشار

آج افسردہ ہیں مگر کل امرت کی لہریں ان ہی میں کھیلتی تھیں۔ زخم جگر کی تکلیفیں آج جتنی بھی ناگزیر ہوں جائز۔ کیونکہ کل کثرت تعیشات سے رگ گل کے نشان بھی جسم پر بار و ناگوار تھے۔ آہ مصیبت وکلفت کا احساس غم و ماتم کی شکل میں جسقدر بھی صعب و شدید ہے وہ اس لیے کہ امید واروں کی بخشش بے اندازہ برسوں سہل انکار رہی ہے۔ نا اتفاقی و نفسانیت کے جراثیم نے جب جسد قومی میں سرایت کی نظام ہوش و حواس بگڑ گیا جس دن کہ شاہراہ شریعت سے ہٹے آج تک پھر عافیت میسر نہ ہوئی۔ ہم کو اب عیش و سرور کے زمزمے اور مسرت و انبساط کے نغمے بھی ملول و حزیں کرتے ہیں شیشہ و ساغر کی کشش دلفریب دونی خلش و بیزاری پیدا کرتی ہے۔ گلگشت چمن جگر میں درد اور دل میں اضطراب کے نشتر چبھوتی ہے۔ سیر گلستاں کا لطف خلوت کدۂ دماغ میں تخیلات کی اعانت سے عجیب تصورات بناتا اور روح میں افسردگی پیدا کرتا ہے۔ عیش و مسرت بھی آکر دل مضطرب کو اور بیقرار کر جاتے ہیں۔ طبیعت میں حسرت و یاس کا ہجوم رہتا ہے۔ بزم کہن کی یاد ہمارے دن کو رات بنائے ہوئے ہے ؎

گئی باغ دہر سے فصل گل نہیں بلبلوں کا وہ شور و غل
نہ وہ چہچہے نہ وہ جام و مل نہ شراب ہے نہ کباب ہے

شمس لطیف احمد مراد۔

دیوان حسرت موہانی

مکمل یعنی حصۂ اول و دوم مع ضمیمہ یعنی ۱۸۹۴ء سے ۱۹۱۶ء تک کا کلام۔ قیمت صرف بارہ آنہ

المشتہر
منیجر تمدن نیا گاؤں لکھنؤ

میاں پوست

نئی روشنی کے نئے پوت ہیں مگر دیکھنے میں میاں پوت ہیں
بالکل انوکھا اچھوتا۔ اخلاقی ظریفانہ ناول پڑھیے اور ہنستے ہنستے لوٹ جائیے۔ پسند ہونے پر میاں پوست خوندہ کا ہیں قیمت ۸ر پتہ ذیل سے مصنف سے طلب کیجئے

المصنف
ماسٹر باسط بسوانی بسوان ضلع سیتاپور (اودھ)

حدیث فکری

میں اپنی خواب غفلت سے بیدار ہوا اور میرے عقل و شعور نے اپنے غلاف سے منھ نکالا! لیکن کس طرح؟ جیسے عروس صبح شب تاریک سے اپنا جلوہ نمایاں کرتی ہے۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک نئی دنیا میں ہوں۔ میرے پاس لذت بھی ہے اور حیرت بھی، فرحت بھی ہے اور مسرت بھی، چڑیاں چہچہا رہی ہیں۔ درختوں کی شاخیں رقص میں مصروف ہیں۔ پھولوں کی مہک، اور سبزے کی لہک سے دماغ تر و تازہ ہو رہا ہے آنکھیں نظارت حاصل کر رہی ہیں دل تفریح پا رہا ہے۔ یہ نظارۂ جاں بخش دیکھ کر بے اختیار میری زبان سے نکل گیا۔

"اے پاک پروردگار! اے فاطر السموات والارض بے شک تو ہر تعریف کا مستحق ہے"

میں جو منظر اس وقت اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں وہ اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اور جو باتیں اس وقت سن رہا ہوں وہ کبھی نہ سنی تھیں۔ یہ امر مجھے ہزارہا مرتبہ پیش آیا۔ لیکن ایسی صورت کبھی نہیں واقع ہوئی۔ یہ خفا اور ظہور کیا ہیں؟ اور اس سے پہلے یہ احساس کہاں تھا؟ یارب! یہ خاموش چیزیں میری کچھ نہیں سنتیں۔ میں اپنا درد دل کس سے پوچھوں اور کون مجھے تسلی بخش جواب دے گا۔ ہاں! میں ان سے پوچھتا ہوں۔ وہ جواب دیتی ہیں لیکن میں نہیں سمجھتا۔ مگر یا اللہ! میں ایسی چیز کے بیان پر کیونکر صبر کروں اور ان چیزوں سے کیسے قطع نظر کروں جس کا تعلق تیری ذات سے ہے۔ کیا یہ بالکل ایسا ہی ہے، جیسے پتے خشک ہو ہو کر جھڑ جاتے ہیں اور کونپلیں پھوٹتی ہیں، پھر وہ خشک ہو جاتی ہیں۔ لکڑیاں بنتی ہیں اور جل کر راکھ

ہو جاتی ہیں۔ کیا میں اسے سورج سمجھوں جو پہلے اپنی روشنی کو زمین کے ایک رخ پر ڈالتا ہے پھر دوسری جانب۔ غرض اس طرح وہ اپنی جگہ تو بدلتا رہتا ہے لیکن خود متغیر نہیں ہوتا

میں نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا اور منتظر تھا کہ شاید کوئی جواب ملے جو زخم جگر کا مرہم ہو۔ لیکن سب مبہوت! زمین کی طرف نظر ڈالی وہاں بھی یہی عالم دیکھا یا اللہ! کیا میرے سامنے وہی فضا ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں؟ وہی دریا ہے جس کا کوئی ساحل نہیں؟ جس میں کبھی تو تجلیات نور مرکوز ہوتی ہیں اور کبھی حجاب ظلمت۔ کبھی روشنی پھیل جاتی ہے اور کبھی گھٹا ٹوپ اندھیرا آجاتا ہے نہیں معلوم یہ منظر عظیم کیا ہے۔ اگر ان کے نام سے واقفیت ہوتی تو ممکن تھا کہ اسرار سربستہ کھل جاتا۔ مگر نہیں! نام سے اس حقیقت کا پتہ کیا لگ سکتا تھا جس کی سب مجھے تلاش ہے۔ دیکھو پھر روشنی پھیلی، نور نمودار ہوا۔ لیکن کیا اس لیے کہ مجھے پہچانے یا اس لیے کہ میں اسے پہچانوں۔ یہ تعلق میرے لیے تھا یا اس کے لیے یا ہم سب اس نور کے لیے تھے یا یہ نور ہمارے سب کے لیے تھا۔ مگر خیر کچھ بھی ہو۔ ہم سمجھ گئے کہ اے نور اگر تو نہ ہوتا تو ہم کسی کو نہ پہچانتے اور ہم نے اب پہچان لیا کہ تو کیا ہے۔ لیکن تب بھی یہ نہیں پہچانا کہ کیونکر پہچانا۔

آسمان و زمین کی وسعت اور ان کی عظمت کس قدر ہے وہ کتنی وسیع اور کتنی عظیم ہیں۔ لیکن باوجود اس کے میں نے اسکو ایک ایسی لوح پر نقش کیا ہے جو میرے دماغ میں محسوس بھی نہیں ہوتا ہے۔ دریا یہ سمندر میرے سامنے موجیں مار رہا ہے اور بہت بڑا ہے لیکن میرے نزدیک اسکی کوئی حقیقت نہیں۔ نہ میں اسکی حقیقت کرتا ہوں نہ عظمت۔ لیکن کیوں؟ ہاں شاید اس لیے کہ وہ محدود ہے بہت چھوٹا ہے جو ابھی طلوع ہوا ہے لوگ کہتے ہیں بہت بڑا ہے مگر میری نظروں میں بہت چھوٹا ہے۔ کیوں؟ اسلیے کہ وہ خود اسی دریا کا قطرہ ہے

جو غیر محدود ہے۔

میں نے اس وقت سمجھا کہ یہ تمام بڑی بڑی چیزیں باوجود بڑی بڑی ہونے کے اس شے سے کوئی نسبت نہیں رکھتیں جو غیر محدود ہے۔ اسلیے جن چیزوں کو میں محسوس کر سکتا ہوں۔ ان سے نہ میری پیاس بجھ سکتی ہے نہ وہ میرے درد کی درماں ہو سکتی ہیں۔ یہ جتنی چیزیں ہم کو بیتیں اور جن کو دیکھ کر ہم خوش ہو جاتے ہیں، جنھوں نے ہم کو موہ لیا ہے، وہ ہماری بھی مسخر ہیں لیکن کیا؟ ہم باوجود اس قدر چھوٹا سا جسم رکھنے کے ان لوگوں سے بڑھ کر ہیں۔ نہیں: یہاں پھر حیرت نے دامن پکڑ لیا اور ان درختوں سے جو نئی دلھنوں کی طرح آہستہ آہستہ سوال کیا۔ لیکن یا تو انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یا جواب دیا اور میں اُن کی سرسراہٹ کو سمجھا نہیں۔ پھر میں نے رقص کرنے والے کبوتروں سے دریافت کیا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ یا اُن کی غٹرغوں" میری سمجھ میں نہ آئی۔ بہر صورت مجھے ان چیزوں سے اُنس تھا کیونکہ وہ میری مانوس تھیں، محبوب تھیں، مطلوب تھیں، آخر کار میری محبت ان سرسبز جھومتے والے درختوں سے، گانے والے پرندوں سے بڑھی اور اتنی بڑھی کہ میں ان کے کلام کی تفسیر کرنے لگا۔ انھوں نے مجھ کو حیات کے معنی سمجھائے اور مجھے میرے نفس کی طرف رجوع کیا۔ یہی میری گم شدہ متاع تھی جو میرے بغل میں تھی لیکن اس کی جستجو نے مجھے سرگرداں کیا۔ اس کی تلاش مجھے محدود عالم کے گوشے گوشے میں پھرا لائی۔ اب میں اپنے نفس کی طرف متوجہ ہوا اور اسکی گفتگو پر غور کیا۔ تو اس نے کہا یقیناً میں اسی چھوٹے ذرہ کا ایک نہایت چھوٹا ذرہ ہوں جو آسمان کے درمیان حرکت کر رہا ہے۔ اور اس ذرہ صغیرہ میں بھی ہزارہا ایسے ذرے ہیں جو اس ذرے سے اربوں کی نسبت نہیں رکھتے ان میں سے ہر ایک ذرہ میں حیات موجود ہے، ہاں البتہ ذرے ایسے ہیں کہ اگر ان کی وضع میں فساد واقع ہو تو تمام ذروں سے حیات زائل ہو جاتی ہے، اور یہی وہ ذرہ ہے جس کے مجموعہ سے جسم انسانی تکون ہوتا ہے، اس بات سے میری سمجھ میں یہ آیا کہ حیات ایک ادراک اور حرکت ہے جو ان تمام ذروں میں ساری ہے۔

و ق قمر

فن طب زمانۂ جاہلیت میں

ان بہت سے علوم و فنون میں سے، جنکی بنیادیں ازمنہ قدیمہ میں پڑ چکی تھیں، ایک فن طب بھی ہے۔ جس کا سنگ بنیاد اور حجر اساس کلدانیوں کے ہاتھوں رکھا گیا، اور آیندہ چل کر اس پر مرور زمانہ نے بڑی بڑی عالیشان عمارتیں قائم کیں، کلدانی ہی دنیا میں پہلی قوم ہے جس نے امراض کے علاج کے متعلق غور و فکر، تفحص و تجسس سے کام لیا اور موجد فن طب ہونے کا سنہرا تاج اپنے سر رکھا، اور پھر دنیا کی اور قوموں نے ان سے یہ لطیف فن سیکھا عربوں نے بھی، اس فن کو کلدانیوں ہی سے حاصل کیا، جب یہ یونانیوں کو ملا، تو چونکہ خدا عز و جل نے ان کے دل و دماغ کو نہایت مناسب بنایا تھا، انھوں نے اسے نہایت مستحکم اور استوار کر دیا، اس کے بابوں کی ترتیب دی، اس کے ہر حصہ کو الگ الگ بیان کیا، ان سے رومیوں اور فارس والوں نے لیا، چونکہ ان ممالک کا ہمعصر عرب تھا، عربوں نے کچھ یونانیوں کے طب سے انتخاب کیا، کچھ کلدانیوں سے حاصل کیا اور کچھ خود اپنی اس دماغی قوت سے کام لے کر جو ذات واحد کی طرف سے اس خطۂ زمین کے بسنے والوں کو خاص طور پر عنایت ہوئی تھی، ایجادات و اختراعات کئے ان مواد سے ان کے پاس وہ چیز تیار ہو گئی جسے ہم "زمانۂ جاہلیت کا فن طب" سے تعبیر کرتے ہیں، جو آج تک بوادی اور دیہاتوں کے بسنے والوں میں بکثرت پایا جاتا ہے۔

ان کے مطب کرنے کے دو طریقے تھے، ایک تو کاہنوں اور عرافین کا طریقہ دوسرا دوا اور علاج کا، کاہن اور عرافین، افسوں، جادو، سحر، تعویذ اور گنڈے وغیرہ سے علاج کرتے تھے (جس کو ہمارے ہاں جھاڑ پھونک کہتے ہیں) یا خانہ کعبہ میں ذبیحہ ذبح کرنے اور اس میں جا کر دعا کرنے یا مریض سے تاوان دلاتے تھے (غالباً یہی طریقہ ہمارے ہاں صدقہ کی صورت میں ہے) وہ جماعات قدیمہ اور اقوام متقدمہ جو سحر جادو اور تعویذ وغیرہ سے علاج کرتی تھیں، مشہور چلی تھے، اور ان کو اپنے اگلوں [illegible] ملے تھے جن کے ذریعہ سے

وہ مریضوں کا علاج کرتے تھے، جب وہ کسی مریض کا علاج کرنے جاتے تو ان کے ساتھ دو خادم ہوتے تھے، ایک تو دعا اور تعویذ کا دفتر لیے ہوتا تھا، دوسرا بھی دواؤں کا صندوق لیے چلتا تھا، اپنے تعویذ گنڈوں سحر اور جادو میں وہ اپنے کسی معبود، خصوصاً ایزیس اور ذیرکس یا ذرع کی طرف دھیان کرتے تھے، اور ان کا نام بھی لیتے تھے، دواؤں کے بنانے کے وقت کچھ الفاظ اپنی زبان سے کہتے تھے، مثلاً:-

"یہی کتاب الشفا ہے، پس کیا ایزیس مجھکو شفا نہیں بخشے گا، جس طرح اس نے حورس کو ان تمام مصائب اور آلام سے نجات دی، جو اسکو اسکے بھائی ست کی طرف سے پہنچے تھے، جب اس نے اسکے باپ اوزیریس کو قتل کیا تھا، پس اے ایزیس تو جو بہت بڑا جادوگر ہے، مجھکو شفا بخش، مجھکو ہر برائی، شیطانی کام اور ہر قسم کے مہلک امراض سے نجات دے، جس میں تو مجھ کو مبتلا کرتا ہے جس طرح تو نے اپنے بیٹے کو نجات دی ......"

یہی دعا دوا پینے کے وقت بھی پڑھتے تھے، ان لوگوں کے پاس ارواح قبیحہ کے، جو انکے خیال کے مطابق امراض کا سبب بنتی تھیں، نکالنے کی دعائیں تھیں، انھیں خیالات کی بنا پر عرب جن اور شیطان کے نکالنے کے لیے اپنے بتوں کے نام کی دعائیں اور سحر پڑھتے تھے، اور اسیطرح جب انکو وبا کا خوف ہوتا تھا تو وہ گدھوں کی طرح چیختے تھے، اُن کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے وہ وبا سے محفوظ رہیں گے، ان کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ بادشاہوں کا خون ہلاکت سے نجات دیتا ہے۔

لیکن جڑی بوٹیوں سے علاج کرنے میں وہ مصریوں اور دوسری قدیم قوموں کے مشابہ تھے، مفرد بوٹیوں اور پینے کی چیزوں خصوصاً شہد سے علاج کیا کرتے تھے، پیٹ کے امراض کے علاج کرنے کا طریقہ تھا امراض کے علاج کی آخری صورت اُن کے ہاں زخم کرنا، فصد لینی اور داغ کرنا یا چھ کرنا، تھی، انکا قول تھا کہ ہر مرض کا آخری علاج اس عضو پر داغ لگانا ہے جس میں وہ مرض ہو، بہت سے لوگوں کے علاج کرنے کا قاعدہ یہ تھا کہ اس عضو کو بالکل کاٹ کر جدا کر دیتے تھے، جیسا کہ آج بھی بڑے بڑے ماہر ڈاکٹر سانپ کے کاٹے ہوئے عضو بدن کو جسم سے الگ کر دینے کا مشورہ دیتے ہیں، جب انھیں کسی آدمی کا کوئی عضو کاٹنا ہوتا تھا تو اسے آگ کے کنارے گرم کرتے تھے اور پھر کاٹ ڈالتے تھے، چنانچہ انھوں نے صخر بن عامر اور فضا کے بھائیوں کے ساتھ یہی معاملہ کیا تھا، جو آدمی احول ہوتا تھا اسے اطبا حکم دیتے تھے کہ وہ تکلی کو چلنے کی حالت میں دیکھے، انکا خیال تھا کہ آنکھ اسی سے قائم رہتی ہے، معالجہ کے ان طریقوں میں سے جنکو ہم نے ابھی گنایا ہے ایک عجیب طریقہ یہ بھی تھا کہ جب کوئی عورت ڈرتی تھی تو اسے گرم پانی پلاتے تھے تاکہ اس کا دل ٹھنڈا ہو جائے۔

محمد اسمعیل

کلامِ جوہر

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

اک شہر آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل
ہل من مزید کہتی ہے رحمت دعا کے بعد

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

لذت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں
آتا ہے لطفِ جرمِ تمنا سزا کے بعد

ممکن ہے نالہ جبر سے رک بھی سکے مگر
ہم پر تو ہے وفا کا تقاضا جفا کے بعد

غیروں کے ساتھ ہم سے الگ حیف ہے اگر
یہ بے حجابیاں بھی ہوں عذرِ حیا کے بعد

کیا زندگی وہ جس میں کوئی آرزو نہ ہو
رہتی ہے موت ہی دلِ بے مدعا کے بعد

ہے کس کے بل پہ حضرتِ جوہر یہ روکشی
ڈھونڈھیں گے آپ کس کا سہارا خدا کے بعد

خوگرِ جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی
اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی

خوفِ غماز، عدالت کا خطر، دار کا ڈر
ہیں جہاں اتنے، وہاں خوفِ خدا اور سہی

رتبِ عزت کے لیے بھی نہ رہتے دو خطاب
تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

دل دویں جا ہی چکا جان بھی جاتی ہو تو جائے
ترکشِ ناز میں اک تیرِ قضا اور سہی

حکمِ حاکم نہ سہی مرگِ مفاجات سے کم
ملک الموت پہ ایماں کی سزا اور سہی

ہم وفاکیشوں کا ایماں ہی ہے پروانہ صفت
شمعِ محفل جو وہ کافر نہ رہا اور سہی

جس نے ہنگامۂ عدالت کا تری دیکھا ہے
اس گنہگار کو اک روزِ جزا اور سہی

عہدِ اول کو بھی اچھا ہو جو پورا کر دو
تم وفادار ہو تھوڑی سی وفا اور سہی

؎ مسٹر محمد علی بی۔ اے (آکسن)

مُکالمۂ محبّت

(ماخوذ از نظم سروجنی نائڈو صاحبہ)

(۱)

چاند سے مکھڑے کی جھلک ہم کو دکھا دو تم ذرا — مُنھ پہ ہے یہ نقاب کیوں اسکو اُٹھا دو تم ذرا
پھولوں کے گجرے خوشنما چوٹی میں یہ پڑے ہوئے — بال یہ اسقدر سیاہ کیوڑے میں سب بسے ہوئے
جھالریں ریشمی تری نیند کو جو اُڑاتی ہیں — بالوں کی یہ لٹیں مُنھ پہ جو ڈھلکے آتی ہیں
طرفہ چھڑوں کی یہ صدا اور بھی دلگداز ہے — پاؤں میں جو کڑیاں ہیں یہ کوئی نے نواز ہے
غنچۂ دل کھلے ذرا روح فزا نظر فزا — زلفِ سیہ کا لخلخہ [illegible]ش میں سنگھائیے ذرا

(۲)

تیرے دکھانے کے لیے چہرہ میں اپنا کھولدوں — میرے دھرم کی ننگ ہے ایسا میں کس طرح کروں
گاؤکشی جو کرتے ہیں اُنکی میں آشنا بنوں — بیٹھے بٹھائے اپنے سر کیوں یہ عذاب مول لوں
اپنے حواس میں نہیں ہو گیا ہے تری ہوا — چھوڑ دوں ذات والوں کو دشمنوں کے لیے بھلا
ایسی ہیں نا سمجھ نہیں آ کے تمھاری بات میں — کرکے تمھارا میں کہا بٹہ لگاؤں ذات میں
تری ہی ذات والوں نے خون بہت بہایا ہے — تری ہی ذات والوں نے دیویوں کو مٹایا ہے
برسوں سے ہوتے آئے ہیں جھگڑے لڑائی دشمنی — میرے تمھارے لوگوں میں بن نہیں سکتی ہے کبھی

(۳)

میری ہے آہیں کیا خطا میں نے تمھارا کیا کیا — سوچو تو دل میں مہ لقا ہوتے ہو مجھ پہ کیوں خفا
دیر ہو یا حرم سرا کعبہ ہو یا ہو بت کدہ — مذہب عشق کو بھلا ان سے کہاں کا واسطہ
عشق میں دونوں ایک ہیں نغمۂ سنکھ یا اذاں — شیخ ہو یا ہو برہمن دونوں ہیں ہمقدم یہاں
آنسو اگر بہا دیے آنکھوں نے آ کے جوش میں — اشک بتاں کی شست و شو دھو گئی ساری کلفتیں

مانو وفا کا تم کہا چھوڑ دو خیال ذات کا
جانے دو پچھلی باتوں کو آؤ گلے ملو ذرا

وفا صدیقی

غنچہ و شاعر

(شاعر)

بہار باغ کے مہمان شادکام ہے تو
چمن کے ہاتھ میں عشرت کا ایک جام ہے تو
شمیم گل سے ہے لبریز عطرداں تیرا
ہے عندلیب تری اور گلستاں تیرا
چمن میں اپنا تجھے دل سمجھ رہا ہے کوئی
خوشی سے کانٹوں میں تیرے الجھ رہا ہے کوئی
مگر کہیں نہ غضب ڈھائے یہ جمال ترا
ڈرا رہا ہے مجھے تو غم مآل ترا
نظر سے اہل جہاں کے نہ ہو گیا روپوش
ہوا تو صحن گلستاں میں آ کے جلوہ فروش
صبا کا جھونکا جو تیری طرف کو آتا ہے
تو جھوم جھوم کے کیسا تو مسکراتا ہے
خزاں کا خوف نہ گلچیں کا کوئی ڈر تجھکو
مآل حسن کی شاید خبر نہیں تجھکو

غنچہ

مرا وجود مرقع ہے میری حالت کا
یہ انبساط تقاضا ہے میری فطرت کا
مآل کار پہ رکھوں نظر تو ہوں مغموم
میں لطف زیست سے تیری طرح رہوں محروم
اصول زیست سے آشنا نہیں ہے ابھی
یہ ایک راز ہے تو جانتا نہیں ہے ابھی
زیادہ مجھ سے نگہباں ہے میرا رب قدیر
بدل نہ جائے گی گریہ سے کچھ مری تقدیر
ہے دست خالق عالم میں جب مرا انجام
مصیبتیں بھی ہیں تجھ کو نشاط کا پیغام
جو زخم دل کا مرے رفتہ رفتہ چھپاتا ہے
تو رنگ برگ مسرت سے اور کھلتا ہے
دکھا دکھا کے تبسم سے شبنم رنگیں کو
لبھا رہا ہوں میں خود ہی نگاہ گلچیں کو

غرض یہ ہے مری ہستی کسی کے کام آئے
یہ شبنم نذر مرا شاخ پہ نہ مرجھائے

محمود اسرائیلی

مزے

اغنیا کو نہیں حاصل زر و دولت کے مزے
متوکل کو جو ملتے ہیں قناعت کے مزے

دیکھو اشرار کا کیا حال گناہوں سے ہے
پوچھو ابرار سے کیسے ہیں عبادت کے مزے

زر سے حاصل ہی نہیں منعمِ جاہل کو وہ لطف
عُلما لیتے ہیں جو علم کی دولت کے مزے

جن کو غیرت نہیں ذلت میں بسر کرتے ہیں
شُرفا جانتے ہیں غیرت و عزت کے مزے

مُبتلا رنج و مصیبت میں ہیں، جو کاہل ہیں
محنتی سے تو ذرا پوچھیے راحت کے مزے

جو نہیں ہارتے ناکامیوں سے بھی ہمت
کچھ انھیں لوگوں کو معلوم ہیں ہمت کے مزے

اب وہ شوکت ہے کہاں قبر میں کیا ہوگا حال
جا کے جمشید سے اب پوچھیے عشرت کے مزے

جن کی نیت ہو بری ہوتے ہیں وہ رسوا بھی
پاک طینت ہی کو ملتے ہیں محبت کے مزے

کسی ناکام کے کام آؤ تو کچھ لطف ملے
کیا کہیں تم سے کہ کیا کیا ہیں اعانت کے مزے

بُخل سے زیست کا ملتا ہی نہیں کچھ بھی مزہ
کر دو بخشش تو ہوں معلوم سخاوت کے مزے

ذلتیں پاتے ہیں ارذال خیانت کے سبب
کچھ شریفوں ہی کو ملتے ہیں امانت کے مزے

اپنے کردار سے ہوتے ہیں ستمگر برباد
لیتے ہیں منصف و عادل ہی عدالت کے مزے

عافیت کی وہی کچھ قدر کیا کرتے ہیں
یاد رکھتے ہیں جو ایام مصیبت کے مزے

وہی کرتے ہیں اطاعت کی ذلت کو پسند
کچھ بھی معلوم نہیں جن کو تجارت کے مزے

ہو جو بیکار تو بیکار کی فکریں نہ کرو
ہاں کرو کچھ کہ ملیں صنعت و حرفت کے مزے

کرتے رہتے ہو جو بدگوئی احباب ذہین
آپ کے دل سے کوئی پوچھے مروت کے مزے

ذہین

غزلیات

حضرت حسرت موہانی

پوچھا بھی تو اُس نے نہ کبھی گھر سے نکل کر شرمندہ ہیں نالے دلِ مضطر سے نکل کر
پائی ہے جگہ پاکی دامانِ نظر میں خوشبوے حیا نے تری چادر سے نکل کر
کیا چیز تھی ساقی وہ پسِ پردہ مینا جو سُرخ پری بن گئی ساغر سے نکل کر
دیکھا جو کہیں گرم نظر بزمِ عدو میں وہ ڈانٹ گئے مجھ کو برابر سے نکل کر
بن جاتی ہے دل میں خلشِ خارِ تمنا جھنکار ترے پاؤں کے زیور سے نکل کر
پُر نور کیا خوب شہیدوں کے دلوں کو چاہت کی چمک نے ترے خنجر سے نکل کر
حسرت مجھے بھاتی ہے پریشانیٔ دل بھی
آئی ہے جو اُس گیسوِ ابتر سے نکل کر

مرسلہ بیگم حسرت موہانی

حضرت شوق قدوائی لکھنوی

وصل کے وعدہ سے پھر کیوں یہ ستم ہونے لگا ہجر کی خو سے مرا درد اب تو کم ہونے لگا
ہوگئی شاید وہاں میری وفا بے اعتبار ہر ستم کے بعد ہی عذرِ ستم ہونے لگا
یا گھٹی کچھ اُسکی نخوت۔ یا بڑھا کچھ میرا شوق ورنہ کیوں مجھ کو خیالِ شرحِ غم ہونے لگا
کیا چھپاؤں دردِ دل خط میں کہ بے قصدِ رقم عاشقانہ میرا اندازِ رقم ہونے لگا
حیف۔ اُسکے قصرِ عالی تک نہ پہنچا دودِ آہ جا کے چرخِ نیلگوں میں وہ تو ضم ہونے لگا

تصحیح: ۔ دسمبر کے پرچہ میں مولانا حسرت موہانی کی غزل کے حسب ذیل تین شعر غلط چھپ گئے ہیں صحیح شعر اسطرح ہیں

مانعِ گریہ جو ہیں آپ۔ تو کیا ہم یوں بھی؟ چارۂ جانِ حزین و دلِ شیدا نہ کریں؟
ہم نے اس بات کا شکوہ نہ کیا تھا نہ کریں مشقِ بیداد میں ناحق وہ محابا نہ کریں
سُن کے قاصد سے مرا حال کہا تو یہ کہا ہیں وہ بدنام کہیں ہم کو بھی رسوا نہ کریں

جوشِ الفت نے کیا ہے مجھ کو کتنا سادہ لوح — اُس کے وعدہ کا یقیں اب بے قسم ہونے لگا

سہو دیکھو شوق کا جو بھول کر لطفِ ستم
جا کے معشوقوں میں جو یاسے کرم ہونے لگا

حضرت دلؔ شاہجہانپوری

گو کسی سے دردِ غم کا ماجرا کہنے کو ہیں — کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کیا کہنے کو ہیں
پیش دلبر قصۂ مہر و وفا کہنے کو ہیں — مختصر یہ ہے کہ دل کا ماجرا کہنے کو ہیں
دیکھیے کب تک خدا پہنچائے اُس در تک ہمیں — جس کو ہم دم مرحلوں کی انتہا کہنے کو ہیں
چارہ گر جو کچھ تجھے تدبیر کرنی ہو وہ کر — پھر تو اپنے درد کو ہم لا دوا کہنے کو ہیں
اے امید و یاس تم بھی غور سے سُننا ذرا — وہ سوال وصل پر کیا جانے کیا کہنے کو ہیں
کہنے والے کہہ چکے اب جس کو سُننا ہو سُنے — ہم بھی اپنے عشق کا کچھ ماجرا کہنے کو ہیں
کفر و ایماں کی حقیقت یوں عیاں ہونے کو ہے — چھپنے والے ہم تجھے اپنا خدا کہنے کو ہیں
فرطِ خاموشی میں آخر بن گئی صورت سوال — اب بہ خاموش دل کا مدعا کہنے کو ہیں
مٹ چکا ہے عشق میں پامال ہونے کے لیے — نقش دل کو ہم کسی کی خاک پا کہنے کو ہیں
واقعاتِ ہستی اہل فنا سنتے چلو — یہ زبانِ حال سے کیا جانے کیا کہنے کو ہیں
دفعتہً پھر بھول جاتے ہیں جو کچھ آتا ہے یاد — ہم کسی کے سامنے کیا جانے کیا کہنے کو ہیں
ترک الفت ہو چکی یہ تذکرہ تو چھوڑ دیں — وہ کہیں جو چند گو اسکے سوا کہنے کو ہیں

آخری الزام لیتے جاؤ اے دلؔ وقتِ نزع
اب کوئی دم میں وہ تم کو بے وفا کہنے کو ہیں

حضرت وفاؔ حیدرآبادی

ہیں مہر و مہ خجل رخِ انور کے روبرو — سارا جہاں ہیچ ہے دلبر کے روبرو
کیسا ہے انقلاب زمانے کا آج کل — نا چیز ہیں شریف تو نگر کے روبرو

ارماں بہت تھے دل میں مگر رعب حسن سے / کچھ کہہ سکے نہ وصل میں دلبر کے روبرو
دنیا میں تم ستا لو مجھے چاہے جس قدر / لوں گا جواب داورِ محشر کے روبرو
اے تیغ ناز اب مری حسرت نکال دے / بیٹھا ہوا ہوں کب سے ستمگر کے روبرو
اُس کو بھی اپنی آئینہ سازی پہ ناز ہو / تصویر تیری ہو جو سکندر کے روبرو
دونوں میں آج کس کی رہے بات دیکھیے / روشن ہیں داغ دل مہ و اختر کے روبرو
بھیجوں نہ بھیجوں رشک سے اس سوچ میں ہوں میں / نامہ دھرا ہوا ہے کبوتر کے روبرو
تقدیر ہی میں وصل نہو گر تو فائدہ / بیکار کوششیں ہیں مقدر کے روبرو
دریا ہمارے دیدۂ پُرنم کے سامنے / چشمہ کی اصل کیا ہے سمندر کے روبرو
ارمانِ قتل آج تو پورا ہوا یا خدا / بیٹھا ہوں سر جھکائے میں خنجر کے روبرو

کوشش وفا نے کی بھی ولیکن بقول داغ
چلتی نہیں کسی کی مقدر کے روبرو

حضرت شوکت (از بنگلور)

نام لیوا عشق کے تھے قیس بھی فرہاد بھی / پر ہوا ہے کوئی مجھ سا عشق کا اُستاد بھی
ہے فدا ہم ساز جمعیت پریشانی مری / دل کے ویرانے میں ہے اک گوشۂ آباد بھی
تو یہاں آیا تھا کر کے عہد اک روزِ الست / اے فدائے عہد! ہے وہ عہد تجھکو یاد بھی
کچھ خبر بھی ہے کوئی دن میں اکھڑ جانے کو ہے / اے درختِ کبر! تیری بیخ بھی بنیاد بھی
ہے اُسی دل کا لقب صبر محبت آشنا / جس سے نغمہ بن کے نکلے آہ بھی فریاد بھی
شیفتہ حق کا کبھی گرویدۂ باطل کبھی / ہے بنی آدم ستم کش بھی ستم ایجاد بھی
موج زن اے بحر جوش غیرتِ حق پھر سے ہو / خندہ زن اسلام پر ہے کفر بھی الحاد بھی

دام باطل سے رہا ہو، حق کا پابندِ اصول
زندگی اپنی ہے شوکت قید بھی آزاد بھی

حضرت آفق امروہوی

تڑپ کر یوں اسیرانِ قفس گلشن میں مرتے ہیں
ہوا سے جس طرح برگ خزاں دیدہ بکھرتے ہیں

گلا خود کاٹ کر مقتل میں اپنا آپ مرتے ہیں
تری تیغِ ادا کے آج ہم صدقے اُترتے ہیں

وہی پاتے ہیں کچھ لذت حیات جاودانی کی
جو اپنی جان تیری راہ میں قربان کرتے ہیں

یہ پروانے نے سوز شمع میں دکھلا دیا جل کر
کہ یوں جانباز الفت عشق میں جی سے گزرتے ہیں

چراغ طور کے مانند شعلہ دل سے اُٹھتا ہے
چمک جاتی ہے اک بجلی سی جب ہم آہ کرتے ہیں

ہمارا امتحاں لے کر بہت پچھتاؤ گے دیکھو
زباں سے ہم جو کہہ دیتے ہیں وہ کر بھی گزرتے ہیں

ملا کر خاک میں بھی مجکو چین اُن کو نہیں آتا
وہ میری قبر بھی ٹھکرا کے اب برباد کرتے ہیں

میں جتنا الفت و مہر و وفا سے پیش آتا ہوں
وہ مجھپر اُتنا ہی جور و جفا و ظلم کرتے ہیں

خبر کیا ہے تمھیں صاحب کسی کے درد پنہاں کی
خدا ہی جانتا ہے مجھپہ جو صدمے گزرتے ہیں

ترے پیچھے ہماری جان بھی جائے تو کیا غم ہے
جو ہیں جانباز الفت وہ کہیں مرنے سے ڈرتے ہیں

بُرے کو جو بھرے وہ شخص ہے تعریف کے قابل
جو اچھے ہیں آفق اُن کو جہاں میں سب ہی بھرتے ہیں

رزولیوشن محکمہ سرکار عالی مجریہ معتمدی عدالت و کوتوالی و امور عامہ صیغہ تعلیمات

مورخہ ۱۸؍اکتوبر سنہ ۱۹۱۷ء م ۱۳؍آذر سنہ ۱۳۲۶ف م یکم محرم الحرام سنہ ۱۳۳۶ھ

مقدمہ

ممالک محروسہ سرکار عالی کے لیے ایک جداگانہ یونیورسٹی کا قیام

کاغذات ذیل ملاحظہ ہوئے۔

(۱) عرضداشت مورخہ ۲۹؍جمادی الثانی سنہ ۱۳۳۳ ہجری مع یادداشت معتمد عدالت و کوتوالی و امور عامہ جس میں ممالک محروسہ سرکار عالی میں اعلیٰ تعلیم کی موجودہ حالت پر نظر کی گئی ہے اور اُسکی ترقی کے لیے یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ حیدرآباد کے لیے ایک جداگانہ یونیورسٹی قائم کیجائے جسکی

خاص نوعیت یہ ہو کہ اعلیٰ ترین درجہ تک تعلیم کا ذریعہ اردو زبان ہو مگر انگریزی ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے برقرار رہے۔

(۲) فرمان خسروی مترشحۂ ۴ رجب ۱۳۳۵ ہجری دربارہ صدور منظوری تجویز مذکورہ

(۳) عرضداشت مع یادداشت معتمد عدالت و کوتوالی و امور عامہ دربارہ قیام سررشتۂ تالیف و ترجمہ معروضہ ۱۴ شوال ۱۳۳۵ ہجری۔

(۴) فرمان خسروی مترشحہ ۲۵ شوال ۱۳۳۵ ہجری دربارہ منظوری تقرر ہشت مترجمین معہ عملہ۔

(۵) مراسلہ محکمہ فینانس نشان (۵۷۳۲) مورخہ ۵ آبان ۱۳۲۶ف۔

حضرت اقدس اعلیٰ نے بذریعہ فرمان مترشحہ ۴ رجب المرجب ۱۳۳۵ ہجری م ۲۶ اپریل ۱۹۱۷ء ازراہ دانش خسروانہ حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کا حکم نافذ فرمایا ہے اس اسکیم کی کامل صراحت اس وقت تک نہیں شائع ہو سکتی جب تک کہ اس کے تفصیلات و جزئیات طے نہ کر لیے جائیں مگر طریق عمل کے عام اصول معین ہو گئے ہیں اور اب اطلاع عام کے لیے شائع کیے جاتے ہیں فرمان مبارک یہ ہے

حکم

"مجھے بھی عرضداشت اور یادداشت کے مضمون سے اتفاق ہے کہ ممالک محروسہ کے لیے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں جدید و قدیم مشرقی و مغربی علوم و فنون کا امتزاج اس طور سے کیا جائے کہ موجودہ نظام تعلیم کے نقائص دور ہو کر جسمی دماغی و روحانی تعلیم کے قدیم و جدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا فائدہ حاصل ہو سکے۔ اور جہاں میں علم پھیلانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ایک طرف طلبہ کے اخلاق کی درستی کی نگرانی ہو۔ اور دوسری طرف تمام علمی شعبوں میں اعلیٰ درجہ کی تحقیق کا کام بھی جاری رہے"

اس یونیورسٹی کا اصل اصول یہ ہونا چاہیے کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان اردو قرار دیا جائے مگر انگریزی زبان کی تعلیم کی حیثیت ایک زبان کے ہر طالب علم پر لازمی گردانی جائے۔ لہذا میں بہت خوشی کے ساتھ اجازت دیتا ہوں کہ میری تخت نشینی کی یادگار میں حسب مذکورہ اصول محولہ عرضداشت تمام ممالک محروسہ کے لیے حیدرآباد میں یونیورسٹی قائم کرنے کی کارروائی شروع کی جائے۔ اس یونیورسٹی کا نام عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد ہوگا"

یہ احکام مبارک فرجام اس یقین پر مبنی ہیں جس میں بہت سے اعلیٰ تعلیمی ماہرین بھی شامل ہیں کہ طالب علم ان چیزوں کو جو دوسری زبان کے وسیلہ سے سکھائی جاتی ہے اس آسانی سے

ذہن نشین نہیں کرسکتا جس آسانی سے وہ ان خیالات کو ذہن نشین کرسکتا ہے جو خود اسکی مادری زبان میں سکھائی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ علم جس قدر زیادہ ذہن نشین ہوتا ہے اسیقدر زیادہ دل میں وہ تحقیق و تفتیش کا ولولہ پیدا کرتا ہے اس ریاست میں جو زبانیں رائج ہیں ان میں سے اردو زبان عثمانیہ یونیورسٹی میں تعلیم کا ذریعہ قرار دی گئی ہے نہ صرف اس وجہ سے کہ یہ اس ریاست کی سرکاری زبان ہے بلکہ نیز اس وجہ سے کہ یہی وہ زبان ہے جو کم و بیش تمام ممالک محروسہ میں سمجھی جاتی ہے خاص کر شہری آبادی میں جہاں حضرت اقدس و اعلے کے رعایا کے وہ لوگ زیادہ آباد ہیں جو بالعموم ثانوی تعلیم میں داخل ہوتے ہیں تاہم انگریزی تعلیم تمام طلبہ کے لیے لازمی قرار دی گئی ہے کیونکہ گورنمنٹ کو اس امر کی فکر ہے کہ اس یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہندوستان کے موجودہ یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتوں سے اس زبان کی علمی عملی واقفیت میں کسی طرح کم نہوں جو زندگی کے ہر شعبہ میں ناگزیر ہوگئی ہے حیدرآباد کا دارالعلوم جسمیں اردو کے ذریعہ سے مشرقی علوم کی اعلیٰ درجہ تک تعلیم ہوتی ہے اور متعدد مدارس فوقانیہ و وسطانیہ جو سارے ممالک محروسہ سرکار عالی میں پھیلے ہوئے ہیں اور دارالعلوم کے لیے طلبہ بہم پہنچاتے ہیں ایک ایسی یونیورسٹی کے نشو و نما کے لیے جیسے کہ عثمانیہ یونیورسٹی تجویز ہوئی ہے اچھی بنیاد کا کام دیسکتے ہیں یہ مدارس کلیتاً از سر نو درست و مضبوط کیے جائینگے اور انکے نصاب موجودہ میں ایسی ترمیم و اضافہ کیا جائے گا جس سے مقصود مدِ نظر حاصل ہوسکے سرکار عالی کو توقع ہے کہ جدید مضامین کے شمول سے جو ایک دیسی زبان میں سکھائے جائیں گے یہ مدارس تعلیم و تربیت کے لیے زیادہ موزوں ذرائع ثابت ہوں گے حضرت اقدس و اعلے کے اس فیصلہ میں کہ زبان اردو ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے لابدی طور پر یہ ابتدائی تدابیر شامل ہے کہ زبان اردو میں علوم جدیدہ اور دوسرے مضامین پر مناسب حال کتابیں مہیا کرنے کے لیے ایک جداگانہ سررشتہ تالیف و ترجمہ قائم کیا جائے اور قبل اسکے کہ عثمانیہ یونیورسٹی مکمل ہو ایک معتد بہ زمانہ اس میں صرف ہوگا۔

فی الحال سرکار عالی کا ہرگز یہ ارادہ نہیں ہے کہ مدراس یونیورسٹی سے قطع تعلق کرلیا جائے اور یونیورسٹی مذکور سے جسقدر تعلق ہے بحالت موجودہ اس میں تبدیلی پیدا کی جائے چنانچہ ان طلبا کے فائدہ کی خاطر جو اپنی تعلیمی زبان انگریزی رکھنا پسند کرتے اور مدراس یونیورسٹی سے بی۔ اے کی سند حاصل کرنا چاہتے ہیں نظام کالج اور اسکے معاون انگریزی مدارس فوقانیہ (انگلش ہائی اسکول) برابر جاری رہیں گے اور انھیں نہایت قابل اطمینان اور بہتر سے بہتر حالت میں قائم رکھا جائے گا۔

عثمانیہ یونیورسٹی کا جس میں ایک دیسی زبان یعنی اردو ذریعہ تعلیم قرار دی گئی ہے عالم وجود میں آنا بہت سے نامور ہندوستانی اور یورپین ماہر تعلیم کے مشورے پر مبنی ہے اور یہ حقیقت میں

ایک ایسا کام ہے جسے عام طور پر لوگ تجربہ کیے جانے کے لائق سمجھتے ہیں اور جس کے نتائج دیکھنے کا ہر شخص جو ملکی ترقی کا خواہاں ہے یقیناً دل سے مشتاق ہوگا اور اگر یہ نئی یونیورسٹی ہندوستان کی موجودہ یونیورسٹیوں کی نسبت زیادہ سہولت و خوبی کے ساتھ علوم جدیدہ کو طلبہ کے ذہن نشین کرنے میں کامیاب ہوگئی اور اسی کے ساتھ اُسکے تعلیم یافتہ زبان انگریزی پر بھی وہی قدرت و دستگاہ حاصل کر سکے جو دوسرے یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ لوگوں کو ہوتی ہے تو بے شبہ یہی اصول تعلیم ہندوستان کے دوسری بڑی بڑی زبانوں کے واسطے بھی اختیار کیا جا سکے گا۔

نظر برین سرکار عالی کو پورا اعتماد ہے کہ تمام ممالک محروسۂ بندگان اقدس و اعلے خلد اللہ ملکہٗ کی عقیدت کیش رعایا رعثمانیہ یونیورسٹی کا دلی جوش کے ساتھ خیر مقدم کرے گی اور اس نوخیز تحریک کی بارآوری اور کامیابی کے واسطے جو سرکار عالی کے نزدیک ہندوستان کی تعلیمی دنیا میں ایک نہایت پر امید تجربہ ہے ہر طرح سے اسکی تائید و حمایت پر آمادہ ہو جائے گی اس تحریک کے متعلق پہلا عملی کام جو اس وقت تک کیا گیا ہے ایک سررشتۂ تالیف و ترجمہ کا قیام ہے جس میں انگریزی کے آٹھ قابل و لائق اعلیٰ تعلیم یافتہ اور زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہیں جو زبان اُردو کی انشا پردازی میں روشناس زمانہ ہو چکے ہیں ان میں سے ہر ایک کی ماہوار تدریجی اضافہ کے ساتھ تین سو روپیہ سے پانچسو روپیہ تک قرار دی گئی ہے اور وہ اُردو زبان کے مشہور فاضل مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے کی نگرانی میں کام کرتے ہیں ان میں سے دو صاحب طبیعات اور سائنس کی کتابیں اُردو زبان میں تالیف و ترجمہ کریں گے اور علوم ریاضی فلسفہ سیاسیات معاشیات۔ تاریخ اور قانون باقی مترجمین کے سپرد ہوں گے سررشتۂ ترجمہ و تالیف کے مصارف دائر یعنے مترجمین اور عملے کی ماہانہ تنخواہیں۔ مصارف طبع کتب اور اخراجات متفرقہ کے واسطے بندگان عالی متعالی مدظلہ العالی نے مناسب رقم ماہانہ کی منظوری صادر فرمائی ہے اور اسکے علاوہ سولہ ہزار روپیہ کی یکمشت رقم دوسری ضروری اور ابتدائی مصارف کے لیے بھی عطا فرمائی ہے جس میں سے دس ہزار روپیہ اس کام میں لایا جائے گا کہ نصاب تعلیم کی اُردو کتابیں (اُن کتابوں کے علاوہ جو ماہوار یاب مترجمین تیار کریں گے) علیحدہ علیحدہ باہر کے لوگوں سے بالمعاوضہ ترجمہ کرائی جائیں یونیورسٹی کے شعبۂ فنون (فیکلٹی آف آرٹس) کا نصاب تجویز کیا جا چکا ہے جو ہندوستان کے نامور ماہرین تعلیم کی خدمت میں تنقید و تبصرہ کی غرض سے گشت کرایا جا رہا ہے اور شعبۂ الہیات (فیکلٹی آف تھیالوجی) کا نصاب تجویز کرنے کے لیے بھی ایک کمیٹی کام کر رہی ہے۔

حسب الحکم

معتمد عدالت و کوتوالی و امور عامہ

محجوب ہو، خلق تمہارے اور تمہارے نفس کے درمیان مین پردہ ہے،
تمہارا نفس تمہارے اور تمہارے پروردگار کے درمیان پردہ ہے،
جب تک تم خلق کو دیکھتے رہوگے، اپنے نفس کو نہ دیکھ سکوگے، اور جب تک
اپنے نفس کو دیکھتے رہوگے، اپنے رب کو نہ دیکھ سکوگے؟

(۳)

احباب کو نصیحت اپنے دوستون سے، ہمیشہ ارشاد ہوتا تھا کہ

پہلوں کی پیروی کرو (دین مین نئی بات) بدعت پیدا نہ کرو، اطاعت کرو،
مخالفت سے ڈرو، صبر کرو گھبراو نہین، ثابت قدم رہو، پراگندہ اور رفتہ مذہب نہ
ہو، منتظر رہو ناامید نہ ہو، متفق ہو کر ذکر کرو متفرق نہ ہو یعنی انہماک و اجتماع
خیالات سب طرف سے یکسو ہو کر، گناہوں سے بچو، ان میں آلودہ نہ ہو، اپنے آقا کے
دروازہ سے غیر حاضر نہ ہو،

جب کوئی بلا تمہیں گھیرے تو سب سے پہلے اسکے دفعیہ مین خود حرکت کرو،
(انتظام) اگر نجات نہ ہو تو حاکمون سے مدد لو، اگر نجات نہ ہو تو اپنے رب کے
سامنے کمال گریہ وزاری و عاجزی سے اپنے آپ کو ڈالدو، اگر شنوائی نہ ہو تو
یہان تک صبر کرو کہ سارے اسباب و حکایت منقطع ہو جائین۔ تاکہ ایک ایسی
روح ہو کر رہ جاو کہ حق جلی وعلاہی کا فعل اسمین دکھائی دینے لگے، یہانتک کہ
(موحد ہو جاؤ) اس وقت تم کو یقین ہو جائیگا کہ سوائے اللہ کے کوئی فاعل
نہیں جب اس کو وہ مشاہدہ کریگا تو اللہ اُس کے کام اور کل کا کفیل ہو جائیگا،
جب وہ کفیل ہو اب کیا غم ہے عیش و لطف کی زندگی ہے اور وہ زندگی ہے
جس سے بادشاہون کو بھی حصہ نہیں ملا جب تک تم خلق سے مروگے تو کہا جائیگا کہ خدا
تم پر رحم فرمائے اور تم کو تمہاری خواہشوں سے موت دے جب تم کو تمہاری

خواہشوں سے موت حاصل ہوگی تو کہا جائیگا کہ خدا نے تم پر رحم فرمایا تمکو تمہارے ارادہ اور آرزو سے موت دے جب تم کو تمہارے ارادے اور آرزو سے موت حاصل ہوگی تو کہا جائیگا کہ اللہ نے تم پر رحم فرمایا اور تم کو (زندہ کیا) تب تم ایسی پاک زندگی بسر کروگے جس کے بعد پھر موت کا اندیشہ نہیں۔ پھر ایسے مالدار ہوگے جس کے بعد افلاس کا خطرہ نہیں، ایسا عطیہ پاؤ گے جس کے بعد انکار نہیں۔ ایسا علم حاصل ہوگا جس کے بعد پھر جہل نہیں،

(۸)

فنا کے متعلق فنا ایک دولت ہے، پس خلق سے فنا ہوجاؤ، اور اپنی خواہشوں سے جیسا کہ پروردگار کا حکم ہے۔

(۹)

شرک خواص کا شرک یہ ہے کہ سہو ونسیان سے غلبۂ حال وخوف کے طور پر اپنے ارادہ کو حق کے ارادہ کے ساتھ شریک کریں پس رب العزت، بیدار کرنے اور یاد دلانے کے ذریعہ سے ان کی مدد کرتا ہے، تب وہ توبہ کرتے ہیں اور مغفرت چاہتے ہیں، اس لئے کہ ارادہ سے ملایک اور انبیا علیہم السلام کے سوا کوئی بچا ہوا نہیں۔ جو مخلوق مکلف ہے وہ بچی ہوئی نہیں صرف اس قدر ہے کہ اولیا اللہ کی، نفسانی خواہشوں سے حفاظت کی جاتی ہے اور ابدال کی ارادہ سے کہ ان کے لئے ارادہ بھی شرک ہوجاتا ہے۔

(۱۰)

دوستوں کو نصیحت اپنے نفس سے باہر نکلو، اس سے دور ہوجاؤ، اپنی املاک سے علیحدہ سے دست بردار ہوجاؤ، سب کو اپنے آقا کے سپرد کرو، اپنے قلب کے دروازہ پر اسکی جانب سے دربان بنکر بیٹھ، جس کو وہ اندر بلانے میں

کو آنے دو جس کی وہ اجازت نہ دے اس کو دروازہ سے دور کردو ورنہ تم ہلاک ہوجاؤگے۔

(۱۱)

ایضاً

بچتے رہو، مائل نہ ہو، ڈرتے رہو بے غم نہ ہو، تفتیش کرتے رہو غافل نہ ہو، ورنہ تم کو اطمینان جس کو موت کی خاموشی کہا جاسکتا ہے گھیر لے گا، کسی حال یا مقال کو اپنی جانب منسوب نہ کرو۔ اس کی اطلاع سب کو نہ دو، کیونکہ اللہ تعالے ہر روز ایک نہ ایک کام میں ہے،

یعنی تغیر و تبدل میں آدمی اور اس کے قلب کے درمیان حائل ہے، جب تم جس کی خبر دوگے اس سے تم کو ہٹا دیگا، اور جس حال کے ٹھہر جانے کا خیال دل میں لاؤگے اس سے تم کو الگ کردیگا۔

پس اب جس کو تم اس کی خبر دوگے، اس کے نزدیک تم شرمندہ ہوگے، بلکہ اس کی نگہداشت کرو، اور اس کو دوسرے تک پہنچنے نہ دو اگر ثبات وبقا ہو تو اس کی عنایت سمجھو، اور شکر و مغفرت چاہو، اگر ثبات و بیداری بقا کے سوا اور کچھ ہو تو اس میں علم معرفت تادیب کی بیداری ہوگی رب العزت کا ارشاد ہے۔ ما ننسخ من آیۃ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا' ہم کسی آیۃ منسوخ کردیں یا ذہن سے اتار دیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی نازل بھی کردیتے ہیں،

جب رب العزت ایک حالت پر تم کو قایم کردے تو اس کے سوا اور کسی حالت کو خواہ وہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ نہ چاہو۔

اس مقام پر امام شعرانی رضی اللہ عنہ نے ایک توضیحی تقریر طبقات الکبریٰ لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں، ادنیٰ کی طلب کا ممنوع ہونا تو ظاہر ہے کیونکہ ادنیٰ لینے اس چیز کا بدلنا چاہیگا، جو اس سے بہتر ہوگی اور اعلےٰ

کی صورت میں یہ ہے کہ اس کی طالب میں نفسانی خواہش، نازش، راہ پائی گئی، پس شیخ کی ممانعت اس کے لئے ہے جو ہنوز نفس کی خواہشوں کے اندیشہ سے آزاد نہیں ہوا۔ جو آزاد ہے اس کے لئے ترقی مراتب کا سوال خالص بندگی ہے۔

شیخ کے ارشاد میں یہ اغلاق واقعہ تھا کہ ترقی مراتب کا سوال نہ چاہئے اس کو امام شعرانی نے صاف کر دیا۔ اور درمیان میں شرط تبلادی کہ جو شخص نفسانی خواہشوں سے ہنوز آزاد نہین ہوا اس کو شیخ کے کلام پر توجہ کرنی چاہئے۔ جو آزاد ہے وہ مستحق سوال ہے۔

(۱۲)

بادشاہوں کے یہاں جانا آنا

اگر تم بادشاہوں کے گھروں میں جاؤ۔ تو اس طرح جاؤ کہ جبر سے لے جائے جاؤ۔ صرف مطلب پر جانا مہلک ہے اس وقت تک تامل کرو کہ داخل ہونے پر مجبور کئے جاؤ۔

نگاہ کی حفاظت

(۱۳)

رب العزت کا نبی کریم کو حکم ہے، کہ "ولا تمدن عینیک الی ما متعنا بہ ازواجا منہم زہرۃ الحیوۃ الدنیا لنفتنہم فیہ ورزق ربک خیر وابقی"

(اے پیغمبر) ہم نے جو مختلف قسم کے لوگوں کو دنیاوی زندگی کی رونق کے ساز و سامان استعمال کے لئے دے رکھے ہین۔ کہ ان کو ان کے حال میں آزمائیں (اس طرف) تم اپنی نظر نہ دوڑانا۔ تمہارے پروردگار کی دی ہوئی روزی کہیں بہتر ہے اور پائدار تر ہے۔

نعمتوں کے حصول اور آفات کے دفع میں، خود کو کچھ نہ سمجھو، نعمتیں تو ہم کو ضرور پہنچیں گی۔ خواہ تم کو گوارا ہو یا نہ ہو، اور آفات تم پر موجود ہین،

تم چاہے خوش ہو یا رنجیدہ، دفعہ کر دیا نہ کرو،

پس تسلیم اختیار کرو، جو چاہے وہ کرے، اگر نعمتوں کی بارش ہو شکر کرو اس کی یاد میں مصروف و مشغول ہو، اگر کوئی مصیبت و آفات آئیں تو پھر صبر و موافقت رضا اختیار کرو، اور اس سے مزے لینے اور اس سے معدوم و فنا ہو جانے میں ان حالات کی بنا پر جو تم کو عطا ہوں، ان میں مشغول ہو۔ اور ان میں منتقل ہوتے رہو، یہاں تک کہ رفیق اعلیٰ تک پہنچ جاؤ، یہاں تک کہ صدیقین و شہدا میں شامل ہو جاؤ،

مصیبت سے گھبرانا نہ چاہئے، ہر مصیبت جہنم کی آگ سے کم ہے،

مولا فداہ امی ابی نے بتایا ہے کہ جہنم کی آگ مومن سے کہے گی، کہ اے مومن گذر جا، تیرے نور نے میرے شعلہ کو سرد کر دیا ہے۔ یہ وہی نور ہے جو ہر بندہ کے ساتھ دنیا میں ہے، اور اسی سے وہ نافرمانی کرنے والے سے ممتاز ہوگا، پس مناسب ہے کہ اسی نور سے مصیبت پر قابو پائے۔

کیونکہ مصائب ہلاک کرنے کے واسطے نہیں آیا کرتی ہیں۔ بلکہ آزمائش مقصود ہے۔ جو تکلیف پہنچے اس کا اظہار کسی پر مت کرو، دکھ یا سکھ جو ہو اس پر رازداری سے خاموش شاکر و صابر رہو، کسی پر تہمت مت رکھو کہ فلاں نے مصیبت ڈالی فاعل حقیقی وہی ہے"

(۱۳)

نعمت کی حفاظت جبکہ تم عافیت میں ہو، اور تمہارے پاس کسی قسم کی نعمت ہو تو زیادہ طلبی کے لئے اس کو حقیر جان کر اللہ تعالے کی شکایت مت کرو ممکن ہے کہ وہ تم پر ناراض ہو، جو ہے اس کو بھی تم سے واپس لے لیا جائے۔ جو تم نے کہا وہ سچ ہی ہو جائے۔ اور مصیبت اضافہ کر دی جائے۔ انسان پر اکثر

بلائیں ناشکری سے آتی ہین،

بادشاہون کی ہم نشینی

بادشاہون کی صحبت کے لایق وہی ہے۔ جو نفس شون، ناپاکیون، مخالفتون سے پاک ہو پھر جو دوجہان کے بادشاہ کی ہم نشینی چاہتا ہے، اسکو کیسا ہونا چاہئے، رب العزت جو دوجہان کا بادشاہ ہے اسکے دروازہ کا قصد اسی کو زیبا ہے، جو دونون خواہشون سے جدا ہوگیا ہو، حالانکہ بھائی تم رات دن گناہ گن کر نہیں کرتے۔

یہ اس کا ہم پر احسان ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتون سے وہ ہم کو بڑی بڑی آلائشون سے پاک کر دیتا ہے ایک دن کی تپ ایک سال کے گناہ کا کفارہ ہے،

بیماری تم پر اس لئے بھیجی جاتی ہے، مصیبت اس لئے آتی ہے کہ تم اس کی ہم نشینی کے قابل ہو جاؤ۔ سب سے پہلے بلائین انبیا پر آتی ہین۔ پھر درجہ بدرجہ دائمی بلا کے ساتھ ولایت کبری والے مخصوص ہین یہ خاص انہی کا حصہ ہے کیونکہ یہ ہر دم کے حاضر باش ہوتے ہین یہ ہر وقت پاک کئے جاتے ہین۔

جب بندہ پر مصیبت آتی ہے۔ تو دل اس کا قوی ہو جاتا ہے۔ اور خواہش کمزور اور یہ دولت ہے،

(۱۶)

کمی و بیشی

اگر تمہارے پاس کمی ہو یا زیادتی اس کو شکر ہر حال مین بجا لاؤ۔ اس کے ازلی حکم مین اعتراض نہ کرو، ورنہ وہ تم کو جدا کر دیگا اس سے غافل نہ ہو، ورنہ تم کو خراب کر دیگا، اس کے دین مین اپنی نفسانی خواہش کو دخل نہ دو ورنہ تمکو تباہ کر دیگا۔

(۱۷)

کسی پر ظلم نہ کرو، کسی کو برا سمجھنا اور اس سے بدگمان رہنا یہ بھی ظلم ہے،

ممکن ہے تم نے غلط سمجھا ہو، اور تمہارا پروردگار ظالم سے درگذر نہیں کرتا،
جب کسی شخص سے تم کو عداوت ہو تو دیکھو کہ اس کا عمل کتاب و سنت پر ہے
یا نہیں اگر نہیں ہے تو بلاشک اس کو برا سمجھو اگر موافق ہے تو اچھا سمجھو تاکہ جو
کچھ بھی عند اللہ ہو، اور تمہاری ذاتی غرض اس میں کچھ نہ ہو،

کسی کو اس وقت تک برا نہ سمجھو جب تک اس کو گناہ کبیرہ اور صغیرہ کرتے نہ
دیکھو، اپنی آنکھ سے، یا یقین و علم صادق سے۔

(۱۸)

نفس کی خواہش رب العزت فرماتا ہے، "ولا تتبع الہوی فیضلک عن سبیل اللہ" جہانتک
ہو اس بلا سے بہت محفوظ رہنے کی فکر رکھو،

اپنی نفسانی خواہش پر نہ چلنا ورنہ تم کو خدا کے رستہ سے ہٹا دیگی۔

(۱۹)

عنایت ایزدی جب رب العزت کسی کو دوست رکھتا ہے، تو اس کے مال اور اولاد میں
افزائش بند کر دیتا ہے، تاکہ وہ تعلق خواہش کو اللہ سے ہٹا دوسرے کی محبت
میں آلودہ نہ ہو،

رب العزت غیور ہے، شرکت کو پسند نہیں فرماتا،

امام شعرانیؒ نے اس مقام کی توضیح میں فرمایا ہے اگر ولی ایسے مقام تک
پہنچ جائے کہ کوئی چیز اس کو منزلت سے جدا نہ کر سکے تو اولاد و اموال کا مضائقہ نہیں

(۲۰)

روحانیوں میں شمولیت جبکہ [illegible] ذات سے کوئی وجود نہیں رکھتے [illegible] کل جوارح و صفات
جدا [illegible] اختیار [illegible] کی بینائی [illegible] عقل
ان [illegible] ہو [illegible] میں [illegible] گئی ہیں،

تم رہبانیت نہیں پا سکتے" جیسا حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے بتوں
کی نسبت کہا تھا اور رب العزت نے اس کو دہرایا (فانہم عدو لی الا رب العالمین)
یہ تو میرے دشمن ہیں' ہاں میرا سچا دوست پروردگار عالم ہے

تم اپنے آپ کو مجموعۃً اور اپنے اجزا کو ساری مخلوقات کے ساتھ بت سمجھو
اور حدود کی پابندی کرو' امر و نواہی کی نگہداشت کے ساتھ اپنے رب کے
ساتھ شامل رہو'

اگر امر و نواہی کی حدود میں کچھ کمی ہو تو سمجھو کہ مبتلائے فتنہ ہو' شیطان تم
سے کھیل کر رہا ہے بس شرع کی جانب رجوع ہو'

(۲۱)

خداوندی مہربانی

جب رب العزت کسی ایمان دار پر مہربان ہوتا ہے' تو اس کے قلب کے
سامنے رحمت احسان بخشش کا دروازہ کھول دیتا ہے' تاکہ وہ اپنے قلب
سے وہ نعمتیں دیکھے جس کو آنکھ نہیں دیکھ سکتی' کان نہیں سن سکتے' ہر ایک
عقل اس کے تصور سے فرماندہ ہے یعنی غیب کی چیزوں کا مطالعہ اور مشاہدہ
لطافت آمیز کلام اور خوش آیند وعدہ دلایل اور دعائیں مقبولیت اور
تصدیق مواعید' وقار اور حکمت کی باتوں کا خود بخود اس کے دل پر گذر شروع
ہو جاتا ہے اور اس کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہ حالت دائمی ہے اور زائل نہیں
ہوتا ہے۔

تب اللہ تعالی اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اس پر افواج و اقسام کی مصیبتیں
آتی ہیں کہ جان' مال' اولاد کی جانب سے تکلیف پہنچتی ہے' تمام نعمتیں اس سے واپس
لے لی جاتی ہیں' بندہ حیران رہ جاتا ہے کہ کیا ہوا اگر اپنے ظاہر کی جانب دیکھتا ہے
تو حسرت کا منظر پیش نظر ہوتا ہے' باطن کو دیکھتا ہے تو غم کے دروازے کھلے پاتا ہے'

ظل السلطان

اگر آپ بہترین خیالات و مضامین کا آئینہ دیکھنا چاہیں تو ظل السلطان ملاحظہ فرمائیے جو ماہانہ بھوپال سے شائع ہوتا ہے صرف تین ۳ روپیہ سالانہ قیمت ہے۔ اس میں زنانہ دلچسپیوں اور اصلاح تمدن و معاشرت اور تعلیم نسواں کے متعلق اعلےٰ مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اور چار سال کے عرصہ میں جس قدر زنانہ تعلیم کا مواد اس رسالہ نے فراہم کیا ہے اردو میں اسکی نظیر نہیں۔ نمونہ کا پرچہ چار آنہ میں مل سکتا ہے مضمون نگاروں کو معاوضہ اور انعام بھی دیا جاتا ہے اس کے ذخیرہ میں اعلےٰ مرتبت خواتین کی نہایت قابل قدر تصانیف موجود ہیں۔ خصوصاً علیا حضرت فرمانروائے بھوپال اور بیگم صاحبہ جنجیرہ کی تصانیف بھی ملتی ہیں۔ ذیل میں کچھ کتابیں لکھی جاتی ہیں اگر آپ کا کتب خانہ ان گراں بہا تصانیف سے خالی ہے تو آج ہی ان کی طلبی کا خط لکھ دیجیے مفصل فہرست ۱ر کے ٹکٹ پر بھیجی جاتی ہے۔

حضور سرکار عالیہ فرمانروائے بھوپال کی تصانیف

بچوں کی پرورش:۔ بچوں کے متعلق اصول حفظان صحت کی واقفیت اور خطرات کی اطلاع ۲ر

تربیت الاطفال:۔ بچوں میں شائستگی تہذیب اخلاق اور دیگر صفات حسنہ پیدا کرنیکے لیے نہایت مفید ہے۔ ۸ر

ہدایت تیمار داری:۔ بچوں کی تیمارداری کے صحیح طریقوں پر واقف کرنے کے لیے یہ کتاب مفید ہے ۲ر

ہدایت الزوجین:۔ خانہ داری کا پہلا حصہ جسمیں شوہر اور زوجہ کے شرعی اور قانونی حقوق اختیارات بتائے گئے ہیں ۸ر

حفظ صحت:۔ خانہ داری کا دوسرا حصہ یعنی روزمرہ کے وہ تمام اصول جو عورتوں کی صحت جسمانی قائم رکھنے کے لیے ضروری ہیں ۱۲ر

معیشت:۔ خانہ داری کے تیسرے حصہ کا جزو اول جسمیں انتظام خانہ داری وغیرہ نہایت تفصیل سے لکھا گیا ہے ۱۲ر

معاشرت:۔ خانہ داری کے تیسرے حصہ کا جزو ثانی جسمیں بچوں کی تعلیم۔ آداب ملاقات کے متعلق مفید ہدایات و قواعد ڈاک خانہ و قواعد ریلوے وغیرہ نہایت شرح و بسط سے لکھے گئے ہیں ۱۲ر

سبیل الجنان:۔ ایمان، اسلام، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ پر حضور عالیہ کی نہایت عالمانہ تقریریں ۱۲ر

دیگر عالی مرتبت خواتین کی تصانیف

سیاحت سلطانی:۔ ہر ہائینس فرمانروائے بھوپال کے حالات سفر ۱۲ر

سیر یورپ:۔ ہر ہائینس بیگم صاحبہ جنجیرہ کے سفر یورپ کا روزنامچہ قسم اعلےٰ و قسم معمولی ۱ر و ۱۲ر

تہذیب النسوان:۔ تمام تدابیر کے ساتھ مذہبی احکام نہایت تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں... ۱۲ر

آغاز اسلام:۔ مولانا شبلی مرحوم کی کتاب بدء الاسلام کا ترجمہ جسمیں اختصار کیساتھ آنحضرت صلعم کے حالات دیے ہیں ۱۲ر

خوان دعوت:۔ مختلف کھانوں کی ترکیبیں ایک دلچسپ قصہ کے پیرایہ میں ۱۲ر

سرگذشت:۔ بیگم صاحبہ نیضی نے اس کتاب میں بعض ہندوستانی گھروں کی غیر منتظم حالتوں کا نقشہ کھینچکر دکھایا گیا ہے۔

کتابوں کے ملنے کا پتہ

آنریری منیجر ظل السلطان بھوپال

پکے اور مانداں ہو ہے سے جس قیمت خواہ دہزار گو ہ زیادہ ہے۔

سرکار سے رجسٹری شدہ — داد کی بے خطا دوا

دورو گج کیسری

بلا جلن اور تکلیف کے داد کو جڑ سے دور کرنے والی اگر کوئی دوا ہے تو یہی ہے۔ **قیمت فی شیشی چار آنہ**
جس شیشی پر سکھ سنچارک کمپنی کا نام نہ لکھا ہو اُسے ہرگز نہ خریدیے۔ **سب سے قابل اطمینان خط۔**
مہاشے آپ کی دوا۔ دورو گج کیسری کا استعمال کیا گیا۔ داد اچھے ہو گئے دوا سود مند ہے۔
آپ کا راجہ سر رام پال سنگھ کے سی۔ آئی۔ ای۔ راج کرسی سدولی ضلع رائے بریلی۔

بال سپھا اگر آپ کو اپنے بچے موٹے تازے اور تندرست بنانے ہیں اور روز کی بیماریوں سے اُنکا پیچھا چھڑانا ہے تو اس عجیب دوا کو منگا کر پلائیے ایک شیشی تقریباً ایک ماہ کو کافی ہے قیمت فی شیشی بارہ آنہ ڈاک خرچ چھ آنہ۔
آپ کو اپنی ضرورت کی کوئی چیز بھی درکار ہو تو بیشتر ہم سے دریافت کیجیے اور ہماری فہرست طلب فرما کر ملاحظہ فرمائیے۔

ملنے کا پتہ:- سکھ سنچارک کمپنی متھرا

لوگوں کی رائے

اس بات کے لیے پختہ ہو گئی ہے کہ سکھ سنچارک کمپنی متھرا کا تیار کردہ سدھا سندھو ہی سب سے سچی اور فوری شفا بخشنے والی بے خطا دوا ہے باقی اسکی سب نقلیں ہیں یہی وجہ ہے کہ اس نایاب دوا کے فروخت کرنے کو چوتھائی لاکھ سے زیادہ ایجنٹ مہیا ہو چکے ہیں ۲۷ سال کی طویل آزمائش کے بعد یہ کامل طور پر یقین ہو چکا ہے کہ
اس کمپنی کا سدھا سندھو بلا کسی چیز کی آمیزش کے کف۔ کھانسی۔ دمہ۔ ہیضہ۔ سر کے پیلے۔ دست خونی دست آنوں پیچش۔ قولنج۔ زکام۔ سردی۔ نزلہ وغیرہ امراض کو دفع کرنے میں اکسیر کا حکم رکھتی ہے یہ ایک خوش ذائقہ اور خوشبودار دوا ہے **قیمت فی شیشی** آٹھ آنہ ڈاک خرچ ایک سے چھ شیشی تک تین آنہ۔

بیشمار ہزار اسنادوں سے چند یہ ہیں:-

شری ونکٹیشور اخبار بمبئی ۱۲ فروری سنہ ۱۹۱۶ء سکھ سنچارک کمپنی متھرا کا سدھا سندھو ہیضہ وغیرہ سے پیدا شدہ بیماریوں کی ایک بے خطا دوا ہے ۔۔۔۔ ابھیودے اخبار الہ آباد ۲۰ مئی سنہ ۱۹۰۹ء سدھا سندھو حقیقت میں امرت کا سمندر سدھا سندھو ہی ہے کل خانہ داروں کو یہ دوا اپنے پاس رکھنی چاہیے کیونکہ یہ بہت قسم کے امراض میں مفید ہوتی ہے ہم نے ابتک ۱۰۔۲۰ شیشی منگا کر فائدہ دیکھا ہے ۔۔۔۔ شری پنڈت مہابیر پرشاد جی دویدی اڈیٹر سرسوتی الہ آباد۔ ہماری ضعیف والدہ جن کی عمر ۸۰ سال کی تھی کف اور کھانسی سے بیمار تھیں انکو جیسے سدھا سندھو کے دس قطرے دیے۔ دیتے ہی اُس نے جادو کا اثر کیا ۔۔۔۔ ہماری دوا سب بڑے دوا بیچنے والے اور ویدوں کے پاس بھی ملتی ہے مگر دھوکہ سے دوسری مصنوعی دوا نہ خرید لیجیے گا چار دام کی تصویر اور نقشہ ہماری فہرست سب کو بلا قیمت ملے گی۔

منگانے کا پتہ:- سکھ سنچارک کمپنی متھرا

حکیم عبدالقوی صاحب لکھنوی

کی مجرب دوائیں جو صرف دواخانہ مخزن الادویہ ہی میں مل سکتی ہیں۔ ان کے استعمال سے سیکڑوں مریضوں کو فائدہ

معجون نشاط: سستی اور کاہلی کو دور کر کے چستی و چالاکی پیدا کرتی ہے اور فرحت دیتی ہے۔ فی تولہ ۲ خوراک ۱ ماشہ پاؤ بھر یا کو نیم گرم گائے کے دودھ کے ساتھ بہت جلد فائدہ محسوس ہوگا۔

سفوف سوزاک کہنہ: پرانے سوزاک کے لیے بشرطیکہ مجاری بول میں بدگوشت نہ پیدا ہو گیا ہو نہایت فائدہ ثابت ہوا ہے۔ قیمت فی تولہ ۱ خوراک ۲ ماشہ پاؤ بھر گائے کے دودھ میں پاؤ بھر پانی ملا کر اوپر سے پی لیا جائے۔

سفوف درد معدہ و قولنج: ریاحی اور بلغمی درد معدہ و قولنج کو جو دورہ سے ہوا کرتا ہو یا اتفاقاً طور پر یکایک ہو جائے فوراً زائل کرنے میں اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ فی تولہ ۴ خوراک ۲ ماشہ دورہ کے وقت تھوڑے سے پانی یا سونف کے عرق کے ساتھ۔ فہرست دواخانہ طلب کیجیے مفت بھیجی جائے گی۔

سبز مرہم: تمام جلدی بیماریوں جیسے پھوڑا، گلٹی، کھجلی، داد، کنٹھ مالا، آتشک کے زخم وغیرہ کے لیے ہمیشہ وہ سبز مرہم ناگہانی چوٹ اور جلنے وغیرہ کی تکلیف کو بہت جلد رفع کرتا ہے فی ڈبیہ آٹھ آنہ (۸/)

مخزن الادویہ - جھوائی ٹولہ - لکھنؤ

بزم خیال

اس کتاب میں شعرائے عجم و ہند کے وہ دلفریب قصہ طلب اشعار ہیں جن سے کسی قصہ یا عجیب لطیفے کا تعلق ہے۔ پہلے وہ قصہ نہایت سلیس اردو زبان میں لکھا گیا ہے پھر وہ شعر جس کا اس قصہ سے تعلق ہے۔ فارسی میں سعدی حافظ عرفی حاجی حزیں فردوسی زیب النسا۔ ملا طاہر غنی کشمیری وغیرہ وغیرہ اردو میں میر۔ سودا۔ مصحفی۔ سید انشا۔ جرأت۔ ذوق۔ غالب۔ مومن۔ آتش۔ ناسخ۔ انیس۔ دبیر خواجہ وزیر۔ رند۔ نسیم۔ قلق۔ قدر۔ امیر۔ داغ۔ جلال۔ جلیل ریاض۔ جاوید۔ عزیز۔ محوی وغیرہ کے قصہ طلب اشعار ہیں یہ اس کتاب کا چوتھا اڈیشن چھپ رہا ہے جس میں نصف سے زیادہ اس مرتبہ اضافہ کیا گیا ہے درخواستیں جلد بھیجیے۔ ورنہ دوبارہ اشاعت کا انتظار کرنا پڑے گا۔ حجم ۱۲ جز لکھائی چھپائی کاغذ اعلیٰ درجہ کا قیمت عمر علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ:- صفدر مرزا پوری محمود نگر لکھنؤ

اشتہار کتب قابل دید

دیوان غالب: مع شرح و دیباچہ و مقدمہ از حسرت موہانی - ۶

انتخاب اردوئے معلیٰ:- رسالہ اردوئے معلیٰ کی دس جلدوں کے بہترین مضامین کا انتخاب مجلد قابل دید۔ قیمت ۱

مکتوبات امیر احمد مینائی: یعنی امیر احمد مینائی مرحوم کے دلچسپ خطوط کا مجموعہ ۲۵۲ صفحے مع دیباچہ و مقدمہ و تصویر ۲

نظیر و موازنہ داغ و امیر مجلد عہر

دیوان حسرت موہانی:- (۱) حصہ اول تک کا کلام ۵ (۲) حصہ دوم (۳) حصہ سوم سے اس وقت تک کا کلام جس میں دیوان یعنی زمانہ طالب علمی کا دلچسپ کلام ۳ حصہ سوم نیا چھپا ہے۔ جو لوگ مکمل دیوان خرید چکے ہیں وہ بھی خرید فرمائیں۔

ملنے کا پتہ

بیگم حسرت موہانی دفتر اردوئے معلیٰ علی گڑھ

۵۷

تمدن

جذبات الاقوام

(گذشتہ سے پیوستہ)

ہرانسانی کائنات جو اسوقت مختلف اقوام کے اندر تقسیم شدہ ہے اور جو تقسیم دن بدن ایک مستقل حدود میں آتی جاتی ہے اس کائنات میں ایک مضبوط حق اور مضبوط دعوی رکھتی ہے، اور ہر انسانی کائنات یا ہر ہر قوم کو شخصیت کی طرح ایک کشش اور ایک جذب حاصل ہے اگر ہم جذبات شخصیتوں کا احساس [illegible] تو کوئی وجہ نہیں کہ جذبات الاقوام سے ہم نابلد رہیں وہی قوم بحیثیت ایک قوم کے دائرۂ حیات میں رہ سکتی ہے جو دوسری اقوام کے جذبات سے واقف ہے اور جو ایسی حس رکھتی ہے جو قوم اپنی ہمسایہ اقوام کے احساسات اور تصرفات و جذبات سے واقفیت نہیں رکھتی وہ دوسرے الفاظ میں اپنی ہستی اور اپنی ہستی کے احساسات [illegible] ضروریات سے بھی واقفیت نہیں رکھتی وہ ان [illegible] بات سے ناواقف ہے جو اور دوسری اقوام کو اپنے اندر جذب کرسکتے ہیں طبعاً

ہر ہستی کی یہ آرزو رہتی ہے کہ اُسے کوئی دوسرا جذب نہ کرسکے دوسرے اُسمیں وقتاً فوقتاً جذب ہوتے رہیں۔ حسین ہمیشہ چاہتا ہے کہ اُس کی شمع حسن کے سب پروانہ ہوں حسن کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی ہے کہ اُسکی مدح و تعریف سے کوئی زبان خالی نہ رہے ہر کوچہ میں اُسکا اثر ہو اور ہر منزل میں اُسکی آؤ بھگت کی جائے بدصورتی بھی گو بجائے خود ایک طاقت اور ایک کشش رکھتی ہے مگر وہ محض ایک ہوس ہوتی ہے اور بہت کم لوگ طبعاً اس طرف مجذوب ہوتے ہیں یہی حالت اُس شخصیت اُس کُنبہ اور اُس قوم کی ہوتی ہے جو دوسری شخصیتوں کنبوں اور قوموں کے مقابلہ میں کوئی حسن اقبال حُسن تدبر حسن تمدن اور حسن طریق عمل رکھتی ہے وہ ہمیشہ اس خواہش میں رہتی ہے کہ دوسری قومیتیں اُس میں رفتہ رفتہ مجذوب ہوتی جائیں یہاں تک کہ سر سے پاؤں تک اُس میں رنگی جائیں اور اُسکا روپ اختیار کریں اور اُسی کا کلمہ پڑہیں۔

بوے تو زبوے گل شناسد
آن را کہ دماغ بوشناس است

اگر کہا جائے کہ کسی قوم کی ایسی خواہش اور ایسا ارادہ اور ایسا طریق عمل عدل و انصاف یا ضابطہ قدرت کے خلاف ہے تو یہ ایک ایسی غلطی ہے جو صرف اس وجہ سے عاید ہوتی ہے کہ ہم ضابطہ قدرت اور اسکے عدل و انصاف سے واقفیت نہیں رکھتے۔ ہر کھلے میدان میں جو قدرت کی جانب سے کُل کائنات کے حصے بخرے میں رکھا گیا ہے اور جو شرائط سے آزاد ہے ہر شخص اور ہر قوم دوڑ دھوپ کی کامل آزادی رکھتی ہے اور ہر ایک کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی بساط کے مطابق اُس سے اپنا حصہ لے اور اپنی آسائش کے حاصل کرنے میں زور لگائے۔ کسی قوم کو یہ حق حاصل نہیں کہ قدرتی فیضان کے حاصل کرنے سے کسی دوسری

قوم کو روکے اور مزاحمت کرے ہر شخص اور ہر قوم قدرت کی جانب سے وافر وسائل سعی اپنے قبضہ میں رکھتی ہے کوئی وجہ نہیں کہ ان سے کام نہ لیا جائے اور قسمت آزمائی نہ کی جائے ۔ بمصداق ۔

لیس للانسان الا ما سعیٰ

جب قدرت مفت بخشتی ہے تو ہمیں بھی اپنی مساعی کے ماتحت مفت ہی لینے کی کوشش کرنی چاہیے ۔ گو ہماری کوششیں بھی بجائے خود بہت کچھ قیمت رکھتی ہیں لیکن بعض مواد اس کائنات میں ہیں ایک بڑی حد تک مفت ہی ملتے ہیں کوئی قوم قوت جاذبہ سے خالی نہیں بعض اقوام کا جاذبہ رفتہ رفتہ بعض ناقص بواعث کے ماتحت کمزور پڑ گیا ہے اور بعض کا ترقی پا چکا ہے ہر جاذبہ کی یہ طبعی خواہش ہے کہ

(الف) وہ دوسرے جاذبہ پر غالب آئے ۔

(ب) دوسرے اس میں جذب ہو جائیں ۔

(ج) اگر وہ اوروں کو جذب نہیں کر سکتا تو خود کسی میں جذب نہ ہو

(د) یا کم سے کم یہ کہ اسکا جاذبہ بجائے خود ثابت اور قائم رہے ۔

(ھ) اس کا جاذبہ گویا اسکی ہستی ہے ۔

ہر جاذبہ دوسرے جاذبہ کے مقابلہ میں بایں مدعا لگا رہتا ہے کہ اس کے ہند سے اس کی قوت اور اسکے دوسرے بڑھیں وہ بہ نسبت اوروں کے ممتاز اور ایک جداگانہ ہستی ثابت ہو اور قائم بھی رہے اور اگر کوئی دوسری ہستی اسکے متمتعات تمدنی و اقتصادی پر قابض ہونا چاہے تو اس کے پاس انکی حفاظت کا سامان اسقدر ہو کہ اسے کسی قسم کی مایوسی کا سامنا نہ ہو نہیں کہ دوسری قوم یا دوسری قومیں اسکی موجودگی میں اسکی طرح اپنے متمتعات کی

نگراں نہ رہیں بلکہ یہ کہ اسکی ہستی مقابلتاً محفوظ ہے جس طرح ایک ہوشیار کسان اور کسانوں کے مقابلہ میں اپنی کھیتی باڑی کی حفاظت کرتا اور اسکی ترقی میں کوشاں رہتا ہے اور اپنے فوائد کو ہاتھ سے نہیں دیتا اور ہر مناسب موقع کی تلاش میں لگا رہنا ایک فرض سمجھتا ہے اور اسی طرح اسکے مقابلہ میں دوسرے کسان بھی اپنی اپنی جگہ پر کوشاں رہتے ہیں ایسے ہی اقوام کا بھی حال ہے -

قوموں کے ہی نہیں بلکہ شخصیتوں کے جاذبات یہی ہوتے ہیں جن پر اُنکی زندگی کا دارومدار ہوتا ہے جاذبات کے کم ہونے یا نہ رہنے سے قومیں برباد ہوجاتی ہیں اور رفتہ رفتہ اُنکی ہستیاں مٹ جاتی ہیں مٹ جانے اور نہ رہنے سے یہ مطلب ہے کہ

۱ یا تو وہ بالکل ہی مٹ جاتی ہیں -

۲ یا ایسی کمزور ہوجاتی ہیں کہ اُن کا عدم وجود برابر ہوجاتا ہے -

قوموں کے جاذبات وہی جاذبات ہوتے ہیں جو شخصیتوں کے ہیں شخصیتیں جس قدر جذبات جداگانہ رکھتی ہیں وہ قومی رنگ میں بصورت اجتماعی قومی جذبات کی صورت اختیار کرتے ہیں شخصی جذبات انفرادی ہیں اور قومی جذبات اجتماعی قومی یا اجتماعی جذبات کی اقسام حسب ذیل ہوسکتی ہیں -

(الف) مذہبی جاذبہ -

(ب) اخلاقی جاذبہ -

(ج) تمدنی جاذبہ -

(د) اقتصادی جاذبہ -

ان چاروں جذبات کے سوائے ایک پانچواں جاذبہ سیاسی بھی ہے جو ہماری بحث سے خارج ہے - ہر قوم کا یہ فرض اعلےٰ ہے کہ وہ اپنے جاذبات کے قائم رکھنے کی

کوشش میں رہے نہ صرف قائم رکھنے میں ہی بلکہ اس میں بھی کہ اُسکے جاذبات مترقی ہوں اور یہ خوش اسلوبی اُن سے کام لیا جاسکے اور دوسری قومیں رفتہ رفتہ اُن کی متمنی رہیں اور اُنمیں شامل ہو کر اُن کی تعداد اور مجموعہ میں اضافہ کریں اُنکا مذہب۔ اُن کے اخلاق اُن کا تمدن اُن کے اقتصادیات اس عمدگی اور اس خوش اسلوبی سے موثر ہوں کہ دوسری شخصیتوں اور قوموں کے دل ودماغ اُنکی طرف رفتہ رفتہ متوجہ ہوتے جائیں۔

کسی قوم کے جاذبات قومی اُس صورت میں مترقی اور پاکیزہ رہ سکتے ہیں کہ کسی قوم کی قومی حسیات قومی ادراکات قومی تصرفات اور مترقی جذبات کی رفتار میں سبکی۔تیزی تمکنت۔استقلال پیدا ہوتا جائے اور خود قوم کو یہ اعتماد ہو کہ اُسکی قومی قوتیں اس درجہ پر پہنچ چکی ہیں کہ جلب منافع اور سلب مضار کے اعتبار سے صحیح قوتیں خیال کی جاسکتی ہیں موثر بھی ہوسکتی ہیں اور متاثر بھی۔

جب تک قومی قوتوں قومی جذبات پر اعتماد نہ ہو تب تک کوئی قوم دنیا میں برقرار اور قائم نہیں رہ سکتی قوموں کو باصول خودداری ایسی اعتمادی قوتیں پیدا کرنی چاہئیں جو خود تو کسی میں جذب نہوں لیکن دوسروں کو خود میں جذب کرنے کی طاقت موثرہ رکھتی ہوں۔ یہ بات اُسوقت تک نہیں ہوسکتی کہ جب تک قوموں میں خودداری کا مواد پیدا نہ ہو۔ پیدا ہی نہ ہو بلکہ مستقل طور پر رہے بھی اور اُس سے کام بھی لیا جائے جو قوم دوسروں کو خود میں جذب کرنے کی طاقت نہیں رکھتی وہ ایک ایسا جمود رکھتی ہے جو بمنزلہ سکرات یا بیہوشی کے ہے

دنیا میں ہر چیز خصوص زندہ اشیاء کی زندگی حرکت ہے جو جمود کے خلاف ہے حرکت کا اثر یہ ہے کہ وہ رفتہ رفتہ بڑھتی جاتی اور استقامت پذیر ہوتی جاتی ہے اور اُسکا دائرہ بڑھ کر خارجی اشیاء کا محیط ہوتا ہے جس سے اُسکی طاقت موثرہ

اور متاثرہ دونوں رنگوں میں مترقی ہوتی ہے دیکھو جو مذہب اپنے اندر یہ طاقت نہیں رکھتا کہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی اس میں منتقل ہو سکیں اُسکا جاذبہ یا ہاضمہ قوی شمار نہیں ہوتا اور وہ رفتہ رفتہ یا تو کمزور پڑجاتا ہے یا اُسکا دائرہ کم ہوتے ہوتے بالکل ایک نقطہ رہ جاتا ہے یہی مثال قوموں کی بھی ہے وہی قوم ترقی پذیر ہوگی جس کا جاذبہ اور ہاضمہ قوی ہو جاذبہ اور ہاضمہ اُس صورت میں قوی ہو سکتا اور بڑھ سکتا ہے کہ جب اُسکے وسائل صحیحہ حاصل اور موجود ہوں ایسے وسائل حسب ذیل ہو سکتے ہیں یا ہونے چاہئیں۔

(۱) حسن و قوت مذہب۔

(۲) حُسن تمدن۔

(۳) حسن اخلاق۔

(۴) حسن اقتصادیات۔

(۵) حسن اتفاق و خلوص۔

یہی خمسہ ضروریہ ہے جو قوموں کو عروج اور اقبال کی راہیں دکھاتا ہے اسی کی برکات قوموں کو اپنے مرکز پر قائم رکھتی ہیں وہ قوم جو بدقسمتی سے گر چکی ہے غور کرے اور دیکھے کہ کیا اُس میں یہ خمسہ ضروریہ پایا جاتا ہے اور کیا اُس کی اُسے ضرورت ہے اور کیا اس کمی کی وجہ سے اُسکی حالت اور اُسکا رشتہ کمزور پڑتا جاتا ہے اگر غور کرنے کے بعد واقعی یہ کمی پائی جاتی ہے تو اُسکا فرض ہے کہ وہ غور کر دیکھے کہ کسقدر فاصلہ پر اُسکا ابتدائی مرکز رہ گیا ہے۔ ہر قوم کا مرکز اور کرہ جداگانہ ہوتا ہے یہ کہنا کہ کل قومیں ایک ہی مرکز اور ایک ہی کرہ پر ترقی کر سکتی ہیں غلط ہے ہر قوم اور ہر گروہ کا مرکز ترقی کرہ عروج جداگانہ ہوتا ہے اُسی پر آن کر وہ ترقی اور عروج حاصل کر سکتی ہے۔

اگر کسی قوم نے مذہبی راہوں سے ترقی کی منزل پائی ہے تو وہی راہیں اُسکے واسطے موجب عزت و احترام ہوسکتی ہیں دوسری راہوں کا لینا اُس کے واسطے اگرچہ بادی النظر میں یا چندروزہ خوشنما اور خوش آیند معلوم دیتا ہے لیکن دراصل وہ سماں ایک فریب و تخیل ہے جو قوم دوسری اقوام کے اصولی جذبات یا مرکزی جذبات کی مقلد ہے اور اپنے اصولی یا مرکزی جذبات سے رفتہ رفتہ دور ہٹتی جاتی ہے وہ اپنے ادبار اور تنزل کے قریب تر ہوتی جاتی ہے۔

کائنات انسانی ایک دوڑ رکھتی ہے۔ وہی قوم اس دوڑ میں قائم رہ سکتی ہے جو اپنا مرکز نہ چھوڑے اور دوسرے کے جذبات میں خود منجذب نہو جائے کوشش یہ ہونی چاہیے کہ دوسری طاقتیں اسکے حُسن جذبات حُسن تصرفات کو دیکھکر اُسمیں جذب ہوجائیں جو چشمہ پانی لیتا نہیں بلکہ ہمیشہ پانی دیتا ہی رہتا ہے وہ اخیر پر خشک ہوجاتا ہے اور لوگوں کے واسطے اُسکا وجود مفید نہیں رہتا اگر ایک قوم دوسری قوم کے جذبات میں منجذب ہونا بُرا اور نقصان رساں خیال نہیں کرتی تو کیا ایسی حالات یہ کہا جاوے گا کہ وہ اپنے قومی جذبات قومی مرکز کی عزت کرتی ہے یا اُس سے اُسکو کوئی محبت اور تعلق ہے۔

جو شخص اپنا گھر چھوڑ کر ہمیشہ دوسروں کے گھروں میں رہتا اور انہیں رسوم کا پابند اور خوگیر ہوتا ہے اُسکا گھر کبھی آباد نہیں رہ سکتا وہ ایک ویرانہ شمار ہوگا اُسے گھر کون کہہ سکتا ہے۔ قومی تحفظ کا بڑا اصول یہی ہے کہ قومیں پیچھے ہٹ کر اپنا پُرانہ مرکز بھی دیکھیں کہ وہ کیا شان و شوکت رکھتا تھا اگر تم ترقی کرنا چاہتے ہو تو ذرا پیچھے ہٹو بے شک آگے چلنا ایک ترقی ہے لیکن اپنے مرکز سے ہٹ جانا اور اُسکی خبر نہ لینا ایک تنزل بھی ہے اگر ایک شے زمین پر سے اوپر پھینکی جائے اور وہ زمین کا مرکز چھوڑ چکے تو اس کا حشر

کیا ہوگا یا تو وہ معلق ہو گی اور یا جو ما خلا میں ہمیشہ کے واسطے پڑا ں رہے گی کیا یہ ترقی ہو گی اصل ترقی مرکز کا قائم رہنا ہی ہے جو ترقی کوئی مرکز ہی نہیں رکھتی وہ ترقی نہیں بلکہ ایک تنزل اور ایک ایسی سبیل جو کبھی منزل مقصود پر پہنچا نہیں سکتی۔

ہر قوم جذبہ اور کشش رکھتی ہے جذبہ اور کشش کا یہ کام نہیں ہونا چاہیے کہ دوسروں کو دوڑتا دیکھکر چابک یا قمچی مار کر روکے اور یہ چاہے کہ اُسکو روک کر خود بڑھے بلکہ یہ کہ خود تیزی سے بڑھے اور آگے نکلے اور اپنے حسن جذبات سے دوسروں کو گرویدہ بنائے اور یہ کوشش کرے کہ دوسری شخصیتیں اور دوسری قومیں اُسمیں منجذب ہوں یہ اُس وقت تک نہیں ہو سکتا کہ جب تک کوئی قوم اپنے جذبات سے آگاہ نہ ہو اور یہ نہ جانے کہ اُن کی حشمت اور پیمانہ کسقدر ہے اور اُن میں کس قدر طاقت پیدا کی جا سکتی ہے۔ اور اُن سے کہاں تک کام لیا جا سکتا ہے۔

جو قوم یہ جانتی ہی نہیں کہ اُسکے جذبات کیسے ہیں اور اُن کی کیفیت کیا ہے اور کس طرح شخصی جذبات قومی جذبات کا رنگ اختیار کرتے ہیں اور کس طرح اُنھیں مجموعی حالت میں مفید بنایا جا سکتا ہے اور کس طرح دوسری قومیں اور دوسری شخصیتیں اُن میں شامل ہو سکتی ہیں وہ اس کش مکش کی دنیا میں بمشکل قائم اور ثابت رہ سکتی ہے لوگ عموماً انفرادی رنگ دیکھنے کے عادی ہیں اجتماعی رنگ میں دیکھنے کے عادی نہیں ہیں حالانکہ قومی رنگ میں بھی دیکھنا لازمی ہے۔

در عشق نہ تسبیح نہ زنار ضرور ست
تا رے بکفت از طرۂ دلدار ضرور ست

سلطان احمد

کحل الجواہر

حضرت ثاقب قزلباش لکھنوی

جانِ خوش ہے باغِ ہستی میں دلِ مسرور ہے
کیا مزا ہے زندگی جب آنکھ ہی بے نور ہے

صورتِ رحمت کہاں دنیا ہے آنکھوں میں سیاہ
جل رہا ہے دل کہ ٹھنڈا کیوں چراغِ طور ہے

دید کے قابل تماشا گاہِ عالم ہے مگر
وائے محرومی اگر آنکھوں سے تو معذور ہے

وہ طلسمی لوح سب کہتے ہیں جسکو مردمک
سات پردوں میں یہ رازِ منجلی مستور ہے

ایک نقطہ ہے جو ہے صورت کشِ ارض و سما
ایک تل ہے جسمیں عالم کی فضا محصور ہے

صنعتیں ہیں کلکِ قدرت کا مرقع دیکھیے
انطباعِ شکل کا حیرت نما دستور ہے

سب چھپی تصویر کب آنکھوں سے غائب ہو گئی
نقشِ اول کیا ہوا جب دوسرا منظور ہے

منطبع ہوتی ہیں لاکھوں رنگ کی شکلیں مگر
کوئی دھبا لوح پر رہ جائے کیا مقدور ہے

دیدۂ بینا بڑی نعمت ہے دیکھو غور سے
لطفِ ہستی ہے جو آنکھوں میں ضیا موفور ہے

کور ہونا ہے گوارا یا بصارت ہے عزیز
اے مریضِ چشم بتلا کیا تجھے منظور ہے

کیوں ہے یہ آشوب کیوں جاتا ہے پانی آنکھ سے
آگیا ہے کچھ ورم پردوں میں یا ناسور ہے

خیر اُٹھتی کی نہیں آنکھوں میں دانے ہیں اگر
پتلیاں دھندلی ہوئیں تو روشنی کافور ہے

ابتدائے ہر مرض میں چاہیے فکرِ علاج
حد سے گذرا درد تو لقمان بھی مجبور ہے

دو قدم زحمت اُٹھا آنکھوں کی صحت کے لیے
تو ہے ناواقف نہ دارالطب کچھ ایسا دور ہے

اس مطب میں خاص آنکھوں ہی کا ہوتا ہے علاج
یہ مکاں آلاتِ نو ایجاد سے معمور ہے

ہیں اطبا حاذقِ فن جامعِ فضل و کمال
علم کا مخزن ہے یہ دارالشفا مشہور ہے

اس توجہ کا جو ہے ثاقب کے حالِ زار پر
زیرِ بارِ منت و احساں دلِ رنجور ہے

میڈیکل کالج - یہ نظم جناب لنٹر صاحب پروفیسر میڈیکل کالج لکھنؤ کی فرمایش سے لکھی گئی ہے

نئے دولہا کے خیالات

میرے ایک دوست کی حال ہی میں شادی ہوئی ہے۔ میاں تعلیم یافتہ ہیں۔ امیر ہیں۔ خوبصورت ہیں توانا و تندرست ہیں۔ نیک خیال و نیک اعمال ہیں۔ بیوی ہر طرح سے میاں کے حسب دلخواہ ہیں۔ کبھی کبھی غریب خانہ پر بھی تشریف لے آتے ہیں کل اُن سے اس جدید تعلق کے متعلق گفتگو ہوئی۔ جو کچھ یاد رہا ناظرین تمدن کی نذر کرتا ہوں

میں۔ سید صاحب (یہ صاحب سید ہیں)۔ آپ کی تاہل کی نسبت کیا رائے ہے۔

سید صاحب۔ آپ رائے دریافت کرتے ہیں یا میرا تجربہ پوچھتے ہیں۔

میں۔ جی ہاں یہی سمجھیے۔ آپ کو اس نئی زندگی کا اب تجربہ ہوا ہے۔ آپ نے اسکے متعلق کیا رائے قائم فرمائی۔

سید صاحب۔ رائے کے لفظ کو تو آپ چھوڑ ہی دیں۔ یوں فرمائیے کہ شادی کرنے کے بعد تمھاری زندگی میں کیا انقلاب ہوا۔

میں۔ بہت اچھا یوں ہی سہی۔

سید صاحب۔ یا اس سوال کو اس طرح پیش کیا جائے کہ بیوی کیسی ملیں اور گھر کی کیا حالت ہے۔

میں۔ بہت اچھا۔ یوں ہی سہی۔

سید صاحب۔ یعنی میں اس بات کا جواب دوں کہ بیوی کیسی ملیں یا اس سوال کا کہ گھر کی کیا حالت ہے؟

میں۔ میں تو بیوی اور گھر دونوں بلا زندگی سب کے ایک ہی معنی سمجھتا ہوں۔

سید صاحب۔ مگر میں یہ نہیں سمجھتا۔ بیوی بیوی ہے۔ گھر گھر ہے۔ زندگی زندگی ہے۔

میں - فرداً فرداً تو درست اور بجا لیکن جب یہ تینوں چیزیں آپ سے ایک وقت میں مدت العمر کے واسطے متعلق ہوجائیں تو اُسکا نام آپ کیا رکھیں گے -

سید صاحب - گھونسلا -

میں - بہت خوب - وہ کیوں ؟

سید صاحب - وہ یوں کہ اول تو مشابہت تامہ انسان اور چڑیا کی بود و باش میں ہے - دوسرے یہ کہ میں فطرتی تعلقات کے متعلق فطرت کی اصطلاحات سے گفتگو کیا کرتا ہوں -

میں - بہت اچھا گھونسلا ہی صحیح سہی - مگر سوال یہ ہے کہ یہ گھونسلا کیسے درخت پر ہے کس شاخ پر ہے - کیسے تنکوں کا ہے - یا چھت کی کڑی میں بنا ہے یا کمرہ کی کانس پر - یا کسی جھاڑی میں ہے - دن کی دھوپ اور رات کی سردی کا کیا علاج کیا گیا ہے وغیرہ وغیرہ -

سید صاحب - جناب یہ گھونسلا بنا ہے گلاب کے درخت میں - پھولوں کے سایہ میں - سبز پتوں کی اوٹ میں - خوشبودار تنکوں کا - باغ کی روش کے پاس بہار کے موسم میں - ٹھنڈی ہوا میں - دائیں طرف چنبیلی کھلی ہوئی ہے بائیں طرف مولسری کا درخت ہے جس میں بہت سے گانے والے پرند رہتے ہیں جو صبح سے شام تک وقت وقت کی راگنی راگ الاپتے رہتے ہیں جنکے سریلے نغموں نے باغ کو ایسا دلکش بنادیا ہے کہ کسی وقت باہر نکلنے کو جی نہیں چاہتا -

میں - پھر آپ نے گھونسلے کے بدلے بارہ دری کیوں نہ پسند فرمائی - اُسی کی باغ میں اُٹھا کر رکھ لیتے - چاروں طرف پھولدار درخت بھی لگ جاتے - سامنے اُسکی روشوں کے کناروں سے اٹکھیلیاں کرتا ہوا پانی بھی جاری ہوجاتا - ایک سنگ مرمر کا حوض بھی اُس میں لگ جاتا اُسمیں ایک فوارہ لگوا لیتے ٹھنڈک کو

ظاہر کر رہی ہے مگر میں ذرا اسکی اور بھی تشریح سننی چاہتا ہوں۔

سید صاحب۔ جی ہاں۔ لیجیے۔ میں عرض کرتا ہوں۔ پہلے صورت ظاہری کو لیجیے پر تو اس کے بیشک نہیں ہیں لیکن کپڑوں کی تراش خراش میں کچھ اضافہ کر کے اُنکا قائم مقام خاصہ پیدا کر لیا ہے۔ کسی ملک میں کچھ ہے کسی میں کچھ ہے مگر ہے سب جگہ کچھ نہ کچھ یوروپ میں جاکٹ ہے پیٹی کوٹ ہے فروک ہے۔ گون ہے اور خدا جانے کیا کیا اپنے ملک میں دوپٹے ہیں چادریں ہیں برقع ہے۔ اکہرا ہے تہبو سنی ہے وغیرہ وغیرہ اسی طرح یکرنگی سے بھی اسکو بالطبع نفور ہے۔ جیسے پرندوں میں سوائے کالے کوّے اور سفید کبوتر کے کوئی یکرنگ پرندہ نظر نہیں آئے گا اسی طرح عورتوں میں بھی سوا رانڈ بیوہ بڑھیوں کے کسی کو آپ یک رنگ لباس میں نہ دیکھیں گے۔

آواز کو لیجیے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ بولنے سے کام۔ پرندہ اپنی منقار کو چگنے کے وقت کے علاوہ ہر وقت نغمہ سرائی میں مصروف رکھتا ہے۔ اسی طرح یہ خدا کی بندی بھی فقط اس یقین پر کہ اُسکی آواز میں سُننے والے کو موسیقی کا لطف آتا ہے۔ بولے جاتی ہے۔ سدھائی ہوئی شامایا سبز گیہوں کے کھیت کا جھنڈ دل کیا بولے گا جو یہ بے پر کی چڑیا بولتی ہے۔ اسی طرح نقل و حرکت کا مقابلہ کیجیے۔ آپ نے خوبصورت چڑیوں کو اپنے گھونسلے کے آس پاس بلا وجہ و بلا مطلب اُڑتے پھرتے دیکھا ہوگا؟

میں۔ آپ کا ہی دیکھنا کافی ہے۔

سید صاحب۔ میرا ہی کیوں؟ آپ نے بھی ضرور دیکھا ہوگا کہ کبھی گھونسلے سے باہر نکل بیٹھیں۔ کچھ چوں چوں سے پر کھجائے۔ ادھر اُدھر دیکھا اس شاخ سے اُس شاخ پہ پہنچ گئیں۔ کبھی اُس پھول پر جا پہنچیں، [illegible] پھول کی ٹہنی اسکے ہلکے پھلکے بوجھ سے جھولنے بھی نہ پائی تھی کہ یہ وہاں سے اُڑ کر پھر اپنے گھونسلے کے

پاس آ بیٹھیں - پھر کچھ بولیں - پھر زمین پر اتر آئیں - ذرا ادھر اُدھر پھدک کر چلیں پھر اُڑ گئیں - اور کسی بڑے درخت کے سایہ دار پتوں میں غائب ہو گئیں - اور جب وہاں نَر کی نظروں سے اوجھل ہونے کا احساس ہوا تو بولنے لگیں - غرض یہ کہ دن بھر نقل و حرکت سے کام -

یہی حالت عورت کی ہے - اتنا معلوم ہو جائے کہ میرا چلنا پھرنا اُٹھنا بیٹھنا بولنا چالنا - گنگنانا کسی کو اچھا معلوم ہوتا ہے - پھر دیکھیے - اس کمرے سے اُس کمرے میں - اس کمرے سے صحن میں - صحن سے پلنگ پر - پلنگ سے اُتر کر آئینہ کے سامنے جا کھڑی ہوئیں - پھر سنگھار میز پاس آ بیٹھیں کچھ کنگھی چوٹی کی - کچھ اپنے لمبے بالوں کی تعریف کی کہ کمبخت خواہ مخواہ اُلجھ جاتے ہیں - پھر کچھ پان کا شغل کیا جب کوئی کام بھی نظر نہیں ہوا تو بولنا شروع کر دیا "بولے آج آپ دفتر نہیں گئے" یا "پان بناؤں" یا "ڈاک آ گئی؟" وغیرہ وغیرہ - جواب میں اگر ایک سکنڈ کی دیر لگ گئی تو خفا ہو گئیں - پھر کیا تھا - سمندِ ناز کو ایک اور تازیانہ ہوا - "اللہ اللہ بات کا جواب اب بھی مشکل ہے" - اگر قدر دان نے آنکھوں ہی آنکھوں میں عفو تقصیر چاہا تو کہا "یا کہ ہم نہیں بولتے" پھر کوئی آ کر خود بولتا ہے اور بلواتا ہے - ہیں - ظاہری حالت کے واسطے تو اتنا ہی لکچر کافی ہے - اب کچھ طبیعت کے متعلق بھی کہہ ڈالیے - مگر اس سے زیادہ خاکہ نہ اُڑائیے گا مبادا دنیا کا نصف حصہ آپ سے ناراض ہو جائے - جسکو بالطبع نرمی اور تعریف پسندی ہے -

سید صاحب - نازک مزاجی کی وجوہات مجھکو معلوم نہیں کہ کیا ہو سکتی ہیں - میں تو عورت کی تصویر کو قدرت کے نگار خانہ میں ہزاروں جگہ دے رہا ہوں -

میں - مجھے خوف ہے کہ وہ شاید اس جگہ کو پسند نہ کرے - مگر میں آپکی رازداری کروں گا اور آپ کا نام ان شاعروں کے پڑھنے والوں پر ظاہر نہیں کروں گا -

سید صاحب - توکیا آپ ان باتوں کو پبلک میں شائع کریں گے۔
میں - آپ جانتے ہیں کہ جو چیز دلچسپ ہے اُسکی مالک پبلک ہوتی ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ آپ کے خیالات دلچسپی سے خالی نہیں ہیں اس لیے پبلک کی تواضع کیوں نہ کی جائے۔
سید صاحب - اچھا منظور ہے مگر میرا نام ظاہر نہو۔
میں - اس کا میں وعدہ کرتا ہوں۔
سید صاحب - اس شرط پر مجھے بھی انکار نہیں۔ طبیعت بھی اُسکی پرندگی طبیعت سے مشابہ ہے۔ مرد میں تصنع - تکلف - تہذیب - بوجہ بیرونی زندگی کے تجربہ کے زیادہ ہوتی ہے اور بالخصوص تعلیم یافتہ اشخاص میں۔ تہذیب سے مراد میری وہی تہذیب ہے جسکو میں تہذیب کہتا ہوں۔ جس کا اصل اصول دفع الوقتی اور رفع شر ہے۔ نہ وہ جسکو آپ حسن فطرت فرماتے ہیں پرند کا ہر فعل عین فطرت ہے۔ اسی طرح عورت کے افعال و جذبات تاوقتیکہ اُسکو حالات و صحبت متاثر نہ کریں بالکل فطرت کے مطابق ہوتے ہیں اُسکی طبیعت ابتدا ہی سے آغوش فطرت میں پرورش پاتی ہے۔ اُس کی جسمانی ہستی محض ایک غلاف اُسکی فطرتی اور روحانی روشنی کا ہوتا ہے جس طرح سے کہ لیمپ کی تیز روشنی کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے اُن (غیر شفاف) چمنی لگائی جاتی ہے اسی طرح اُس کی روحانی روشنی کو اُسکی جسمانی فطرت کے غلاف سے چھپایا گیا ہے۔ گویا عورت کے اندر ایک اور عورت ہوتی ہے اور وہی اصل عورت ہے۔ وہی اُسکی فطرت ہے جس میں روح کی تجلیات دمکتی ہوی نظر آتی ہیں۔ مرد میں اور اُسمیں یہ فرق ہے کہ مرد کی روحانیت اس جدید تہذیب کی دنیا میں بہت جلد ہی زائل ہو جاتی ہے اور عورت کی

روحانیت اگر مخالف حالات کا اثر اُس پر نہ پڑے تو تمام عمر رہ سکتی ہے - وہ جیسی پیدا ہوئی تھی ویسی ہی قبر تک جا سکتی ہے جیسی طرح پرند کہ جب سے اُس نے اپنے پروں سے کام لینا شروع کیا اُسوقت تک کہ جب وہ موت کا شکار ہو یکساں رہتا ہے ہیں - آپ کا یہ آئیڈیل اتنا بلند ہے کہ اسکے لیے میں پرند کی تشبیہ کو ناکافی سمجھتا ہوں -

سید صاحب - تو پھر کیا آپ اُسکو پھول سے تشبیہ دیں گے - یا نسیم سحری سے یا بوئے گل سے یا بجلی کی چمک سے یا ابر سے یا بارش سے یا سورج کی کرن سے یا موتی سے؟ میری رائے میں اس سے بہتر کوئی تشبیہ نہیں ہے - ان میں سے کسی میں اتنا حُسن نہیں ہے جتنا ایک خوبصورت گانے والے پرند میں ہوتا ہے میں - کچھ پر - چونچ - پنجہ سے آپ کو خاص رغبت بھی معلوم ہوتی ہے -

سید صاحب - نہیں میں پرند کو ایک نہایت مرغوب دل چیز سمجھتا ہوں - چمن کی بہار پرند کے نغمہ سے ہے - گل کا سنگھار بلبل کے ولولہ محبت سے ہے - نیچر کا موسیقی پرند کے گلوے خوش نوا میں رکھا گیا ہے خود انسان اپنے دلکش موسیقی میں اسی کا شاگرد ہے - اسکے علاوہ حُسن قدرت کا بہت سا حصہ پھول اور پرند میں تقسیم ہو گیا ہے اور بہت تھوڑا سا برفستان وسمندر و ابر و بارش و دریا و بجلی و آفتاب و مہتاب و ستارے و فضائے آسمانی و صبح و شام وغیرہ کو دیا گیا ہے اُن میں رعب قدرت زیادہ ہے حُسن قدرت کم ہے - کسی میں قدرت کی وسعت - کسی میں طاقت - کسی میں انتظام - کسی میں فیض کسی میں ضابطہ نظر آتے ہیں - بیشک یہ آیات اللہ ہیں - اور وحدۃ الوجود کی جھلک ان میں زیادہ نظر آتی ہے مگر اللہ جمیل و یحب الجمال کی تشریح پھولوں اور پرندوں کے مشاہدہ سے سمجھ میں آتی ہے ان میں سے پھولوں کو میں درجۂ ادنیٰ دیتا ہوں - اسکی ہستی قدرت کے عجائب خانہ میں فقط اُس چیز کی سی

جو سجائی اور دکھائی جاتی ہے اور اتنا ہی اُسکا فرض ہے۔ مگر پرند کی خوبصورت ہستی اپنی نقل و حرکت سے کارخانۂ قدرت میں حصہ لینے والی معلوم ہوتی ہے جو تمام زندگی ادائے فرض فطرتی میں صرف کرتی ہے۔

پھول حُسن ساکن ہے۔ پرند حسن متحرک ہے۔ عورت میں اور پرند میں صرف یہ فرق ہے کہ ہے وہ بھی حُسن متحرک۔ مگر بوجہ ہم جنسی کے مرد کے سکون قلب و راحت جسمانی کے لیے پرند سے زیادہ مفید و ضروری ہے۔ اور ایک اعلےٰ درجہ کا اخلاقی و روحانی نمونہ ہونے کی وجہ سے ازبس ضروری ہے۔ قدرت نے تبسم کیا تو پھول پیدا ہوا۔ جب اپنی تعریف میں کچھ گانے لگی تو پرند پیدا ہوا۔ جب اس تبسم و نغمہ سرائی سے دل میں تفریح کا اثر اور روحانیت کا نشہ پیدا ہوا تو عورت پیدا ہوئی۔ یہ قدرت کی آخر اور مختتم پیدائش ہے۔ اب آپ مجھے معافی دیں گے اگر میں گھر کو گھونسلے سے اور بیوی کو ایک خوشنما گانے والے پرند سے تشبیہ دوں۔

میَں۔ تو یوں کہیے کہ "چوں چوں کرتی آئیں بی چڑیا"۔

سید صاحب۔ پان کھا کر رخصت ہوئے اور یہ فرماتے گئے کہ "مرزا صاحب اب آپ بڈھے ہوگئے ہیں"۔

محمد اشرف

ترک محبت

حضرت باسط بسوانی

سکون قلب تو حاصل ہوا ترک محبت سے　اُٹھایا ہاتھ ہمنے اُس بت بدخو کی الفت سے
سراپا بیوفا نکلے بتان عالم فانی　اُنھیں ہے کام بیداد و غرور و کبر و نخوت سے
لگا کر آگ الفت کی خبر لیتے نہیں ہرگز　کوئی جل جل کے مر جائے کہ یونہی جائے سوز فرقت سے
بلا سے رات دن کاٹے کوئی اندوہ و حرماں میں　اُنھیں ہے کام ہر دم راحت و آرام و عشرت سے
بلا سے گر تڑپ کر رات کاٹے چاہنے والا　سحر تک کام اُنھیں رہتا ہے اپنے خواب راحت سے

ہوا ہے صبر ہمکو بھی۔ ابھی ہم رو کے بیٹھے ہیں
جو تھا داغ محبت دلمیں اُسکو دھو کے بیٹھے ہیں

غرض ہمکو نہیں باقی رہی کچھ بزم کثرت سے　مزا آتا ہے اک عالم کا اپنے کنج خلوت سے
کسی کے وصل کی خاطر جگر کاوی نہیں باقی　کلیجہ اب نہیں جلتا کسی کے سوز فرقت سے
نہیں ہے نام کو بھی ناتوانی لاغری باقی　نہیں دشوار اب چلنا ہمیں ضعف و نقاہت سے
نہ شوریدہ سری ہے وہ نہ اب وہ سر میں ہے سودا　گریباں اب نہیں ٹکڑے ہوتا ہے اپنا دست وحشت سے
خدا کا شکر خودداری کی میں اب اصلیت سمجھا　مجھے مطلب بتوں کی ہے خوشامد سے نہ منت سے

نہیں ارمان ساقی دل کو اب جام محبت کا
ہوا ہے رنگ کچھ اب اور ہی اپنی طبیعت کا

مرے لب پر نہیں ہے ہرگز ہے اب دلدار کا چرچا　دل وارفتہ کا ہے چرچا دل بیمار کا چرچا
کہاں ہے زلف شبگوں کا جبین نور افشاں کا　کہاں چین جبین کا ابروے خمدار کا چرچا
کہاں تیر مژہ کا اور کہاں ہے چشم فتاں کا　کہاں ہے ناوک تیر نگاہ یار کا چرچا

کہاں ہے اب رخ انور کا اور روئے کتابی کا
کہاں ہے مصحف رخ کا قل رخسار کا چرچا
کہاں ہے ذکر اب لب پر لب شیریں و نازک کا
کہاں ہے اب کسی جادو بھری گفتار کا چرچا
کہاں ہے دست نازک کا - کہاں ہو ساق سیمیں کا
کہاں ہے اب کسی کی فتنہ زا رفتار کا چرچا
کہاں ہے اب کسی کی بیوفائی - کج ادائی کا
کہاں اعدائے دیں کا کہاں اغیار کا چرچا

دل مردہ شگفتہ ہے مرا گل کی طرح دیکھو
زباں پر نغمۂ شادی ہے بلبل کی طرح دیکھو

محبت کی نگاہوں میں ملی اصلا نہ آسایش
عبث بیسود ہے اس عرصۂ ہستی کی پیمائش
میں سمجھا سردمہری زمانہ سے ہے یہ مطلب
بتانِ بیوفا نے کی ہے مجھسے اب یہ فہمایش
نہ ہو تو مبتلا اس ہستی فانی کی الفت میں
کرے گی دل ترا تاریک آخر کو یہ آلایش
عبث نقش و نگار دہر فانی پر ہے تو شیدا
خیال پاک سے یا سطا کر اپنے دل کی زیبایش

چھوڑا یا ہے ... گرفتہ مجازی سے
منور کر دے ... دل کو اپنی دلنوازی سے

ناولہائے قاری

قاری محمد سرفراز حسین صاحب عزمی دہلوی (علیگ) کے اخلاقی ناول سعید سعادت شاہد رعنا جو دو دو چھپ کر قدر دانوں کے ہاتھوں میں پہنچ چکے ہیں اب ایک مجموعہ کی صورت میں چھپوائے گئے ہیں۔ ۲۰۰ صفحہ کی کتاب جو نہایت عمدہ ولایتی کاغذ پر چھاپی گئی ہے اور جس میں مصنف کی ایک تصویر بھی ہے۔

قیمت ... دفتر رسالہ "تمدن" پل چھا دلال لکھنؤ سے مل سکتی ہے

مسٹر ٹالم ٹولا کی ڈائری کے چند اوراق

۲- جون - رات گرمی بہت تھی ۲ بجے تک سخت لو چلتی رہی نیند نہ آئی - صبح دورے جانا تھا - ۴ بجے ریل جاتی ہے کیا بُرا وقت ہے رات کو بیگم صاحب سے خرچ کے روپے لینے بھول گیا - ۲ بجے اُٹھا اور ۳ بجے تک بالکل تیار ہو گیا بیگم صاحب کو کس طرح جگاؤں - ۳ بجکر ۵ منٹ ہو گئے کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آئی - ٹہلتا رہا گاڑی دروازے پر کھڑی ہے - کیا کروں - ماما عظمت سے کہا ذرا بیگم صاحب کو جگا - خود پرے کو سرک گیا کہ خفگی کی آنچ نہ آئے عظمت نے کئی دفعہ بیگم صاحب بیگم صاحب کہا خبرے نباشد - ہر آواز پر میں پرے کو سرکتا جاتا تھا عظمت بہت مُنہ چڑھی ہے - آخر پاؤں پکڑ کر آہستہ سے ہلایا کون کمبخت ہے ... اور ایک لات ... اور غنیمتا - میں تو چپکے سے باہر نکل گیا - یہ جانیں وہ جانیں - ۳ بج کر ۴ منٹ ہو گئے تھے اسٹیشن پر خزانچی ملے گا اُس سے روپیہ لے لوں گا - رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت - بیگم صاحب آج دن بھر بدمزاج رہیں گی - مگر میں باہر رہوں گا سامامت بڑی بیہودہ ہے ریل کا وقت بڑا نامعقول ہے بیگم صاحب کا میں کیا قصور ہے - دو بجے تو سوئی تھیں -

. . . .

۶- اگست - آج دن بھر بارش ہوئی - شام کو کھُلا - کئی دن سے موسم کی خرابی کی وجہ سے گھر سے باہر نکلنا نہ ہوا - ۷ بجے شام سے احباب آنے شروع ہوئے یہ سالے بنّا خاں بھی بہت دن بعد آج کہیں سے آ نکلے - بڑے مزے کے آدمی ہیں - مگر ان سے بیگم صاحب ناراض ہیں کیونکہ ان کی دو بیویاں ہیں اور فوجی آدمی ہیں - حقہ بہت

پیتے ہیں جب آتے ہیں چلموں پر چلمیں بھری جاتی ہیں - ایک دفعہ بیٹھ گئے تو اُٹھنے کا نام نہیں لیتے - آج بھی ۱۰ بج گئے کھانے کا وقت ہوا اور گذر گیا اور صحبت احباب میں مجھے معلوم نہ ہوا - پان دو دفعہ منگائے آگئے - تیسری دفعہ پان منگائے آدھ گھنٹہ ہو گیا مگر نہ آئے - حقے کی چلم گئے بھی دیر ہوئی - رسالدار صاحب نے غل مچانا شروع کیا کہ حقہ نہیں بھرا گیا - خیر چلم تو آگئی مگر پان نہ آئے - ماما عظمت نے کواڑ کے پیچھے سے مولا بخش ملازم سے کہا کھانا تیار ہے - میں نے بھی سُن لیا مگر ٹال گیا پھر باتوں میں لگ گیا پھر مولا بخش نے کھانے کی یاد دہانی کرائی - میں نے حاضرین سے تو اصلتہً پوچھا کہ کھانا منگاؤں مگر سب نے انکار کیا - جوں جوں دیر ہوتی جاتی تھی مجھپر خوف طاری ہوتا جاتا تھا - آخر جس بات سے ڈرتا تھا وہ ہو کر رہی - رسالدار صاحب اپنی بیوی نمبر ۲ کی تابعداری کا ذکر کر رہے تھے کہ بیچاری کھانا لیے بیٹھی راہ دیکھ رہی ہوگی - خواہ رات کے بارہ بجے گھر پہنچیں مگر کیا مجال جو وہ بندی اللہ کی پلک جھپکائے کھانا کھلا کر ہاتھ دُھلا کر حقہ لا کر رکھے گی - رسالدار صاحب لیٹے حقہ پیتے رہیں گے اور وہ پاؤں دباتی رہے گی حتی کہ رسالدار صاحب سو جائیں گے تب بیچاری بیوی اپنے پلنگ پر جا لیٹے گی - رات کو خواہ دو بجے سوئے مگر صبح ہی چار بجے سے اُٹھکر رسالدار صاحب کے لیے چاء تیار کرے گی - یہ چاء گرمی جاڑے برابر پیتے ہیں - یہ نہیں کہ نوکر چاکر نہیں - گھر میں دو دو مائیں ہیں - باہر ایک ذاتی ملازم چاء اردلی اور ساری فوج کے سوا - مگر رسالدار صاحب کی بیوی میاں کا کام ملازمہ سے کرانا اپنی ہتک سمجھتی ہیں - ...... رسالدار صاحب یہ ذکر کر رہے تھے کہ کواڑوں پر دو تین دفعہ زور سے دستک کی آواز آئی - سب نے مڑ کر دیکھا میں سمجھ گیا اور سہم گیا - آخر بیگم صاحب کی خشم آلودہ آواز جگر کے پار ہو گئی "آدھی رات ہونے آئی اور ابھی محفل برخواست نہیں ہوتی - اندر آتے ہو تو آؤ ورنہ میں

کنڈیاں لگواتی ہوں"۔

حاضرین نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور چلنے کی تیاری کی۔ میں نے بھی نہ روکا۔ مگر رسالدار صاحب نے ایک قہقہہ لگایا اور کہنے لگے "چل یار ہمارے ہاں چل کر سو رہ یہاں کنڈی لگ جانے دے اور ایک مہینہ بھر وہیں رہ کنڈی آپ ہی کھل جائے گی اور آئندہ پھر کبھی نہ لگے گی"۔ میں کھسیانی ہنسی ہنسا اور میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر دستک ہوی۔ آخر رسالدار صاحب کے بھی پیر اکھڑ گئے گھر جاکر جو نہ ہونی تھی وہ ہوی۔ اور بول چال بند ہوگئی۔ مگر غور کیا تو قصور اپنا ہی پایا۔

. . . .

۲۵۔ دسمبر۔ آج رات کو رسالدار صاحب کے ہاں دعوت تھی۔ بلاوا صبح ہی آچکا تھا۔ نہ جاتا تو مشکل رسالدار جمّا خان جیسا شخص میری سات پیڑھی پُن ڈالتا۔ جانے میں بیگم صاحب کی خفگی کا ڈر کیونکہ اُنکا حکم تھا کہ رسالدار صاحب کے ہاں نہ جایا کرو۔ آخر بیگم صاحب سے بہانہ کیا کہ سرکاری کام ہے اور ہم دعوت میں پہنچے۔ کھانا کھاتے ہی اُٹھا کہ دیر ہونے سے شبہ نہ ہو جائے اور ٹھیک ۹ بجے گھر پہنچ گیا تھا مگر اندر گھر کے سب دروازے بند تھے۔ بہت کھٹکھٹایا مگر کچھ سُنائی نہ ہوی۔ نوکر نے تجویز بتائی کہ دیوار کودی جائے مگر چوروں کو راستہ بتانا اور اندر پہنچکر چور کی بھول میں جوتے کھانا کس نے بتایا ہے۔ آخر اتنی جلدی دروازے کیوں بند ہو گئے؟ باہر مردانے کے کمرے میں قمرالدین داروغہ سے بستر مانگ کر سو رہا۔

۲۶۔ دسمبر۔ صبح گھر میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولابخش کی گواہی ہو رہی ہے۔ بیگم صاحب کواڑ کے پیچھے کھڑی ہیں۔ ماما عظمت بیچ میں دروازے میں کھڑی ہے اور مولا بخش باہر سے جواب دے رہا ہے۔ بیگم صاحب کے سوال ماما عظمت دوہراتی ہے۔ مولابخش کو اتنا فائدہ ہے کہ سوال وہ بیگم صاحب کی زبان سے سُن لیتا ہے

اور اتنے ما ما عظمت دہرائے اتنے وہ جواب گڑھ لیتا ہے۔ چند سوالات جو میں نے چپکے سے سُنے وہ یہ تھے "تو ایمان سے کہتا ہے کہ تجھکو خبر نہیں"۔ "رسالدار صاحب کا آدمی تو صبح نہیں آیا تھا"۔ "رات گھر میں سوئے تو بستر کہاں سے آیا"۔ "اچھا تو کوچوان کو بلا لا اُس سے پوچھوں کہ گاڑی کہاں کہاں لے گیا تھا" میں ڈرا کہ اب بھید کھُلا۔ میں نے ذرا کھڑبڑ کی کہ مقدمہ بند ہو۔ مگر میری موجودگی میں بھی پیشی ختم نہوتی میں پریشان تھا کہ کیا کروں۔ مگر مولا بخش بڑا ہوشیار آدمی ہے۔ اُسنے جواب لا کر دیا کہ کوچوان باہر گیا ہوا ہے۔ یہ سُنتے ہی میں باہر نکل آیا۔ کسی نے رات کی کیفیت رسالدار صاحب سے بیان کر دی وہ آ گئے۔ بیگم صاحب کی خفگی سے ڈر کر باہر آیا تھا کہ رسالدار صاحب کا سامنا ہوا۔ اُلٹا مجھکو ہی ڈانٹنا شروع کیا۔ جب مجھے تمام بزدلی کے القاب دے چکے اور میں اپنے سرگزشت بیان کر چکا اور بیگم صاحب کے مزاج کا حال سُنا چکا تو آخر میں رسالدار صاحب نے صلاح دی اور بہت سیدھے الفاظ میں کہ "مارتا کیوں نہیں"۔ مجھے ایک بچپنے کا سبق یاد آگیا اور میں نے فوراً جواب دیدیا "تا با با میرے دل کی پیاری"۔ اسی دن سے میرا نام ظالم ڈولا پڑ گیا۔

. . . .

۳۔ فروری۔ ۲۰ اگست۔ ۲۵ دسمبر کے واقعہ ہائلہ سے میرا گھر سے نکلنا بند ہو گیا۔ کوئی ملنے آتا ہے تو مجھے خبر نہیں کی جاتی بلکہ پہلے بیگم صاحب کو اطلاع کی جاتی ہے۔ اگر کوئی نامناسب شخص ملنے آئے تو وہ کہلا بھیجتی ہیں کہ صاحب گھر میں نہیں ہیں۔ اور میں چپ بیٹھا سُنا کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ شاعر نے مردہ بدست زندہ کیوں باندھا زندہ بدست زندہ تو اُس سے بھی بدتر ہے۔ مگر نہیں اسمیں بھی میرا ہی فائدہ ہے جب تک آدمی تارک الاحباب نہو کوئی دنیا کا بڑا کام

نہیں کر سکتا۔ آج رسالدار صاحب پھر آنکلے۔ نوکر نے حسب دستور جواب دیدیا کہ گھر میں نہیں ہیں۔ شاید رسالدار صاحب کو میری قید محض کا حال معلوم ہوگیا ہوگا وہ گھر میں گھسنے لگے کہ بہن سے کہنا وہ پردہ کریں بھائی کو ہم خود ڈھونڈھ لیں گے اُدھر بیگم صاحب کی خفگی۔ اور میری طرف قہر کی نظریں۔ رسالدار صاحب نے زیادہ لحاظ نہیں کیا اور گھر میں گھس آئے میں بیٹھا تماشا دیکھتا رہا۔ بیگم صاحب بھاگیں میں ہنسنے کو تھا کہ فوراً میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ مجھے بھی گھسیٹا۔ چق کی پردے میں گرنے ہی والا تھا کہ رسالدار صاحب آنکھوں پر ہاتھ رکھے سامنے کھڑے کیا کہتے ہیں کہ چور پکڑ لیا ہے۔ بہن آپ اب پردے میں چلی جائیں۔ میں ان گھر گھسنے دوست سے بھگت لونگا حریت و مساوات اچھی چیزیں ہیں۔

....

۵ مارچ۔ تعلیم نسواں بھی اچھی چیز ہے۔ جب تک پردہ ہے تب تک تعلیم نسواں کی بہت ضرورت ہے۔ یہ پردہ دار کے لیے شغل بیکاری ہے۔ بیگم صاحب شب و روز اخبار بینی و مضمون نویسی میں لگی رہتی ہیں۔ آج ایک بڑے مزے کا لطیفہ ہوا۔ بیگم صاحب کفایت شعاری اور خانہ داری پر مضمون لکھ رہی تھیں۔ چاء کا وقت آگیا ملازمہ نے پاس میز پر چاء کے برتن لا رکھے۔ بیگم صاحب کا انہماک اسقدر تھا کہ ان کو خبر نہ ہوئی کہ کب چاء کے برتن رکھے گئے۔ مرغی ادھر اُدھر تاک میں پھر رہی تھی۔ تو س پر ٹھونگ مارنے کے لیے اس طرح چاء کے برتنوں پر آئی کہ کشتی برتن سمیت نیچے آئی۔ چاء کا سارا سٹ ٹوٹ گیا مگر کاغذی کفایت شعاری اور خانہ داری جاری رہی۔ عملی کفایت شعاری اور خانہ داری تو گھریلو پرانے فیشن کی چیز ہے سٹ تو گھر میں ٹوٹا کسی کو کیا خبر۔ دس بارہ روپیہ کی بات ہے مگر مضمون تو تمام دنیا میں پڑھا جائے گا۔ سب کو خیال ہوگا کہ مضمون نگار خود بڑی زبردست منتظم ہوگی

صاحب کمال ہونا اتنی مفید بات نہیں ہے جتنی صاحب کمال مشہور ہونا۔

. . . .

یکم یکم اپریل۔ کسی نے غضب کا اپریل فول کیا۔ آج کے "رسالہ حقوق نسواں" میں میرے نام سے ایک مضمون شائع کرایا ہے جس کی سرخی "جنگجو بیوی" رکھی ہے۔ بیگم صاحب کو شبہ ہے کہ میں نے اس رسالے میں ان کے لیے ایک آئینہ رکھدیا ہے۔ مجھے شبہ ہونے پر تعجب نہیں ہے شبہ کی تو گنجائش ہی نہیں جب میرا نام موجود ہے مگر تعجب اس امر پر ہے کہ وہ تو جنگجو نہیں پھر کیوں شبہ کرتی ہیں کہ "جنگجو بیوی" ان کا اپنا مرقع ہے۔ میں نے لاکھ کہا کہ نہ میں نے یہ مضمون لکھا نہ تم مخاطب ہو نہ یہ تمھاری تصویر ہے ممکن ہے کسی نے میرے نام سے مضمون لکھا ہو۔ ممکن ہے مضمون نگار میرا ہمنام ہو مگر شام تک جنگ جاری رہی۔ آخر جب میں عاجز آگیا اور سونے لگا تو میں نے کہا کہ تم جیتیں اور میں ہارا واقعی میں غلطی پر تھا جو یہ سمجھتا تھا کہ تم جنگجو نہیں ہو۔

راقم جنگجو بیوی کا صلح پسند خاوند

اسلام بائی قاری

یعنے

قاری سرفراز حسین صاحب عزمی دہلوی (علیگ) سیاح جاپان وانگلستان کے انگریزی زبان میں متصوفانہ مضامین کا مجموعہ۔ یہ مضامین بڑی قدر کے ساتھ امریکہ کے مشہور رسالوں میں چھپے تھے اب دوبارہ چھاپ کر نہایت خوبصورت جلد میں ہدیۂ شائقین کیے جاتے ہیں۔ قیمت میں بھی تخفیف کردی گئی ہے اور اب تا اطلاع ثانی اسکی قیمت مع محصول الڈاک ۱۲/ ہے

پتہ: دفتر رسالہ "تمدّن" پل چھاؤ لال لکھنؤ

عورت کے جذبات

پردو سہیلیون کے خیالات

(ا)

میں حیران ہوں کہ خدا نے یہ بدبخت بے بس و ناچار مخلوق (عورت) بھی کیوں بنائی؟ میرے خیال میں اس سے کچھ بھی فائدہ نہیں پیدائش نسل انسانی کا کوئی اور ذریعہ بھی ہو سکتا تھا صرف اتنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں مصیبت میں پھنسایا تو بہ توبہ جس گھر میں بیٹی پیدا ہو جائے ایک نحوست سمجھی جاتی ہے اور تو اور وہی جس نے نو ماہ پیٹ میں رکھکر طرح طرح کے مصائب و تکالیف جھیل کر یہ دن حاصل کیا کہ اپنی ایک ہمجنس کو دنیا میں لا سکی) دایہ سے یہ سن کر کہ "لڑکی ہے" مغموم و رنجیدہ ہو جاتی ہے۔ آہ آہ اے ناچیز عورت تو کیوں بنائی گئی۔ سنی سنائی تو خیر سب سے پہلے میں آپ بیتی سناتی ہوں۔

میں جب اپنے والدین کے گھر پیدا ہوئی تو کوئی چھ لڑکیوں پر ساتویں بیٹی نہ تھی کہ مصیبت و بار خیال کی جاتی بلکہ مجھ سے پیشتر بفضل خدا تین بیٹے گھر کی رونق و دولت ماں باپ کی راحت ذریعہ بخشش و نجات آخرت کنبہ و خاندان بھر کی عزت موجود تھے لیکن پھر بھی مجھے پتھر کنکر سے بدتر سمجھا گیا۔ سب کے دل جل گئے ایسے کہ گویا خدا کے گھر ان لوگوں نے بیٹے کی قیمت ہی بھیجی تھی اور غیر توقع ان کو بیٹی دی گئی۔ خیر جیسے تیسے ماں نے دل پر صبر کی سل رکھی اور مجھے پرورش کیا جب میں پیدا ہوئی میرا بھائی صرف سال بھر کا تھا اسکا دودھ نہ چھڑایا گیا کہ ابھی بچہ کمزور ہے بلکہ آدھا اسکو آدھا مجھے پلایا۔ اسپر بھی وہ بیمار ہو گیا تو میری

دادی صاحبہ نے یہ حکم دیا کہ "دیکھو بہو بیگم ہمارا نور دیدہ لخت جگر" لاڈلے میاں" (لڑکے کا نام) بیمار ہو گیا ہے تم اسکا دودھ کم نہ کرو لڑکی اب چار ماہ کی ہے اسکو گائے کے دودھ پر لگا دو" ہائے میری بدنصیبی کہ جو حق خدا کی طرف سے بیٹے بیٹی کو برابر ملا ہے دنیا والوں نے اسے بھی غصب کیا محض اس لیے کہ میں بیٹی تھی۔ بیٹے صاحب تو سوا سال کے ہو کر بھی ماں کا ہی دودھ پئیں اور میں غریب چار ماہ کی گائے پر لگائی جاؤں۔ خیر یہ بھی ہوا میں نے اسی پر پرورش پائی چھٹے مہینے مجھے کلیا (کھچڑی ساگودانہ وغیرہ) چٹائی جانے لگی اور میں اسی غذا پر تین سال کی ہو گئی۔

اب میرا بھائی چار اور میں تین برس کی تھی دونوں سب کے ساتھ بیٹھکر ہر طرح کا کھانا کھاتے تھے۔ مگر اس میں بھی بہت امتیاز تھا اچھا برا سرد گرم باسی تازہ ثقیل و دیر ہضم ان باتوں کا خاص لحاظ رکھا جاتا۔ ماں کی تو نہیں کہہ سکتی مگر دادی صاحبہ خاص نگرانی کر کے مجھے اناپ شناپ کھلا دیتیں یا انہیں سے کھلوا دیتیں تھیں اور لاڈلے صاحب کو اپنے ہاتھ سے تیار کر کے خود کھلاتی تھیں اسپر بھی انکو روز زکام کبھی بخار کبھی سوء ہضمی ہو جاتی تھی۔ جس سے گھر بھر بیچین ہوتا تھا۔ تولے انصاف والو کیا میرا معدہ ہی پتھر تھا کسی حکیم کسی ڈاکٹر سے پوچھ کر بتاؤ کہ کیا بہ نسبت لڑکے کے لڑکی کی قوت ہاضمہ زیادہ مضبوط و اچھی ہوتی ہے؟ مجھے خوب یاد ہے کہ شام کو جب تازہ کھانا تیار ہونے میں دیر ہوتی تھی اور ہم دونوں کو بھوک لگتی تو کوئی ماما باسی روٹی دال سے یا شکر وغیرہ سے مجھے نکال کر کھلا دیتی اور لخت جگر کے لیے نماز مغرب میں دیر کر کے خود دادی اماں ارارورٹ نان پاؤ یا انڈا وغیرہ لا کر جلدی سے کھلا دیتیں۔ ہے ہے میرا جگر پھٹتا ہے وہ اوقات یاد کر کے جب کہ کوئی اچھی چیز میرے بھائی کھاتے ہوتے اور وہ کم ہوتی یا مجھے نہ دیتے تو اُن کو تو کوئی کچھ نہ کہتا مجھکو مانگتے دیکھ

کرتے دیکھکر گھرکیاں دے کر سب ہٹا دیتے یا کوئی خراب سی چیز دے کر بہلانا چاہتے۔ یہ حالت دیکھ دیکھکر مَیں نے بھی اچھی طرح سمجھ لیا کہ دراصل مَیں کم وقعت و ناچیز جنس ہوں اور وہ تینوں عرش کے تارے ہوں جوں جوں سمجھ آتی گئی مثل گھر کے لوگوں کے مَیں بھی اُنھیں تینوں کی پرستش میں مصروف ہوتی گئی اگر کوئی شے اچھی پاتی بھی تو دن بھر بچا بچا کر رکھتی کہ شام کو بھیّے مدرسے سے آئینگے تو دوں گی - وہ مجھے دق کرتے میری دوپٹیا (دوپٹہ) کھینچ بھاگتے میری گڑیا کی ٹانگیں چیر کر کیچڑ میں پھینکدیتے مگر میں تھی کہ اُنھیں کے نثار نہایت منت سے کہتی "اچھے بھیا مَیں صدقے جاؤں میری گڑیا دیدو" جب اور بڑی ہوئی تو یہ بھی دیکھا کہ میرا لباس کیسا ہوتا تھا اور ان کا کیسا - اکثر امّاں جان اپنے پرانے پاجاموں کو کاٹ کر میری بھجیا بنا دیتی تھیں معمولی ڈوریے نینوں کی ڈوپٹیا بنائی اور رنگ دی مَیں اُنھیں کو خوش خوش پہنتی تھی۔ ان کے لیے نئے قیمتی کپڑے آتے وہ ولایتی بوٹ پہنتے مَیں چھ آنے (۶؍) والی زیرپائی جو چلنے میں پیر سے نکل نکل جاتی تھی - ہاں جب کبھی عید بقرعید کے موقعوں پر اُن کے اچھے کپڑے دیکھکر ضد کرتی کہ میرے بھی ایسے ہوں تو دادی جان ڈانٹتیں کہ "چل دور مردار نظر نہ لگا اللہ میرے بچوں کو پھاڑنا نصیب کرے وہ باہر اندر جانے والے ہیں پھر وہ گھر کے مالک ہیں تیری اُنکی کیا برابری" مَیں صبر کرکے رہ جاتی اور وہی جوڑا پہنتی جو دادی امّاں کے جہیز کے شہر کے پاجامے کو کاٹ کر بنا تھا اور بھائی کی ململ کی پرانی قمیص کی کاٹ کر امّاں جان نے صدری سیدی تھی اور اپنے پھٹے کریب کے ڈوپٹہ میں گز بھر کی اوڑھنی نکال کر چھوٹا گوٹا ٹانکدیا تھا - پھر اگر وہ مجھسے جلدی پھٹ جاتے تو یہ خفگی کہ "لونڈیا کے جسم میں کانٹے ہیں کیا جلدی جلدی کپڑے پھاڑتی ہے"

میں کھا نتک سیوں" اور یہ کسی کو خیال نہ آتا کہ لڑکوں کے کپڑوں پر کسقدر روپیہ لگا ہے اور پھر وہ درزی نے سیے ہیں اُن کی تو سلائی ہی اِسقدر گئی ہے کہ جتنی لاگت میرے جوڑے پر بھی نہیں لگی۔ خیر خدا نے وہ زمانہ بھی گذارا۔ اب میں ۱۳-۱۴ سال کی جوان بیٹی گھر سنبھالنے کے قابل تھی اپنے کپڑے سیتی کھانا پکوانا گھر کی صفائی چھوٹے بچوں کا رکھنا یہ تمام فرائض جو اماں جان کے متعلق تھے۔ مجھپر عائد ہو چکے تھے۔ اگر ان میں سے کسی کام میں ذرا بھی کوتاہی ہو جاتی (صرف نماز قرآن وغیرہ میں لگ کر) تو مجھپر قیامت ٹوٹتی سب کے طعنے کہ "توج ایسی بیٹی پیدا ہو جس گھر میں جوان بیٹی ہوتی ہے کسی کو ہاتھ نہیں ہلانا پڑتا یہ باتیں یہاں تو نبھ جائینگی مگر پرائے گھر جا کر قدر کھُل جائے گی" غرض کہ میں سہم سہم کر ۱۲ گھنٹے دن اور ۴ گھنٹے رات کام ہی میں گذارتی۔ اور دیکھو میرے پڑھانے کا کسی کو خیال بھی نہ آتا تھا۔ مَلّانی کی تلاش ہوتی تھی قرآن شریف پڑھانے کے لیے مگر وہ دس روپیہ ماہوار مانگتی تھی۔ کوئی کھانا کپڑا بھی ساتھ چاہتی تھی اس لیے وہ بھی مقرر نہوئی۔ جب اور ہوش آیا تو دادی جان سے پوچھ پوچھکر خود ہی قرآن شریف ختم کر لیا۔ برخلاف اسکے لڑکوں کے لیے پانچواں سال لگتے ہی مولوی ماسٹر مقرر ہو گئے پھر ان کو اسکولوں میں داخل کیا گیا اسکے بعد بڑے بھائی جان کو ولایت بھیجنے کے خیال سے پیسہ پیسہ کر کے ابا جان نے سخت تکلیف اُٹھا کر دس بارہ ہزار روپیہ جمع کیا اور اُن نور بصر کو بغرض تعلیم روانہ انگلینڈ کیا جنھوں نے بجائے دس کے بیس ہزار خرچ کر دکھایا اور ابا جان کو قرض لے لیکر بھیجنا پڑا۔ اور وہاں سے آئے تو ایک میم صاحب ساتھ لائے جسکو لے کر علٰحدہ کوٹھی میں رہے۔ پہلی بیوی بیچاری کو ابا جان نے بھرا اُنکی کمائی سب میم صاحبہ پر صرف ہوتی تھی اور یہ برابر قرض ہوتا تھا جو مجبور ہو کر ایک

گاؤں فروخت کرکے ادا کیا گیا۔ یہ راحت و مسرت و دولت و عزت ان ولیندس حاصل ہوی جنکو خون پانی ایک کرکے پرورش کیا گیا۔ میں غریب گھر کی انمول خدمتگزار بیماروں کی تیماردار ہمدرد وجاں نثار بری تھی بُری۔ پندرھویں سال میری شادی کردی گئی ظاہرا اچھا گھر دیکھکر دیدیا گیا جو کچھ قسمت کا تھا وہ بھی لیگئی مگر میرے وہی نصیب میرے ساتھ تھے۔ اب سنو مختصر سا سسرال کا حال اوّل اوّل چند روز تو دُلہن پن کی خاطر ہوی پھر وہی دن آئے جو آنے تھے کوئی خدا نہ کرے شوہر میرا دشمن نہ تھا بلکہ مساوات زمانہ کے موافق مجھ سے محبت کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میری حالت سُنو۔ اب میں سُسرال سے الگ اپنے شوہر کی جاے ملازمت پہ ہتی اور پانچ بچوّں کی ماں۔

جاڑوں میں صبح پانچ بجے اُٹھتی۔ گو ایک اصیل بھی تھی مگر شوہر کے حکم کے مطابق خود ہی آگ جلا کر پانی گرم کرتی چاء بناتی۔ جب وہ مُنھ ہاتھ دھو کر چاء پی کر باہر کے کمرہ دفتر میں چلے جاتے تو بچوں کو اُٹھا کر مُنھ دُھلاتی ایک نہ دو اکٹھے پانچ۔ دو گھنٹے ان کے کپڑے بدلانے ناشتہ کرانے میں صرف ہو جاتے۔ ماما گھر میں جھاڑو دیتی برتن مانجھتی۔ میری نماز بھی صبح کی کسی نہ کسی دن قضا ہوتی تھی کیونکہ بچےّ جاگ پڑتے اور رونے لگتے تھے تو وہ کہتے کہ جلدی چُپ کراؤ گھر دوزخ ہو گیا میں یہاں آنا بند کروں گا" اس لیے بہت ہی احتیاط کرنا پڑتی تھی۔ گو میرا شوہر کچھ بُرا نہ تھا لیکن فضول خرچ اور بہت سا وقت دوستوں بھیسیوں میں گذرانے والا ضرور تھا اکثر راتوں کو باہر رہتا تھا۔ اورجب بچےّ پیدا ہو گئے انھوں نے راتوں میں جاگنا رونا شروع کیا تو یہی عذر کرکے کہ "نیند آنی حرام ہے" اندر کا سونا چھوڑ دیا۔ اب یہ حالت تھی کہ مہینہ میں اگر آٹھ راتیں باہر کے کمرہ میں سوتے تو بائیس راتیں غائب۔ مجھے سب پتہ چل جاتا تھا مگر اُف کرنے کی اجازت

نہ تھی۔ سو روپیہ ماہوار تنخواہ تھی جسمیں پچاس کل اخراجات خانگی کے لیے مجھے ملتے تھے اور پچاس انکا جیب خرچ تھا۔ میں اسپر بھی شاکر تھی کیونکہ میری پرورش اسی طرح ہوی تھی۔ اور اب مجھے یہ ثابت ہوگیا تھا کہ میرے والدین نے جس طریق سے مجھے پرورش کیا ایک ہندوستانی عورت کے لیے یہی ضروری ہے کیونکہ نازونعم کی پلی لڑکی آیندہ زندگی کی سختیاں صبر وتحمل کے ساتھ کبھی برداشت نہیں کرسکتی۔

اوہو میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی سُنانا تھا اپنا روزنامچۂ زندگی۔ ہاں تو میں بچوں کے کام سے فارغ ہوتی اتنے ماما کھانے کا حکم لینے کو آجاتی۔ گدام میں جاکر جنس تول کردیتی۔ پھر ننھے بچوں میں گرفتار۔ ان کا کوئی کپڑا سیتی۔ اس میں وقت گذرتا بارہ بجے یا تو وہ خود کھانا کھانے آجاتے یا دفتر منگا بھیجتے اگر کھانا دفتر جاتا تو جو کچھ تھا باہر کے خیال سے بھیجدیتی خود چٹنی سے کھالیتی۔ اور آجاتے تو خیر کچھ مجھے بھی بچ رہتا اسکے بعد نماز ظہر کا وقت تھا پھر شام کے پکنے کو جنس دینی بچوں کو ناشتہ کرانا۔ بستر لگانا۔ سب خود کرنا ہوتا تھا کپڑے تک ان کے گھر میں دھوتی تھی۔ مگر اسقدر محنت پر بھی وہ (شوہر) اپنی خوشی ظاہر نہ کرتے تھے ہر وقت رنجیدگی میری ناقابلیت کی شکایت ہی رہتی تھی سہ پہر سے جو نکلتے تھے تو رات کے گیارہ بارہ بجے تک آتے تھے اور حکم تھا کہ روٹی تازی تازی گرم توے سے اترتی ملے۔ اب ایک روپیہ ماہوار کی ملازمہ ماما کو بارہ بجے تک جاگنے اور یہاں رہنے کی کیا ضرورت تھی نہ میں زور ہی کرسکتی تھی شام سے فراغت پائی روٹی لی اور گھر چلی گئی۔ اب میرا یہ نقشہ ہے کہ باورچیخانہ میں آٹا گندھا پیڑے بنے آگے رکھے آگ جلائے توا چڑھائے بیٹھی ہوں کہ جیسے ہی بوٹ کی آواز آئے فوراً چپاتی ڈالوں ایک بچہ جو شیر خوار ہے گود میں ہے دوسرا ضد کررہا ہے کہ اماں چلو تو پلنگ پر لیٹوں بڑے تینوں یہ کہتے ہیں کہ "ہم اکیلے تو دالان میں نہیں سوتے

ڈر لگتا ہے تم بھی چل کر بیٹھو تو سوئیں" پانچوں مجھے لپٹے ضد کر رہے ہیں اور میرے آگے آٹے کی لگن خشکی کا طباق دھرا ہے اُنکی تکلیف وضد اُٹھا رہی ہوں مگر اُن کے باپ کے لیے گرم روٹی کا انتظام نہیں چھوڑ سکتی آخر نیند سے مجبور ہوکر بڑے تینوں تو وہیں پلنگ پر (باورچی خانہ میں ایک پلنگ پر میں نے دری بچھا رکھی تھی لیٹ کر سو گئے چوتھا وہیں میرے قریب پیڑھی پر پاؤں لٹکائے اونگھ گیا پانچواں تو گود میں تھا ہی جو میرا دودھ نہیں خون چوس رہا تھا۔ روزانہ اسی حالت میں کسی دن گیارہ۔ کسی دن بارہ بجتے جب وہ آتے فوراً ہی چپاتی بنا کر توے پر ڈالتی اب سنو اس ناخدا ترس کی بجائے خوش ہونے وافسوس کرنے کے یہ کہتا کہ "اُف تم بھی کسقدر نادان ہو پرورش اولاد کے بالکل ناقابل ہو تعلیم جو نہیں کیا کرو دھوئیں میں بچوں کو ڈالا ہوا ہے اس بیچارے کے پیر زمین میں لٹک رہے ہیں۔ ان کو سلا کر یہاں آنا تھا لاؤ جلدی کھانا" اور ایک آدھ نہیں یہ سب کچھ ادا کیا اور اُلٹے پیروں باہر بیٹھک میں چلے گئے میں نے جلدی جلدی کھانا نکالا بڑے لڑکے کو (جس کی عمر آٹھ سال کی تھی) جگا کر باہر بھیجا کہ کھانا تیار ہے اور خود بچوں کو سمیٹ کر دالان میں چلی گئی تب باہر سے نوکر آیا اور سینی اُٹھا لیگیا بچوں کو سُلایا جلدی جلدی پان بنائے۔ باہر بھیجے کہیں ایک بجے برتن آجانے پر پلنگ پر پڑی اور صبح ہی ۵ بجے پھر اُٹھنا۔ کسی دن وہ گھنٹے بھر کو کھانا کھاکر اندر آجاتے تھے ورنہ وہیں سو رہتے تھے۔ صبح چا پینے آتے پندرہ منٹ بعد پھر باہر۔ اب آجکل یہ ہے میری عین بہار زندگی جس کی تمنائیں کنواری لڑکیوں کو ہوتی ہوں گی۔ دنیا کی نظروں میں کچھ بھی بُرا نہیں خدا کے فضل سے نئو ماسیاں نوکر پانچ بچوں کی ماں گھر بار سب کچھ حاصل ہے۔ شوہر بھی سمجھتا ہے کہ جیسا میں نے بیوی کو رکھا ہے دوسرا کم رکھے گا۔ اور میں صبر وتحمل سے سب

برداشت کر رہی ہوں۔ یہ ایک میرا ہی حال نہیں بلکہ قریب قریب سب مسلمان مستورات ہند کی یہی حالت ہے۔ جس کی ان کو کچھ شکایت نہیں۔ اپنے سہاگ قائم رہنے کی دعائیں کرتی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ اُنھیں میں مَیں بھی ایک ہوں۔

لیکن اے انصاف والو! خدائے عادل و رحیم کے بندوں اتنا سمجھ رکھو کہ ایک دن تم کو بھی کسی طاقت کے سامنے جواب دینا ہوگا۔ یہ خودمختاری خود فعلی چند روزہ ہے جب بیکسوں کی فریاد سُنی جائے گی تم سے بھی پرسش ہوگی۔ ہماری تو اچھی یا بُری گذر رہی ہے گذر جائے گی۔

ایک ہندوستانی مسلمان عورت

شکریہ اس امر کے اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ "تمدّن" کی موجودہ حالت کیا ہے کیونکہ انصاف پسند ناظرینِ "تمدّن" نے گذشتہ چھہ ماہ میں بخوبی اندازہ کرلیا ہوگا۔ ناظرینِ "تمدّن" کی خدمت میں اسقدر عرض کردینا ناموزوں نہوگا کہ وہ اگر "تمدن" کو اس سے بہتر حالت میں دیکھنے کے خواہشمند ہیں تو انکو "تمدّن" کی توسیع اشاعت کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر "تمدّن" کے ناظرین میں سے صرف سَو حضرات نے بھی ہم کو ایک ایک خریدار عنایت کیا تو ہم یقیناً اس قابل ہوجائیں گے کہ سابق کی طرح "تمدّن" میں تصویریں بھی شائع کرنے لگیں گو اس زمانے میں جبکہ کاغذ کی گرانی ناقابل برداشت ہے کسی رسالے کے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ وہ اپنی ظاہری آب و تاب قائم رکھ سکے مگر ہم وعدہ کرتے ہیں کو اگر ہم کو سَو خریدار اور مل گئے تو ہم تصویریں بھی شائع کرنی شروع کردینگے۔ جن حضرات نے اسوقت تک توسیع اشاعت میں کوشش فرمائی ہے ان کے نام نامی شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہیں:-

جناب چودھری شفیق الزمان صاحب رئیس۔ جناب چودھری حامد حسین خانصاحب رئیس۔ جناب قاضی عبدالعزیز صاحب عزیز۔ جناب ڈاکٹر مشرف الحق صاحب پی۔ ایچ ڈی۔ جناب مولانا حکیم سید علی صاحب آشفتہ لکھنوی۔

میرا خیال ہے کہ

ہم گلستان جہاں کے پھول ہیں

(دوسری سہیلی کے خیالات)

کیسی ہی پُر بہار جگہ کتنا ہی پُر فضا چمن کسقدر دلچسپ مقام کیوں نہو اگر وہاں یہ گلِ وفا (یعنی عورت) موجود نہیں ہے تو اُس کی دل کشی و دلفریبی میں اک گونہ کمی ہے۔ مَیں تو یہی سمجھتی ہوں شاید اس لیے کہ ابتداءِ عمر سے اپنے پیارے باپ اپنے عزیز بھائیوں، ماموؤں چچاؤں وغیرہ سے ایسا ہی سُنا ہے جسکا یہ نتیجہ ہے کہ میرے دل میں عورت ذات کی بہت ہی قدر ہے اور نہ میرے اپنے ہی دل میں بلکہ یہ سمجھتی ہوں کہ کُل مردوں کے دل میں اس صنفِ نازک کی قدر ہے اور بغیر اسکے وہ اپنی زندگی کو پُر لطف نہیں بنا سکتے۔ اوروں کو تو جانتی نہیں اپنا کچھ حال سُناتی ہوں شروع سے آج تک کا مختصر مختصر قصۂ زندگی یہ ہے اماں جان کی شادی کے دس سال بعد مَیں پیدا ہوئی میری پیدایش کی وہ دھوم وہ خوشی ہوی کہ کسی کے بیٹے کی نہوئی ہوگی۔ تمام گھر والے مسرت و انبساط سے پھولے نہ سماتے تھے۔ خوش قسمتی سے میرے دادا جان بھی زندہ تھے۔ چھوٹے چچا بندوقیں چھوڑتے پھرتے تھے۔ پھر تمام گھر دادا جان کو انعام کے لیے لپٹ گیا اُنھوں نے بھی بہت خوشی سے اپنے روپیوں کی تھیلی کا مُنھ کھول کر خوب انعام دیا اُسی وقت سے شادیانے بجنے لگے۔ بڑے ہی سامان سے چھٹی و عقیقہ ہوا۔ ہزاروں روپیہ صرف کیا گیا۔ اب مَیں دادا جان کی گود کی رونق دل کا چین آنکھوں کی ضیا رہتی۔ گھر بھر مجھپر قربان ہوتا تھا میری پرورش و تربیت کا بڑا انتظام تھا

ایک بچی کے دودھ پلانے کو دو دو انائیں مقرر تھیں تین کھلائیاں۔ غرض کہ جوں جوں بڑھتی گئی میرے چاؤ چونچلے بڑھتے ہی گئے۔ گو میرے بعد خدا نے میری اماں جان کو بیٹے بھی دیے مگر جو میری قدر تھی اُن کی نہ تھی۔ پانچواں سال لگا تو بڑی دھوم دھام سے بسم اللہ کی گئی۔ ابا جان بھی دادا جان کے برابر ہی مجھے چاہتے تھے۔ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ "کہتے بیٹوں کی ماں تم ہو اور بیٹی میری ہے" چنانچہ ایسا ہی ثابت کیا لڑکوں کو اماں جان نے پرورش کیا اور میں باپ کی گود میں پلی۔ جب وہ زمانہ نزدیک آیا کہ مجھے علٰحدہ کرنے کی فکر کی جائے تو اماں جان نے اس کام پر زور دیا مگر ابا جان نے جہانتک ہو سکا ٹالا۔ وہ کہتے تھے کہ "میں بغیر اپنی ننھی کے گھر میں کس طرح رہوں گا میں اس کی شادی نہ کروں گا" لوگ بہت ہی ٹوکنے لگے میری بھی عمر پندرہ سال سے اوپر نکل گئی بیسیوں جگہ سے پیام آئے جو صرف علٰحدگی کے خیال سے ابا جان نے نامنظور کر دیے۔ لیکن تا بکے ؟ آخر مجھے جدا کرنا تھا کیا دل پر صبر کی سل رکھ کر ایک رشتہ تجویز ہوا۔ اللہ کی بھی بہت ہی مہربانی میرے حال پر ہوئی کہ میرا آیندہ زندگی کا ساتھی کچھ کم چاہنے والا نہ تھا۔ وہ ایسا ملا جس نے عاشق باپ کی جدائی میں مجھے سنبھالا خوش کیا اور خوش رکھا۔ تمام سسرال مجھے آنکھوں پر بٹھاتی اور کیوں نہ بٹھاتی جب کہ میرا ناز بردار میرا قدر دان شوہر مجھ پر دل سے فدا ہوتا تھا۔ دلہناپے کے چند دن بہت ہی عیش و آرام سے کٹے۔

اسکے بعد مجھے اپنا گھر کرنا پڑا۔ میرا عزیز شوہر مجھے اپنی نوکری پر لے گیا۔ جہاں ایک چھوٹے سے مختصر خوشنما گھر میں نے اپنے لیے آغوش محبت پھیلائے پایا۔ میں یہ جانتی تھی کہ میرے ہر طرف محبت ہی محبت برس رہی ہے۔ اس

پیارے جان سے پیارے مکان کی ہر درو دیوار سے میرے لیے پیار ٹپک رہا ہے اسکے چھوٹے باغیچے سرسبز گملے معطر گلدستے مجھے چاہتے اور اپنی محبت بھری خوشبو سے اظہار الفت کر رہے ہیں۔ اور کیا بتاؤں اس مکان عزیز کے سب سے زیادہ عزیز دو گوشوں کی بابت جو مجھے جان سے زیادہ عزیز ہوگئے تھے ایک تو میرا کمرہ دوسری وہ جگہ جہاں پائیں باغ میں روش پہ ایک چھوٹا سا بنچ پڑا تھا جس پہ میرے آرام کے خیال سے میرے راحت رسان حقیقی (بعد خدا میرے مالک مجازی) نے ایک سبز مخملی گدا (کشن) ڈال رکھا تھا اس بنچ پہ ہم روزانہ صبح صبح طلوع آفتاب سے پیشتر نسیم سحر کا لطف اُٹھانے جا کر بیٹھا کرتے تھے۔ اُسوقت کی بہار اسوقت کی دلچسپی و دلفریبی کوئی میرے دل سے پوچھے۔

پوچھے تو مگر میں شاید بیان نہ کرسکوں۔ اُن جذبات پُر لطف کا دل سے زبان تک لانا محال ہے۔ تاہم جس قدر سُنا سکتی ہوں سنو میرا شوہر اس وقت سونے سے اُٹھکر لباس شب خوابی میں ہی ادھر چلا آتا تھا اُسکا سفید دھاری دار سلیپنگ سُوٹ سر کے پریشان بکھرے ہوئے بال چمکیلی کشادہ پیشانی پہ کچھ عجیب مدہوش کرنے والے ثابت ہوتے تھے۔ چونکہ اسوقت ذرا سردی ہوتی تھی مَیں چاہتی کہ وہ اپنا رگ لپیٹ کر باہر چلیں مگر نہیں مانتے تھے ہمیشہ میری ہی گرم شال لے کر آتے اور یہ کہتے کہ "اس میں جو خوشبو دلپسند ہے وہ میرے موٹے کمبل میں کہاں۔ اُسکو تو میں سالوں سے اوڑھ رہا ہوں کچھ لطف نہیں پایا سوا بوجھ ناگوار کے۔ مگر اس چادر محبت میں جو آرام ملتا ہے اسکو میں ہی جانتا ہوں" چنانچہ میری کسی ہلکے رنگ کی شال اُنپر ہوتی تھی اور اُن کے اوورکوٹ کا بالائی دوشولدر کیپ میرے سر پر چونکہ دو مین

سال کا انکا وہ استعمالی تھا اُس میں وہی خوشبو بسی تھی جو اُن کے جسم میں تھی۔ بس ہم دونوں کمرہ سے نکل کر اُس گوشۂ الفت میں آکر اُس بنچ پر بیٹھ جاتے۔ مجھے کچھ خبر نہ رہتی کہ کہاں ہوں۔

اک عجب حالت محویت میں وہ دُھندلا وقت گذرتا جب زرد و زرد سفیدی سحر نمودار ہونے لگتی تو میں بہت خوش ہوتی کہ اب اُن کا چہرا مجھے نظر آنے لگے گا۔ پو پھوٹتے ہی وہاں اور چند جاندار بھی آکر ہمارے شریک حال ہوتے اور پُرمسرت گانوں سے ہمارے بیہوش و بے فکر دلوں کو ہوشیار کرنا چاہتے یعنی کچھ خوبصورت چڑیاں ننھے غنچوں پر بیٹھکر چہچہانا شروع کرتیں جن کی خوشگوار و بیدار کرنے والی شیریں آوازوں سے ہم چونکتے ہشیار ہوتے اور اپنے اُس مالک حقیقی کی بندگی کا خیال آتا جس نے وہ نعمت مجھے بخشی تھی۔ بس وہیں وضو کر کے دو رکعت فریضہ ادا کرتے۔ پھر تھوڑا ٹہلتے ٹہلتے ہوئے پھولوں سے دل بہلاتے جن پر شبنم کے قطرے مثل ننھے موتیوں کے چمکتے ہوتے تھے۔ جو سورج کی کرنوں سے آدھے سفید آدھے سُنہری نظر آتے تھے۔ اور اکثر مذاق سے وہ ان پر ہاتھ رکھکر کہتے کہ لاؤ یہ چھوٹے موتی یہاں سے اُٹھا کر تمہارے بالوں میں پرو دوں پھر چند چھوٹے خوبصورت پھول توڑ کر میرے سر پر لگا دیتے اب سورج اچھی طرح نکل آتا نوکر لوگ کمرے صاف کر چکتے اور ہم واپس اندر جاتے۔ منھ ہاتھ دھو کر بال بناتے کپڑے بدلتے کہ چاء تیار ہونے کی اطلاع ملتی بعض بعض دن ہم اپنے ہاتھ سے وہیں چائے بنا کر پی لیتے۔ میرے ہاتھ کی تو ہر ایک چیز کو وہ بہت پسند کر کے شوق سے کھاتے۔ اسکے بعد اپنے کمرے دفتر میں جا بیٹھتے اور میں گھر کے کاموں کی طرف متوجہ ہوتی۔ نوکروں کی صفائی جھاڑ پونچھ سے مجھے اطمینان نہوتا تھا ایکبار پھر ہر ایک چیز کو اپنے ہاتھ سے صاف کرتی کھانا پکوانے کو جنس نکالکر بھیجتی اور

اس سے فراغت پا کر کچھ لکھنے پڑھنے یا سینے لگ جاتی۔ نو بجے وہ دفتر جاتے لیکن اس اثنا میں بھی چند بار کئی کئی منٹوں کو میرے کمرے میں کھڑے ہو جاتے تھے قریب بارہ کبھی ایک بجے کے دفتر سے واپس آکر کھانا کھاتے وہ وقت بھی بہت اچھا گذرتا پھر تھوڑی دیر آرام کر کے سہ پہر کے کاموں میں مشغول ہوتے میں نماز ظہر سے فارغ ہو کر باورچی خانے کا سامان دلواتی۔ اور بعد عصر اکثر ہم دونوں کسی ایک جگہ شام کی ہوا خوری کو چلے جاتے کبھی وہ الگ اپنے دوستوں میں اور میں الگ بھی ٹہلنے جاتے لیکن اسوقت کا بیقراری سے انتظار ہوتا تھا کہ کب گھر پہنچیں اور وہی راحت میسر ہو کہ ہم ایک جگہ ہوں بعد مغرب کبھی قریب عشا گھر واپس ہوتے اکثر میں کھڑی ہوتی تھی ان کے بوٹ کی آہٹ سُن کر خوشی سے دل اُچھل پڑتا وہ کمرے میں داخل ہونے کی جلدی کرتے اور میں دروازہ میں جا کر لینے کی۔ غرضکہ ہم ایک دوسرے سے الگ ہو کر ایک منٹ بھی پوری خوشی حاصل نہ کر سکتے تھے۔

کچھ دن تو اسی طرح تنہائی وبیفکری میں گذرے پھر بفضل خدا وہ زمانہ آیا جو اگر نہ آتا تو میں دنیا کی بدنصیب بے اولاد نا شگفتہ مراد عورتوں میں شمار کی جاتی۔ خدا نے وہ وقت دیا جسکے لیے میں حقیقتاً بنائی گئی تھی۔ یعنی ہمارے گھر کا چراغ گُل مراد ہم کو ملا۔ میرے لڑکا پیدا ہوا۔ بالکل اپنے باپ کی شکل۔ جس سے میں بہت خوش ہوئی کہ جس وقت اس کا باپ گھر موجود نہوا کرے گا میں اسکی پیاری شکل دیکھ لیا کروں گی اپنے باپ کو بھی وہ بہت عزیز تھا وہ کہتے تھے کہ ابتک جو ہم لوگ اپنے گھر کے ان بیجان پھولوں سے دل خوش کیا کرتے تھے یہ بیفائدہ تھا اب خدا نے زندہ و اصلی پھول دیا ہے مگر یہ بھی تمھاری ہی خوبی ہے اگر تم نہ آتیں تو میں اس گُل کو کیونکر پاتا تمھارے ہونے سے نہ صرف میرا باغیچہ میرے گملے اور گلدستے ہی سرسبز و تر و تازہ رہتے

لگے بلکہ ایک اور سب سے زیادہ قیمتی و خوشنما و دل خوش کن پھول بھی تم نے کھلاؤ۔
بچہ پیدا ہونے سے میری مصروفیت زیادہ اُسکی طرف ہونے لگی۔ اس سے
پہلے مجھے صرف رات دن ایک اُسی کے خیال میں اُسی کے محبت و آرام و خوشی
کے انتظام میں لگا رہنا یا گھر کی دیکھ بھال و کیاریوں کا سینچنا ہی رہتا تھا۔ اب
اس نوشگفتہ پھول کی پرورش بھی عاید ہوگئی۔ میری مسرتوں میں ایک بیش بہا
اضافہ ہوا۔ اُن سے فراغت پاکر بھی میں دن بھر اپنے ننھے بچے اور گھر کے پھولوں
میں مصروف رہنے لگی۔ میں نہیں بیان کرسکتی کہ کس قدر خوشی تھی اسکا اندازہ
خود میں بھی نہیں لگا سکتی۔ دنیا میرے لیے بہشت اور میں اپنے گھر کی حور تھی۔
صرف اتنا کہہ سکتی ہوں۔

کس طرح لوگ کہتے ہیں کہ عورت "ناچیز ہے بیکار ہے عورت وبال جان ہے"
جگ بیتی کو کیا جانوں میں تو آپ بیتی کہتی ہوں۔ میں تو اپنے میکے اور پھر اپنے
شوہر کے لیے گویا نعمت غیر مترقبہ تھی میں بہت خوش ہوں کہ دنیا میں آنے کا میں نے
پھل پایا۔ سب سے زیادہ قابل قدر و قیمتی شے یعنی "محبت" وہ میں نے بھرپور
حاصل کی۔ میرا شوہر مجھے اپنی جان سے زیادہ چاہتا ہے اگر میں اُسپر پروانہ وار
نثار ہوں تو وہ مثل بھونرے (گو یہ تشبیہ غلط ہے بھونرا بدنما سیاہ اور میرا شوہر
خوبصورت چاند کا ٹکڑا) کے میرے گرد مجھپر فدا ہوتا ہے۔ میں اسکو دیکھ کر جیتی ہوں
تو وہ بھی میرا ہی دم بھرتا ہے۔ غرض کہ میں دنیا میں ایک گہوارہ محبت میں جھولکر
ایک پرنشاط و بے فکر زندگی بسر کررہی ہوں۔ خدا میرے سے نصیب سبکو دے۔ اب
ایک آخری تمنا یہ ہے کہ اپنے ابا جان و بھائیوں کے سامنے اپنے شوہر کے ہاتھ
سے وہ قیام گاہ ابدی بھی حاصل کروں جہاں ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے۔ میرا شوہر میرے باپ اپنے محبت
بھرے ہاتھوں سے مجھے تہ خاک آرام سے سلائیں۔ آمین یارب العالمین۔ ایک خوش نصیب عورت

ویران صنم خانے

بچپن! بچپن کا پرستشکدہ! جسکا گنبد نیلگوں تھا، تاروں کی جسمیں قندیلیں لٹکی ہوی تھیں، وہ قندیلیں جو ہماری تمناؤں کے بعد جھلمل جھلمل کرتی ہوی اور ہماری طرف دیکھتی ہوی، جانی پہچانی آنکھیں بن کر لٹکتی تھیں، جسمیں ہوا، ایک بازو میں امید ایک بازو میں بیم لیے ہوے ہم تک آتی تھی اور کسی کو بے آرام کرتی ہمیں لوریاں دیتی تھی سر سبز مرغزاروں سے راگ، رنگین سمندروں سے سازہاے موسیقی اس پرستشکدہ تک آتے تھے۔ معبد طفلی! ہم تمام پھولوں سے، درختوں سے، میدانوں سے باتیں کرتے تھے اور تمام جھینگر اور ٹڈے اور چھوٹے چھوٹے پرند ہمارے ساتھ شریک ہو کر اس پرستشگاہ میں پرستش کرتے تھے۔ اے معبد طفلی! تیری ایک بلیغ زبان تھی، جو ہمارے روح کے تمام جذبات اور انقلابات کی ترجمانی کرتی تھی۔ کسی معبد کا سنگ در تجھ جیسا شفاف نہیں۔ کوئی معبد ایسی آہنگ شیریں سے بھرا ہوا نہیں، نہ کسی کی زمین ایسی چکا چوند کرنے والے رنگوں سے پچی کاری کی گئی ہے۔ اور ہاں کوئی پرستشگاہ ایسی نہیں جہاں عظمت و قدرت الٰہی کے ساتھ ساتھ غضب الٰہی ایسے سیاہ رنگوں، ایسے مدہش آوازوں سے قلب پر مستولی ہوتا ہو۔ کونسا معبد ہے کہ جسکی دیواروں کے اندر معبود ایسا ضیا دار ہو، اور اس ملوکب مزین عبادت گاہ میں خود پجاری بھی چمک رہا ہو اور روز افزوں لذت حیات سے متلذذ ہو۔

رات کو تیری تبسم اور ساکت قندیلوں کے سائے میں تیری مدہم اور مبہم روشنیوں میں کائنات کی تھکی ہوی آواز کو سن سن کر ہم سوتے تھے، اور دن کو تیرے اُس نور میں جاگتے تھے جو فضا کو روشن کیے ہوئے ہوتا تھا اور کائنات کے ساتھ ہمیں بھی آغوش

نور میں سے لیتا تھا ہم کسے اور کیوں پرستش کرتے تھے ہمیں خبر نہ تھی مگر سادہ حسن حیات ہماری نماز تھی اور ہماری ہر اک حرکت ارکان نماز اسقدر صمیمی اسقدر شدید زندگی وہ زندگی جو صرف زندہ رہنے کے قدرتی لطف اُٹھانے کے لیے ہو کیا پرستش کی پہلی شکل نہیں ہے؟ اس سے زیادہ صحیح اس سے زیادہ طبیعی پرستش کیا ہوسکتی ہے؟ اس خوبصورت معبد میں ہر دن ہماری زندگی میں نئی عجائبات پیش کرتا تھا اور ہماری روح کو ایک تازہ مسرت انگیز لرزش حیات بخشتا تھا اور ہم ایک غیر اختیاری وجد کی حالت میں گویا سجدہائے پرستش کرتے تھے۔

ہمارا پہلا معبد: معبد طفلی! چند سال ہم نے تیرے گنبد کے نیچے پرستش میں گذارے تیری پوجا کی۔ بعد میں جب دوسرے معابد میرے سر پر آ کر گرے اور میری روح پریشان و نا امید ہوی اور میرا دل کسل اور فتور سے بھرا تو میں نے ہمیشہ تیری قندیلوں کی روشنیوں میں جا کر پناہ لینے کی کوشش کی۔ مگر آہ تو بھی اُن معابدوں ہی کی طرح بیجان و خاموش ہو گیا۔ تیری قندیلیں میری روح تک نہیں پہنچتیں۔ تیری نسیم بوریاں نہیں لاتی، بلکہ وہ اب ایک نابینا قدرت کا جھکڑ ہے جو درختوں کو اُکھاڑتا ہے نشیمنوں کو ویران کرتا ہے۔ تیرے آبشاروں سے اب کوئی موسیقی پیدا نہیں ہوتی، بلکہ وہ ایک آوازۂ یاس ہے جو یتیم انسانیت کے جگر سے نکل رہی ہے یا وہ انسان کی صدائے الامان ہے جسے کہیں امان نہیں، جا تجھے بھی خراب ہونا تھا اے معبد تو خراب ہو ہی چکا تیری قندیلیں بجھ گئیں تیرے مرغزار سوکھ گئے تیرے معطر و سبز چمن تپتے ریگستان ہو گئے آہ بھی اک تاریک اور ویران عالم ہو گیا اس کھنڈر میں بیٹھ کر میں اپنے معبد کا ماتم کر رہا ہوں

. . . .

عشق و محبت کے بت! ان فانی معبودوں کے ایسے کو ان ہے جسے معبد نہیں بنائے صنم خانۂ عشق بھی کیسا رنگین ضیا دار معطر صنم خانہ تھا۔ وہ کیسے صاف شفاف قندیلوں کے ذریعہ تاروں کی چمک، شفقوں کے رنگوں کو بڑھا بڑھا کر لینے میں لیتا تھا۔ اس کے حجروں میں سے جو نغمے سُنائی دیتے تھے وہ ایک دوسرے سے جُفت کرنے والے دلوں کے

ترانے تھے۔ اس معبد میں وہ نوجوان جمع تھے جو پھولوں سے لدے پھندے تھے جنکے ہونٹوں میں مسکراہٹ تھی اور جنکی روح عشق کی وجد سے رقصاں۔ مگر اسکی محراب میں میں نے ایک نوجوان دوشیزہ دیکھی جسکا چہرہ سالہاسال کے انتظار سے اپنی تروتازگی غائب کر چکا تھا، جسکی آنکھوں میں حزن و ملال نے مستقل طور پر جگہ کر لی تھی۔ یہ بیوقوف لڑکی اپنے حبیب کا انتظار کر رہی تھی جو اُسے کبھی نہ ملے گا اس نے میرے سامنے جان توڑ دی، اور میں نے اُسے اسی معبد کے دروازے میں۔ مٹی کے اندر دفن کر دیا تاکہ وہ روندی جائے اُن شیشے کے ٹکڑوں کو جنھیں وہ بلور سمجھے ہوے تھی میں نے اُسکے مدفن پر ڈال کر ایک نہایت سیاہ اور نہایت موٹی چادر سے اسے ڈھانپ دیا۔

سب سے زیادہ بیہودہ، سب سے زیادہ مضحک اور سب سے زیادہ دھوکا دینے والا معبد؟ معبد عشق، جہاں پیاری آنکھیں، اشارات محبت کر رہی ہوں اور دعوت عشق دیرہی ہوں، وہاں میں نے دو آنکھوں میں ضرور دھوکا اور خیانت پنہاں دیکھی جہاں دو ہاتھ ایک دوسرے کو محبت سے دبا رہے ہوں، وہاں ایک ضرور دوسرے کو فریب دے رہا ہے۔

طفلی، عشق کے ویران معبدوں کو چھوڑ کر میں آگے بڑھا، افکار و احساسات کے نادیدہ افقوں کی طرف، زندگی مدہش تیزی کے ساتھ مجھے لیگئی اور میں نے دوسروں کے معبدوں کے دروازوں میں سے اندر جھانکا۔ مگر میری نگاہ نے نہایت گہرے پردوں میں سے گذر کر دیکھا تو یہ دیکھا کہ ہر جگہ ویران معبدوں کے سوا، کچھ نہیں ہر قلب نے یہی کہا کہ میں کبھی تجلی گاہ انسانیت کبھی تھا، اب نہیں۔ وہ علوم جنکے لیے حکما سر کھپا رہے ہیں، وہ سوز و گداز بشری جنکی ترجمانی شعرا کر رہے ہیں، دوستی، عشق، دین، فکر بشر سب کے سب آخر میں دیکھیے تو ویران معبد ہی نظر آتے ہیں۔ دماغ اور قلب کے ویران صنم خانے۔

اب انھیں حسرت و یاس سے ہم تماشا سیر کرتے ہیں۔ سجاد حیدر

اکیلا بلبل

حضرت طور، ایم - اے

چمنستانِ محبت کا اکیلا بلبل! اے گلِ تر! وہ ترا چاہنے والا بلبل
عمر بھر رند جو میخانۂ جلوہ کا رہا بوسہ آشام ترے روئے مطرا کا رہا
رنگ و بو پر جو ترے جان دیا کرتا تھا مے نظارہ کو پی پی کے جیا کرتا تھا
جس کی منقار سے جاری تھی ترنم کی شراب جسکی ہر موجِ نفس پہ تھے ننھے ننھے نغموں کے حباب

آج کیوں اُسکی نوا سرمۂ گفتار ہوئی؟
بند منقار ہوئی! آنکھ نوا بار ہوئی

توُنے اے گُل! مری جانب سے جو مُنھ پھیر لیا خون ہو ہو کے جگر دیدۂ تر سے ٹپکا
بے رُخی سے تری جل جلکے ہوا سینہ کباب پی گئی جو غمِ دل میں تھی مسرت کی شراب
اب طبیعت میں تلاطم نہیں ہنگاموں کا اب کہاں شور وہ اگلا سا مے آشاموں کا

گرمیٔ سوزِ جگر سے مجھے بیتابی ہے
موجزن سینہ میں کیفیتِ سیمابی ہے

آ خدا کے لیے پیمانِ وفا تازہ کریں چمنِ عشق کی پژمردہ فضا تازہ کریں
پھر دکھا جلوۂ شاداب کی صورت مجھکو پھر دکھا روشنیٔ رخ کا نظارا مجھکو
آنکھ کو لذتِ دیدار سے بینا کردے لب کو تعلیمِ نوائے شکر آما کردے

ہے سحرگاہ تماشائے رخِ خنداں تیرا
طور ہوتا ہے ابد مرغِ غزلخواں تیرا

مسلمانوں کے پہلی صدی کے طبی کارنامے

یہ فخر کم کسی مذہب کو حاصل ہوگا کہ وہ صحت اور یقین کے ساتھ دعویٰ کرسکے کہ اسکے ماننے والوں نے پہلے ہی صدی سے علمی میدان میں تگ و پو شروع کردی تھی، لیکن اگر اسلامی تاریخ صحیح ہے، اور یقیناً صحیح ہے تو میں اپنی پوری طاقت سے دعویٰ کرسکتا ہوں کہ مسلمان ہی ایک ایسی قوم ہے جس نے عالم وجود میں قدم رکھتے ہی علمی خدمات انجام دینی شروع کردیں۔

فن طبابت ان فنوں میں سے ہے جس سے عرب کچھ پہلے سے بھی واقف تھے مگر ان کی طب عامیانہ تجربات اور ناداناتہ تخیلات سے زیادہ دقیع نہ تھی ہر مرض کا آخری علاج انکے نزدیک داغنا تھا۔ عرب کی طبی ترقی کا اصلی دور رسول اللہ صلعم کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔

اس عہد کا سب سے پہلا طبیب حارث بن کلدۃ ثقفی تھا۔ علمی اعتبار سے جیسا خوش نصیب تھا ویسا ہی مذہبی حیثیت سے بڑا بدقسمت بھی تھا سنہ ۱۳ھ یعنی خلافت ثانیہ تک زندہ رہا مگر مسلمان نہ ہوا۔ باوجودیکہ تمام بنی ثقیف بلکہ سارا عرب مسلمان ہوچکا تھا مگر ایک بندۂ خدا حارث بن کلدہ تھا جو منکر کا منکر ہی رہا۔ پھر بھی اس لحاظ سے قابل قدر ضرور ہے کہ عرب کی اس عام جہل دوستی کے زمانے میں جب پڑھنا لکھنا کیا بلکہ پڑھے لکھوں کے پاس بیٹھنا بھی ایک جرم عظیم تھا۔ یمن شام اور ایران کا سفر اختیار کرکے فن طب کی تکمیل کی اور پوری مہارت حاصل کی حارث نے اپنی تعلیم جندیسا پور ایران کے ایک علاقہ میں ختم کی۔ کچھ دنوں تک ایران ہی میں مطب جاری رکھا۔ وہاں کے طبقۂ رؤسا میں اچھی خاصی عزت حاصل کرلی تھی

کہ وطن کی محبت جوش میں آئی اور ایران سے اپنے وطن مالوف طائف میں چلا آیا تعجب ہے کہ باوجود تاستر جہالت اور علم کُشی کے عربوں نے اسے بڑی نعمت غیر مترقبہ سمجھا۔ یورپ والوں کی طرح بھلا بدعتی کہکر قتل نہ کیا جناب رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم بھی اس سے مسلمانوں کا معالجہ کراتے تھے چنانچہ جب حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیمار ہوے تو آپ نے اسی کو بُلایا اور آپ کا علاج کرایا بعض روایتوں میں آیا ہے کہ آنحضرت نے فرمایا فھو یسطب حارث اچھا علاج کرتا ہے

یہ محض ایک عرب ہونے کی حیثیت سے ایک غنیمت آدمی نہ تھا بلکہ ایرانیوں جیسی ترقی یافتہ قوم نے اسکی وجہ سے عرب پر رشک کیا، ایک دفعہ یہ عرب کی طرف سے ایک وفد کے ساتھ نوشیرواں کے دربار میں گیا' بادشاہ کو یہ معلوم کرکے پہلے سخت حیرت ہوی کہ ریگستان عرب میں بھی اس پایہ کا ایک شخص موجود ہے لیکن جب اس نے اسکا امتحان لیا تو لفظ اعطیت علما وخصصت فطنة وفھما خدا نے یقیناً تمھیں خاص علم و ذکاوت بخشی" کہہ ہی دینا پڑا۔ اور نہایت پُرزور مگر مہذب الفاظ میں عرب سے ایران چلے آنے کی رائے دی جس کا جواب اس نے حب وطن کی وجہ سے نفی میں دیا دوران تقریر میں نوشیرواں نے ہنسکر یہ کہا کہ عرب ایک وحشی قوم ہے اور تم ایک حکیم ہو حارث نے جواب دیا عالیجاہ! حقیقتاً وحشیوں ہی کو حکیم (معالج) کی حاجت ہوتی ہے۔

اس کا بیٹا نصر بن حارث بھی ایک قابل قدر طبیب تھا' باپ سے فن طب حاصل کر لینے کے بعد یمن و شام میں جاکر مہارت حاصل کی۔ مذہبی لحاظ سے اپنے باپ سے بھی زیادہ بدقسمت واقع ہوا تھا، بیچارہ حارث اگرچہ مشرک تھا مگر مفسد نہ تھا لیکن نصر بہت بڑا مفسد، بیہودہ اور فتنہ انگیز تھا جس کو اسکی شرارتوں کی وجہ سے بدر کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے قتل کر ڈالا۔

عہد نبوت کے بہترین طبیب حکیم الامۃ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ تھے جو ایک طرف تو اچھے جسمانی طبیب تھے، دوسری طرف روحانی طبیب ہونے کا تمغہ بھی حاصل کر لیا تھا۔ ابن ابی رمثہ فن جراحی میں خاص کمال رکھتا تھا جو حارث اور نضر کو بھی میسر نہ تھا۔ اغلب یہ ہے کہ مسلمان بھی تھا۔

جب عہد خلافت گذر کر سلطنت قائم ہوتی ہے تب بھی ہم مسلمانوں کو علمی خدمت سے کنارہ کش نہیں پاتے باوجود مسلسل خانہ جنگیوں اور عام شور و شغب کے مسلمانوں کے ہاتھوں سے دامن علم ہرگز نہ چھوٹ سکا۔ امیر معاویہ کے عہد میں دو بڑے بڑے طبیب موجود تھے ایک ابن اثال دوسرا ابو الحکم۔ آپ نے دونوں کو اپنے دربار میں بلا لیا، خصوصاً ابن اثال کو ہمیشہ آپ اپنے ساتھ رکھتے تھے اور اسکی علمی باتوں سے لطف اٹھاتے تھے ابن اثال مذہباً یہودی تھا مگر پھر بھی امیر معاویہ کے دربار میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا ابو الحکم ایک عیسائی طبیب (بلکہ حکیم) تھا جس کے علمی کمال نے امیر معاویہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا جب یزید کو امیر الحاج بنا کر مکہ بھیجا تو ابو الحکم بھی ساتھ تھا اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ امیر کو اسپر کتنا اعتبار تھا۔ اسکا بیٹا حکم بھی ایک ماہر حکیم تھا جس نے بنی عباس کے زمانہ میں خاصی شہرت حاصل کی اگرچہ یہ بھی پہلی صدی کے حکماء میں گنا جا سکتا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ پہلی صدی کے غیر بشر نباغ کا ایک غنچہ تھا جو دوسری صدی میں کھلا۔

خالد بن یزید کو علوم عقلیہ کی تحصیل کی طرف توجہ ہوئی چنانچہ خالد نے طب اور کیمیا سیکھنے کے لیے ایک حکیم کو ملازم رکھا جس کا نام حکیم[۱] تھیوڈوریا یوس تھا۔ یہ حکیم پہلا شخص ہے جسے ایک مسلمان کو علوم عقلیہ سکھانے کا فخر حاصل ہوا چنانچہ حکیم خالد بن یزید ایک ماہر طبیب اور کامل علم کیمیا داں ہو گیا۔ (باقی آئندہ) جلال ندوی۔

---

[۱] حکیم اُس شخص کو کہتے ہیں جو تمام علوم عقلیہ کا ماہر ہو۔

ابو الفیض فیضی

شاعری پر ملک و قوم اور آب و ہوا کا جو اثر پڑتا ہے وہ ایسا نہیں جسکو عام نگاہیں دیکھ سکیں علی الخصوص ایسے ممالک جو قریب ہوں اور ایسی قومیں جو ایک دوسرے کے آس پاس کی رہنے والی ہوں۔ انکی شاعری اور انکے مذاق میں امتیاز کرنے کے لیے بہت کاوش اور دقت نظر کی ضرورت ہے۔ ایک زمانہ گذرا کہ صدیوں تک فارسی ہندوستان کی تیغ زبان کا اصلی جوہر رہ چکی ہے۔ فارسی شاعری جب ہندوستان میں آئی تو اسکا نقشہ کچھ اور تھا۔ مگر جب ہندوستان کے جوش طبع نے اسمیں رنگ آمیزیاں کیں تو اسکے سادہ نقش و نگار پر لطف اور دلچسپ طور پر رنگین ہو گئے۔

ہندوستان کی آب و ہوا نے فارسی شاعری پر کیا اثر ڈالا۔ یہ بحث تفصیل اور وضاحت طلب ہے اسکے لیے میں کسی اور وقت کو مناسب سمجھتا ہوں۔ نیز وہ کون بزرگ تھے جنھوں نے فارسی شاعری کے سادہ چہرہ پر رنگین استعارات اور رولاویز تشبیہات کا غازہ ملا۔ اس حصۂ بحث کو بھی میں اسی وقت کے لیے اٹھا رکھتا ہوں لیکن میں اسوقت جس شخص کے حالات زندگی اور شاعری کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا ہوں وہ بھی اس لڑی کا ایک بیش بہا موتی ہے۔

یہ مضمون کوئی مفصل سوانح عمری نہیں اس لیے واقعات بہت اختصار کے ساتھ لکھوں گا۔ اور اجمالی طور پر حالات زندگی لکھنے کے بعد اگر موقع ہوا اور فرصت نصیب ہوئی تو کچھ اس کے کلام کا نمونہ پیش کرکے اسپر بھی ایضاح و تبصرہ لکھوں گا۔

ابو الحسنات ندوی

نام اور نسب

ابو الفیض نام فیضی تخلص ہے آخر میں فیاض تخلص کیا۔ چنانچہ اس بارہ میں خود اسکے دو بیت شاہد ہیں ؎

زین پیش کہ سکہ ام سخن بود — فیضی رقسم نگین من بود
اکنون کہ شدم بعشق مرتاض — فیاضیم از محیط فیاض

مگر شہرت فیضی ہی کی ہوئی۔ خاندان کے بارہ میں اسکے چھوٹے بھائی ابو الفضل کا جو بیان ہے۔ میں یہاں پر صرف اسکا ذکر کردینا کافی سمجھتا ہوں۔ ابو الفضل نے اپنی کتاب آئین اکبری کے خاتمہ پر اپنے خاندان کے حالات میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ملخص اور ماحصل یہ ہے۔

"اسلاف میں سے کچھ دولت و امارت کچھ علم و فضل اور کچھ عزلت نشینی اور ترک دنیا کے لباس میں اپنی عمریں بسر کرگئے۔ ان زندہ دلوں کا وطن یمن تھا۔ پانچویں پشت میں شیخ موسیٰ نامی بزرگ میرے دادا تھے۔ جن کا خیال ابتدا سے ترک دنیا اور زاویہ نشینی علم و فضل کی طرف مائل تھا۔ مگر یاد چھوڑ کر ترک وطن اور سفر پر آمادہ ہوئے۔ اور نویں صدی میں علاقہ سندھ کے قصبہ ریل میں پہنچے۔ اور یہیں خانہ داری پھیلائی۔ شیخ موسیٰ اگرچہ جنگل سے آکر شہر میں آباد ہوئے لیکن اپنی تمام عمر درویشانہ انداز سے گذاری۔ ان کے بیٹے پوتے بھی انکے نقش قدم پر چلتے رہے۔ دسویں صدی کے آغاز میں شیخ خضر (یعنی ابو الفضل کے دادا) کو آرزو ہوئی کہ اولیاء ہند سے ملاقات کریں اور دریائے عرب کی سیر کرتے ہوئے اپنے بزرگوں کی نسل سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہو جائے۔ یہ بزرگ اسی خیال سے بہت سے رشتہ داروں اور دوستوں کو لے کر ناگور (جو اجمیر کے شمال و مغرب میں واقع ہے) میں وارد ہوئے۔ یہاں

کئی نیک سیرت بزرگوں سے نیاز حاصل کیا۔ ان کے فیوض سے فیضیاب ہوئے اور ان ہی کے ایما سے سفر کا ارادہ فسخ کر کے ناگور ہی میں سکونت اختیار کی ابتدا میں شیخ خضر کے کئی بچے ہوئے مگر سب مر گئے۔ آخر سنہ ۹۱۱ھ میں شیخ مبارک اللہ (یعنے ابوالفضل اور فیضی کے باپ) پیدا ہوئے"

شیخ مبارک اپنے زمانے کا ایک بےمثل عالم تھا۔ زمانے کے دست حسد کی یہ فطرت ہے کہ جب کسی باکمال کے ستارے کو فضل وکمال کے آسمان پر چمکتا دیکھتا ہے تو اسپر مصائب و آلام کی خاک ڈال کر دھندلا کر دیتا ہے۔ شیخ مبارک نے بھی ان ہی مصائب و آلام سے تنگ آکر اپنے وطن ناگور کو چھوڑا اور ایک مدت پریشاں حال اور بے خانماں رہنے کے بعد شیخ یوسف مجذوب اور علاؤالدین مجذوب کے ارشاد سے ۶ محرم سنہ ۹۵۰ھ میں آگرہ آئے اور دریائے جمنا کے پار شہر کے مقابل چار باغ نامی بستی میں سکونت اختیار کی۔ وہاں ایک قریشی گھرانا رہتا تھا جو علم وفضل سے مالا مال تھا شیخ مبارک نے اسی خاندان میں شادی کی۔

فیضی کی پیدایش

سنہ ۹۵۴ھ جبکہ ہندوستان کا تخت حکومت شیر شاہ کے بیٹے سلیم شاہ کی جلوہ فرمائی سے بارونق ہو رہا تھا تو آگرہ کے مقابل چار باغ کی سرزمین بھی عالم معنی کے تاجدار کی آمد آمد کی خبر سنکر کچھ عجیب نشاط انگیز اور بہار دار ہو رہی تھی دریائے جمنا کی موجیں خوشی کے مارے اچھل اچھل جاتی تھیں کہ عنقریب اسکے پاس سے ایک ایسا سرچشمہ جاری ہونے والا ہے جو دنیا کے سوکھے اور مرجھائے ہوئے پودوں میں ایک تازگی و رنگینی پیدا کر دیگا۔ بالآخر اسی سال جبکہ شیخ مبارک کا سن ۴۳ سال تک پہنچ چکا تھا۔ ان کے گھر میں سپہر فضل وکمال کا ماہ کامل یعنی شیخ ابوالفیض فیضی پیدا ہوا۔

سن شعور اور تحصیل علم

بچپن کی زندگی نہایت افلاس و عسرت میں گذری - باپ کی نحوست کے سایہ میں وہ وہ تکلیفیں اُٹھائیں جو ناقابل برداشت تھیں - غریب باپ بھی نوشتۂ تقدیر کو کیا کرے جو کچھ لکھا تھا اسکو کون مٹا سکتا تھا - باایں‌ہمہ صعوبت و مصائب بچّے کی تعلیم سے ذرّہ برابر بھی غافل نہیں رہا - خود فضلائے عصر کا سرتاج تھا - اسلیے بیٹے کی تعلیم کے لیے کسی دوسرے کی احتیاج نہ تھی - خود تعلیم دیتا تھا - ہر علم کی کتابیں نہایت خوش اسلوبی سے پڑھائیں ہر فن میں دستگاہ پیدا کردی علوم عقلی و نقلی سب میں ایک مہارت اور ملکہ پیدا کردیا -

فن شاعری

فیضی نے شاعری میں جو فضل و کمال دکھایا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاعرانہ دل و دماغ لے کر پیدا ہی ہوا تھا - اور ملک الشعرا کا جو خطاب اسکو اکبر کے دربار سے ملا - وہ وہ اصل روز ازل ہی سے قسام ازل نے اپنے دربار خاص سے اسکو عنایت کیا تھا فیضی نے اور علوم و فنون کی طرح شاعری کے لیے بھی کسی دوسرے کے آگے زانوے شاگردی تہ نہیں کیا - جو کچھ سیکھا اپنے باپ سے سیکھا - اس فن کے تمام اسرار و رموز بھی اسکے باپ شیخ مبارک ہی نے اسیر کھولے - شیخ مبارک اگرچہ خود شاعر نہ تھا لیکن ہمہ دان فاضل تھا اسلیے بیٹے کا کلام دیکھتا - انہیں زبان اور فصاحت و بلاغت کی چاشنی پیدا کرتا - رموز سخن اور نکتہ نکتہ سے بیٹے کو آگاہ کرتا یہانتک کہ فیضی ایکدن سپہر شاعری پر ہلال بنکر طلوع ہوا اور بدر کامل بن کر چمکا -

فن طب

علاوہ ان علوم و فنون کے فیضی نے علم طب کو بھی حاصل کیا - اور اس میں بھی پوری مہارت اور دستگاہ پیدا کی مگر اس سے بجز خدمت بندگان الٰہی اور کوئی فائدہ نہ اُٹھایا - علاج کرتا تھا لیکن کسی سے اجرت نہ لیتا تھا - بلکہ بسا اوقات جب اسیر

تنگی رزق نہوتی تو دوائیں بھی مریضوں کو اپنے ہی پاس سے دیتا۔ رفتہ رفتہ جب اوج و اقبال نے مُنہ دکھایا اور افلاس و ادبار نے ہمیشہ کے لیے پیٹھ پھیری تو رفاہ عام کی غرض سے ایک شفاخانہ بھی کھولدیا۔

شیخ مبارک کے فضل و کمال نے اس کے بہت سے حاسد بھی پیدا کر دیے۔ جو ہر موقع پر تکلیفیں پہنچاتے رہتے تھے۔ اور ان حاسدین میں مخدوم الملک ملا عبد اللہ سلطانپوری اور شیخ عبد النبی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ عوام میں بھی با اثر تھے۔ اور ان ہی کے ہاتھوں میں سلطنت کی باگ بھی تھی۔ شیخ مبارک اپنے استغناء دلی اور علم و فضل کے آگے انکو کب خاطر میں لاتے تھے۔ شدہ شدہ کچھ ایسے اسباب پیدا ہوگئے کہ یہ لوگ شیخ مبارک کی ایذا رسانی کے درپے ہوے۔ کبھی تشیع کا الزام لگایا، کبھی فرقہ مہدوی کا پیرو مشہور کیا غرض آئے دن ایک نہ ایک نئی مصیبت شیخ مبارک کے سر پر لاتے رہتے تھے۔

فیضی کی شہرت اور دربار اکبری میں طلبی

یہانتک کہ جب فیضی کے عطر سخن کی شمیم انگیزی فضاء عالم میں پھیلکر دربار اکبری میں پہنچی۔ تو فیضی کی شاعری اور اسکے فضل و کمال نے اکبر سے سفارش کی۔ اور شہنشاہ اکبر نے فیضی کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ بدخواہ و حاسدوں سے دو قدم بھی نہیں رہا گیا اور اس رحمت و عنایت کی طلب کو قہر و عتاب کے رنگ میں رنگ دیا۔ اور حاکم آگرہ کو اسطرح لکھا کہ شیخ مبارک کے لڑکے فیضی کو وہ جہاں اور جس حال میں پاؤ سوار کر کے ساتھ دربار میں بھیجدو۔ کچھ بات ایسی گول تھی کہ جتنے لوگوں نے اور ہی کچھ سمجھا۔ دشمنوں نے ان سپاہیوں کو یہ پٹی پڑھائی کہ شیخ مبارک بیٹے کو چھپا دے گا۔ اور آپ بہت حیلے حوالے کرے گا۔ ڈرا کے دھمکا کے سختگیری سے اپنا کام نکالنا۔ ادھر اتفاق یہ کہ واقعتاً فیضی گھر میں نہ تھا۔ باغ کی سیر کو گیا ہوا تھا۔ ترک سپاہیوں نے جب بہت شور و غل مچایا اور شیخ مبارک کو خبر ہوئی تو انھوں نے صاف طور پر حقیقت حال کہا

وہ ظاہر کردیا۔ سپاہیوں کو دشمنوں کی بات کا یقین آگیا کہ شیخ بہانہ کرتا ہے اور زیادہ شور و غل مچانا شروع کیا۔ قریب تھا کہ کوئی فتنہ پیدا کردیں حسن اتفاق سے فیضی آپہنچا۔ حال معلوم کرنے پر سفر کی تیاریاں شروع کیں۔ لیکن افلاس و غربت کے مارے آمدنی کا رستہ بند تھا۔ سامان سفر کس طرح مہیا ہو۔ خیر عقیدتمندوں اور شیخ مبارک کے شاگردوں کے ذریعہ یہ مرحلہ بھی طے ہوگیا۔ اور رات ہی کو فیضی گھر سے روانہ ہوگیا

فیضی دربار اکبری میں

فیضی تو گھر سے روانہ ہوگیا لیکن ادھر گھر کے تمام لوگ رنج و الم کے دریا میں ہاتھ پاؤں مارنے لگے اور نہایت اضطراب کے ساتھ اس خبر کو سننے کے لیے پریشان تھے کہ بادشاہ نے کیا سلوک کیا۔ چند روز کے بعد یہ خبر آئی کہ شہنشاہ جہاں نے غریب نوازی کی اور اپنے رحم و کرم کے سایہ میں جگہ دی۔

فیضی جب اکبر کے پاس پہنچا تو اکبر ایک ایسے کمرہ کے اندر بیٹھا تھا جسکے گرد جا لیدار کٹہرا لگا تھا۔ فیضی جب حاضر کیا گیا تو اس سے باہر کھڑا تھا۔ اسوقت فیضی نے بادشاہ سے مخاطب ہوکر برجستہ اور فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی۔

پادشاہا درون پنجرہ ام   از سر لطف خود مرا جا دہ
زانکہ من طوطی شکر خاہم   جائے طوطی درون پنجرہ بہ

اکبر اس کے اس حسن استعداد اور برجستہ گوئی سے بہت محظوظ ہوا۔ اور لطف و عنایت کے ساتھ اندر آنے کی اجازت دی۔ (باقی دارد)

ابوسعید ندوی اشرفپوری

ہم سب کے لیے بڑی خوشی کی بات ہوتی اگر ہم بہتری کی اتنی ہی زیادہ قدر کرتے جتنی بدتری کی مذمت کرتے ہیں۔" "مسودتی"

اعراب جاہلیت کا سالانہ مشاعرہ

(بسلسلہ اشاعت سابق)

مَیں نے "تمدّن" کے گذشتہ نمبر سے امرئ القیس کے کلام کو پیش کرنا شروع کیا ہے جی تو یہی چاہتا ہے کہ اُسکے پورے قصیدہ کی تنقید ناظرین تمدن کی خدمت میں پیش کروں اور اسکے تمام صنائع کلام اور خوش مذاقی اور بد مذاقی پر تنقیدی حیثیت سے گہری نظر ڈالوں لیکن اول تو اپنی عدیم الفرصتی او مشاغل تعلیم دوسرے مضمون کی طوالت کا خیال مانع ہے لہذا اسکے کلام سے وہ مخصوص مقامات پیش کرتا ہوں جو صنائع شاعری میں کسی صنف سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ مذاق شاعری اور مذاق عشق میں حد مشترک ہیں اس قسم کا کلام پیش کرنے سے ایک یہ بھی غرض ہے کہ ہر طبقہ اور ہر مذاق کے حضرات بقدر ذوق امرئ القیس کے کلام سے حظ اُٹھا سکیں میں امید کرتا ہوں کہ مجکو ناظرین "تمدن" امرئ القیس کے کلام کو سلسلہ کے ساتھ پیش کرنے سے معاف فرمائیں گے۔

معشوق کی تعریف اور اُس کا سراپا

مُهَفْهَفَةٌ بَيْضَاءُ غَيْرُ مُفَاضَةٍ　　تَرَائِبُهَا مَصْقُولَةٌ كَالسَّجَنْجَلِ

یعنی میری معشوقہ نازک کمر اور صبیح رنگ ہے اور اُسکا شکم چپیدہ ہے یعنی حدّ اعتدال حُسن سے گرا ہوا نہیں ہے اور سینہ مثل آئینہ کے چمکدار و درخشاں ہے یہ تمام اوصاف جسمانی جو اس شعر میں امرئ القیس نے دکھائے ہیں اُنمیں کوئی شک نہیں کہ امرئ القیس کی حُسن پرستی اور نظر انتخاب کو ثابت کر رہے ہیں اور اس شعر سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اہل عرب کی طرح عرب سانولے رنگ کو قابل تعریف نہیں سمجھتے تھے۔

كَبِكْرِ الْمُقَانَاةِ الْبَيَاضِ بِصُفْرَةٍ ‏ غَذَاهَا نَمِيْرُ الْمَاءِ غَيْرُ مُحَلَّلِ

اس شعر میں امرئ القیس معشوق کے رنگ کی تعریف کرتا ہے اور مختلف چیزوں سے تشبیہ دیتا ہے۔ یعنی میری معشوقہ کا رنگ مثل اول بیضۂ شترمرغ کے ہے کہ جسکی سفیدی میں مناسب زردی ملی ہوی ہے یا مثل ایک دانۂ صدف کے ہے جسکی سفیدی زردی کی جھلک لیے ہوتی ہے جسکی نشو و نما ایسے صاف اور خالص پانی سے ہوی ہے جس پانی تک کسی کا ہاتھ نہیں پہنچا ہے یہ بات عادات عرب سے ہے کہ عورتوں کی تشبیہ ایسے ہی چیزوں سے دیتے ہیں اُنکے مذاق میں زردی مائل سفیدی حسن ہے۔ میرا خیال ہے غالباً اس رنگ سے امرئ القیس کی مراد گندمی رنگ ہے یہ رنگ ہم لوگوں کے مذاق میں بھی قابل تعریف ہے۔

وَفَرْعٍ يَزِيْنُ الْمَتْنَ اَسْوَدَ فَاحِمٍ ‏ اَثِيْثٍ كَقِنْوِ النَّخْلَةِ الْمُتَعَثْكِلِ

غَدَائِرُهَا مُسْتَشْزِرَاتٌ اِلَى الْعُلٰى ‏ تَضِلُّ الْعِقَاصُ فِيْ مُثَنًّى وَمُرْسَلِ

یہ دونوں شعر معشوقہ کے بالوں کی تعریف میں کہے ہیں یعنی اُسکے لانبے لانبے سیاہ اور بہت سیاہ بال جو زینت دیتے ہیں اُسکی پشت کو اور وہ نہایت کثرت سے گُتھے ہوے اور پیچیدہ یعنی گھونگر والے ہیں اور پیچیدگی میں مثل بار آور درخت کے خوشبودار گُتھے ہوے خوشوں کے ہیں جو بسبب اپنی کثرت کے ایک دوسرے میں در آتے ہیں اس تشبیہ کی نیچرل سادگی میں نہایت معنی خیز جذبات مضمر ہیں جو اسکے علاوہ اور تشبیہ میں پیدا ہی نہیں ہو سکتے جن حضرات کو مناظر فطرت اور نیچرل حسیات سے دلچسپی ہے انکو اس شعر میں نسبتاً زائد لطف ملے گا۔ دوسرا شعر بھی بالوں کی تعریف میں ہے کہتا ہے کہ میری معشوقہ کے سر پر اس کثرت سے بال ہیں کہ کچھ حصہ اُنکا ریشمی اور چکدار ڈوروں سے بالا ئے سر گوندھکر باندھ دیا گیا ہے اور کچھ جوڑے کی طرح باندھے گئے ہیں لیکن یہ دونوں حصے بالوں کے اُسکی گندھی ہوی چوٹیوں اور کھلے ہوے بالوں سے

اس طرح چھپ گئے ہیں کہ بالکل نہیں معلوم ہوتے۔ دیکھنے کے قابل اس مقام پر یہ بات ہے کہ جوڑا اور وہ بھی گھنے ہوئے بالوں کا جوڑا ایک نمایاں چیز ہے اسکا چھپنا بالوں سے اور وہ بھی غیر محسوس طریقہ پر بالوں کی اُس کثرت کو بتلا رہا ہے کہ جو غیر معمولی شان رکھتے ہیں اس شعر سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ عرب کی عورتیں اپنے بالوں کی آرایش اُس عہد میں اس طریقہ سے کرتی تھیں اور یہی غالباً اُس زمانے میں سب سے بہتر طریقہ آرائش تھا جسکو ہمارے حُسن پرست امرئ القیس نے اپنی معشوقہ کے لیے منتخب کیا ہے واقعی خوش قسمت تھا اور بہت خوش قسمت تھا امرئ القیس اپنی حُسن پرستی اور شاعری کے لحاظ سے جسکے عشق اور شاعرانہ جذبات کی نشو و نما ایسے خطّہ میں ہوئی جسکے ذرّہ ذرّہ میں حُسن و عشق کا ہیولا مضمر تھا اور صرف یہی نہ تھا بلکہ حُسن کو اپنے تمام اثرات کا احساس اور پورا احساس بھی ہوتا تھا۔

وَكَشْحٍ لَطِيفٍ كَالْجَدِيلِ مُخَصَّرٍ وَسَاقٍ كَأُنْبُوبِ السَّقِيِّ الْمُذَلَّلِ

اس شعر میں معشوق کی کمر اور پنڈلیوں کی تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ کمر اسکی نزاکت اور نرمی میں مثل مہار ناقہ کے ہے جو نرم اور لچکدار ہوتی ہے اور پنڈلی اُسکی مثل گھمو کے ہے جو اپنی شادابی اور تر و تازگی اور صفائی کی وجہ سے جھکی رہتی ہے یا مثل اُس بندنیئے کے ہے جسکو پانی شاداب و نرم کرتا رہتا ہے ان تشبیہوں سے اعراب کے طرز معاشرت اور زندگی کا پتا چلتا ہے جیسا طرز معاشرت تھا ویسے ہی خیالات اور تصرفات شاعری بھی ہیں لیکن ہر شعر سے ایک نیچرل انداز تخیل ٹپک رہا ہے اور یہی اُسمیں دیکھنے کے قابل بات ہے

وَتُضْحِي فَتِيتُ الْمِسْكِ فَوْقَ فِرَاشِهَا نَؤُومُ الضُّحَى لَمْ تَنْتَطِقْ عَنْ تَفَضُّلِ

اس شعر میں معشوق کی خوابگاہ ناز اور حسن کے مدارج کمال دکھاتا ہے کہتا ہے کہ جب صبح کرتی ہے محبوبہ میری اور خواب ناز سے بیدار ہوتی ہے تو بستر خواب پر مشک کے ریزے

پائے جاتے ہیں جو اُسکے سونے کی حالت میں اُسکے جسم سے پیدا ہو کر بستر کو معطر کرتے ہیں اور جب وہ جامۂ شبخوابی پہن لیتی ہے تو اُسکے بعد کمر کسنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے اسکا حاصل یہ ہے کہ کمر کس کے سونا یہ اُن لوگوں کی شان سے ہے کہ جنکو صبح ہوتے ہی فرائض و کام انجام دینا ہوتے ہیں میری معشوقہ کو اسکی کیا ضرورت ہے اس شعر میں گویا عنیزہ کی شان امارت بھی ظاہر کرنا مقصود ہے۔

تُضِیْئُ الظَّلَامَ بِالْعِشَآءِ کَاَنَّھَا مَنَارَۃُ مُمْسٰی رَاھِبٍ مُتَبَتِّلِ

اس شعر میں معشوقہ کے حُسنِ عالم سوز کو ایک ایسی پیاری تشبیہ کے ساتھ ادا کرتا ہے کہ تو بہ معاذ اللہ رے سادگی اور اللہ رے جذب کوئی ایسا ہی تیغ کا کلیجے والا ہو گا یا کیفیات حسن و عشق سے بالکل بیگانہ جسمیں امرئ القیس کی اس تخئیل سے حرکت وجدانی نہ پیدا ہو جائے لکھتا ہے کہ میری عنیزہ کے چہرہ کی روشنی یعنی اُسکی برق حُسن تاریکی کو اسطرح روشن کر دیتی ہے گویا کہ وہ راہب خدا رسیدہ یعنی تارک الدنیا لوگوں کی شمع ہے یعنی جس طرح راہبوں کا چراغ شام عام تاریکی میں بھولے بھٹکے ہوئے مسافروں کو اپنی تیز روشنی سے فائدہ پہنچاتا ہے اُسی طرح عالم کی روشنی کے لیے میری معشوقہ کی شمع جمال ہے اول تو عنیزہ کی تشبیہ شمع سے یہی بجائے خود ایک پیاری اور نازک تشبیہ ہے پھر اُسپر غار رسیدہ لوگوں کی قید نے معنوی خوبیوں میں اور چار چاند لگا دیے میرے خیال میں اسمیں کوئی شک نہیں کہ یہ شعر داخلی اور خارجی پہلوؤں سے نہایت دلکش جواہرات کا مجموعہ ہے۔

اَلَا رُبَّ خَصْمٍ فِیْکِ اَلْوٰی رَدَدْتُہٗ نَصِیْحٍ عَلٰی تَعْذَالِہٖ غَیْرِ مُؤْتَلِ

اب میں بعض وہ اشعار اس مقام پر لکھتا ہوں جسمیں امرئ القیس نے اپنی معشوقہ عنیزہ سے مخاطب ہو کر اظہار وفا کیا ہے اور شبہائے فراق کی گذری ہوئی مصیبتیں اور شب فراق سے عالم بیخودی میں باتیں بیان کی ہیں کس قدر خوش قسمت ہے وہ عاشق جسکو

فراق کی تکلیفوں کے اظہار کا موقع معشوق سے نصیب ہو کہتا ہے امرء القیس جس کا حاصل یہ ہے کہ بہت سے ناصح جنھوں نے سختی کے ساتھ تیری محبت سے باز رکھنا چاہا گو میری بہتری کے خیال سے لیکن میں نے انکو واپس کر دیا اور کچھ بھی انکی نصیحتوں کا اثر نہیں لیا یعنی میرے قدم تیری محبت میں نہ ڈگمگانا تھے نہ ڈگمگائے اور دنیا کی کوئی قوت تیری محبت پر غالب نہ آ سکی میرے خیال میں یہی وہ سچے جذبات ہیں جو محبت بھرے دل کی جان اور حسن و عشق دونوں کے لیے سرمایۂ ناز ہیں۔

وَلَیْلٍ کَمَوْجِ الْبَحْرِ اَرْخیٰ سُدُوْلَهٗ عَلَیَّ بِاَنْوَاعِ الْهُمُوْمِ وَیَبْتَلِی

اور بہت سی فراق کی راتیں ہیں کہ جنھوں نے مثل سمندر کی موجوں کے قسم قسم کے اندوہ و صدمات کے ساتھ اپنی تاریک پوششوں کو میرے اوپر ڈال دیا کہ تیری محبت میں میرا امتحان دکھالیں اور آزمائیں میری قوت صبر و شکیبائی کو۔

فَقُلْتُ لَهٗ لَمَّا تَمَطّیٰ بِصُلْبِهٖ وَاَرْدَفَ اَعْجَازًا وَنَاءَ بِکَلْکَلِ

پس کہا میں نے اس شب فراق سے جب کہ وہ رات ڈہل کے بڑھی اور اسکے پچھلے یعنی آخری ساعتیں ایک دوسرے کے بعد آنے لگیں اور ان ساعتوں کا سلسلہ باوجود حصہ آغاز ختم ہو جانے کے نہ ٹوٹا۔

اَلَا اَیُّهَا اللَّیْلُ الطَّوِیْلُ اَلَا انْجَلِی بِصُبْحٍ وَمَا الْاِصْبَاحُ مِنْكَ بِاَمْثَلِ

یعنی اے بڑھتی ہوئی اور طولانی شب فراق اپنی تاریکی کو نور سے بدل دے تاکہ مجھکو تجھ سے رہائی ہو۔

فَیَا لَكَ مِنْ لَیْلٍ کَاَنَّ نُجُوْمَهٗ بِاَمْرَاسِ کَتَّانٍ اِلیٰ صُمِّ جَنْدَلِ

یعنی واسے ہو تجھپر اے شب فراق تو عجب رات ہے گویا کہ تیرے ستارے رسن ہاے کتان سے بھاری پتھروں میں بندھے ہوسے ہیں کہ اپنی جگہ سے جنبش ہی نہیں کرتے دیکھو ایک فراق کے مارے ہوسے دل کے جذبات حسرت زدہ زبان سے یوں ادا ہوے ہیں

آتش عشق کے پھونکے ہوئے عالم بیخودی میں یوں مناظر قدرت کو مخاطب کر کے بھڑکے ہوئے شعلوں پر آب پاشی کرتے ہیں مضطرب دل کو عالم بیکسی میں تسکین دینے کا یہ طریقہ ہے اُمنڈتے ہوئے جذبات محبّت کا آتش غم سے جب یوں انقلاب ہوتا ہے تو اثر اپنے آغوش میں لے کر زمین کے طبقات اور آسمان کے پردوں میں آگ لگا دیتا ہے فضا میں کرۂ عشق سے جب اسے سیمابی ذرات اُڑ اُڑ کر پہنچتے ہیں اور متوجہ کرتے ہیں تو دلوں پر بجلیاں ٹوٹتی ہیں اور پتھر کے کلیجے پانی ہوتے ہیں ایسے فراق نصیبوں کو پھر وصال معشوق کیونکر نصیب ہو۔

حسرت ہے تیری زندگی پر اے امرؤ القیس کاش ہماری بھی نشوونما اُسی خاک بلا انگیز سے ہوتی جس سے تو تھا جیسا میرا جی چاہتا ہے ویسی تنقید اس آخری شعر کی نہیں کرسکتا۔ اس شعر میں امرؤ القیس نے جذبات نفسانی کو دکھایا ہے درحقیقت جذبات کا تعلق حسیات نفسانی سے زائد ہے۔ اسوقت مجکو ایک اُردو کے زبردست شاعر کا اسی مضمون کا ایک شعر یاد آگیا ہے جسکو ناظرین "تمدن" کی دلچسپی کے لیے پیش کرتا ہوں دیکھو جلال مرحوم اسی خیال کو کس فلسفیانہ انداز سے ادا کرتے ہیں ؎

نہ جائے گی مرے گھر سے نہ جائیگی شب غم — یہ کہتا ہوں کہ گردش ہی آسماں میں نہیں

(باقی آئندہ)

آشفتہ لکھنوی

ضروری گذارش

"تمدن" کا طالب جن حضرات کی خدمت میں نمونتاً یا کسی معزز دوست کی تحریک سے پہنچے براہ کرم فوراً اپنے ارادہ خریداری سے مطلع فرمائیں ورنہ خاموشی رضامندی سمجھی جائے گی اور دوسرے ماہ میں اُنکا نام درج رجسٹر کرکے تیسرے ماہ کا پرچہ بذریعہ وی۔ پی بھیجا جائیگا جسکا وصول کرنا اُن کا قومی اور اخلاقی فرض ہوگا۔

منیجر

غزلیات

جناب نواب عسکری مرزا خانصاحب عرف بن صاحب بلیغ لکھنوی

لاش نکلی اسطرح گھر سے ترے ناکام کی — جسنے دیکھا رو دیا کچھ حد نہ تھی کہرام کی
غش وہ آتا ہے کہ دنیا کی نہیں رہتی خبر — کچھ عجب تاثیر ہوئی ہے ترے پیغام کی
دوستی کرتے ہی تم سے اک قیامت ہوگئی — ساری دنیا بنگئی دشمن ہمارے نام کی
نفع اتنا میکدے سے شیخ کو حاصل ہوا — لیگئے تصویر آنکھوں میں چھلکتے جام کی
گر خدا چاہے گا خلوت گاہ بھی دیکھینگے ہم — ابتدا تو ہوگئی ہے نامہ و پیغام کی
یا الٰہی ہمکو دیوانہ کہیں سب حشر تک — مدتوں سے فکر ہے اپنے بقائے نام کی
صبر کرتے کرتے آخر ہوگیا مجھکو جنوں — اور باتیں ڈھونڈ لے میرے لیے الزام کی
کل جو ہونا ہے پھر اُس سے آج فرصت کیوں نہو — زندہ رہجائیں مریں کس کو خبر انجام کی

عمر بھر قسمت میں اب رونا ہی رونا ہے بلیغ
اُٹھ گئیں دنیا سے سب باتیں بہت آرام کی

حضرت عزیز لکھنوی

مرے پُر زور نالو ضبط کی قوت دکھا دینا — نہ آئیں وہ تو اک دن آگ اس گھر میں لگا دینا
مریض ہجر کو تم زہر دینا یا دوا دینا — گریباں سے دم بھر چارہ سازونکو ہٹا دینا
بھلا پھر کر سکینگے چارہ گر کیا سد مل اُسکو — تری تفریح ہو جس دن تو زخموں کا ہوا دینا
تمہارا فرض ہے اپنی سی کوشش چاہیے تمکو — مگر آساں نہیں ہے میری ہستی کا مٹا دینا
شگفتہ دل اک ہو جاتا تربت میں جان آئیگی مجھ میں — ذرا لے جانے والے قبر پر پھر مسکرا دینا
یہاں وہ وقت ہے اب دل کی ... گھٹتی جاتی ہے — تمھیں تو کھیل ہے اک باتوں باتوں میں رلا دینا

کوئی تدبیر بن پڑتی نہیں کیا ہونیوالا ہے　　مجھے آسان ہوتا کاش انھیں دل سے بھلا دینا

مری میت پہ کس دعوی سے وہ کہتے ہوے آئے　　ہٹا دینا ذرا ان رونیوالوں کو ہٹا دینا

اٹھینگی آندھیاں غم کی جو ذرہ بھی رہا باقی　　زمین دشت غربت خاک میری سب اڑا دینا

کسی کو دیکھکر ایسا نہو میں پھر بہک جاؤں　　مجھے روز جزا اک دو مراد دل اے خدا دینا

تمھارے سامنے اک دفتر راز محبت ہے　　بد شوخی کسی بیمار غم کا لب ہلا دینا

یہ کہکر قبر پر پھر یاد اپنی کر گئے تازہ　　ارے اے مرنے والے اب مجھے دلسے بھلا دینا

یہ مانا قلب کی جنبش نظام زندگانی ہے　　ٹھہر جائے مرا دل چارہ گر ایسی دوا دینا

بہت گہری نظر ہے عشق پر حسن ستمگر کی　　خداوندا مجھے جو درد دینا لا دوا دینا

عزیز اک دفتر پند و نصیحت کھلنے والا ہے
بڑھے گر اختلاج دل تو ناصح کو دعا دینا

جناب نواب سعید الدین احمد خاں صاحب طالب رئیس دہلوی

یہ دل کسی نہ کسی وجہ داغ دار رہا　　ہزار شکر کہ یہ باغ پُر بہار رہا

صبا کی ضد سے جو اُٹھتا مرا غبار رہا　　بڑے عروج پہ بارہ میں خاکسار رہا

نہ لالہ زار رہا اور نہ سبزہ زار رہا　　کہ سیل اشک سدا صرف جوئے بار رہا

پلائی اتنی سبھوں کو چھلکا دیا ساقی　　رہا تو تشنہ مے مجھسا بادہ خوار رہا

وفا شعار فروتن جہاں سے مستغنی　　مدام شیوۂ مردان روزگار رہا

شکارگاہ میں آیا ہے گلچلا یہ کون　　کہ زخم سے نہیں خالی کوئی شکار رہا

تمام عمر کا ہے درد سر یہ الفت　　یہ وہ نہیں کہ گھڑی دو گھڑی خمار رہا

جفائیں آپ کی مانا کہ بیحساب رہیں　　مگر ہماری وفاؤں کا کیا شمار رہا

خودی میں خود نہ رہے جب کہ ہم خدا شاہد　　نہ کوئی غیر رہا پھر نہ کوئی یار رہا

ہمارے گریہ نے ٹھنڈا کیا کسی کا دل　　ذرا نہ سنگ میں باقی کوئی شرار رہا

نگاہ پھر گئے جو تم دیکھتے رہے دل کو — وہ میفروش رہے اور یہ میگسار رہا
درود لاکھوں کروروں سلام ہوں اُس پر — جو عفو امت عاصی کا خواستگار رہا
چلا ہے راستہ کترا کے دیکھ تو زاہد — وہ میکدے سے کوئی تجھکو ہے پکار رہا

نہ پھنستا دام محبت میں کب تلک طالب
وہ سادہ لوح بہت دن تو ہوشیار رہا

حضرت محشر لکھنوی

دوست پہ حال اپنا عیاں کر دیا — دل میں جو تھا صاف بیان کر دیا
مرگیا دل دفن میں کیا اہتمام — تھوڑی سی مٹی میں نہاں کر دیا
دیکھ سکے کون جمال حبیب — جس نے کہ روشن یہ جہاں کر دیا
رہ چکے خاموش بس اے دردِ ہجر — کر دیا اب قصد فغاں کر دیا
مرکے بھی اس درد کی پائی نہ حد — جسنے مجھے محو فغاں کر دیا
اپنے اس ارمان پہ میں خود نثار — جس نے تمھیں محو فغاں کر دیا
جستجوے دوست میں ہم مرگئے — شوق نے بے نام و نشاں کر دیا
اس پہ خفا مجھ سے خدائی ہوی — راز محبت کو عیاں کر دیا

دلبر ہے محشر یہ کرم عشق کا
واقف اسرار نہاں کر دیا

حضرت ثاقب قزلباش لکھنوی

تمام عمر کی غفلت کے بعد خواب آیا — اُٹھا جو پردۂ ہستی مجھے حجاب آیا
اجل نصیب تھا شام وصال خواب آیا — وہ بے حجاب ہوے تو مجھے حجاب آیا
بلا ہے شام جدائی سے خوش نہو اے دل — سنبھل کہ عمر کی دنیا میں انقلاب آیا
بڑھاے حوصلے دریا دلی نے ساقی کے — ذرا سے جام میں سو بار آفتاب آیا

زمانے والوں کو پہچاننے دیا نہ کبھی
بدل بدل کے لباس اپنے انقلاب آیا

کوئی صدا نہیں آتی کہ کون ہے کیا ہے
کہاں بھٹک کے دلِ خانماں خراب آیا

سوائے یاس نہ کچھ گنبدِ فلک سے ملا
صدا بھی دی تو پلٹ کر وہی جواب آیا

حریفِ مے نہیں سمجھا تو کیوں مری جانب
لہو کے گھونٹ پیئے ساغرِ شراب آیا

سنائیں کیا تمہیں نیرنگِ عشق کا قصہ
تمام عمر نہ آنکھیں کھلیں نہ خواب آیا

ہٹے نہ اپنی طبیعت سے حسن و عشق کبھی
ہزار بار زمانے میں انقلاب آیا

کھٹک وہ دل میں ہے پیدا جو آج تک نہ ہوئی
سمجھ رہا ہوں کہ طفلی گئی شباب آیا

اگر وہ آئیں مری قبر پر تو میں پوچھوں
مجھے مٹا کے کبھی پھر بھی انقلاب آیا

کفن بچھا دیا ثاقب صنم پرستی نے
خدا کے سامنے جاتے ہوئے حجاب آیا

حضرت آشفتہ لکھنوی

مری عمرِ رواں منجدھار تک پہنچے گی مشکل سے
یہ کشتی ہو کے طوفانی چلی ہے اپنے ساحل سے

بھرے آتے ہیں آنسو کیا کروں مجبور ہوں دل سے
شریکِ بزم ہوں لیکن الگ بیٹھا ہوں محفل سے

زمیں مشکل سے سنبھلی آسماں سنبھلا ہے مشکل سے
خداوندا یہ کس نے آہ کھینچی دکھ بھرے دل سے

مرتب ہو رہی ہے اک نئی تاریخ دنیا کی
مرے اجڑے ہوئے گھر سے مری ویران منزل سے

ذرا سی ٹیس اس پھوڑے میں لگ جانا قیامت ہے
ہزاروں زخم اور ناسور بہ نکلے مرے دل سے

رگِ جاں اب جہاں تک ہو سکے نرمی مناسب ہے
ندامت سخت جانی کی رہی جاتی ہے قاتل سے

بجھا دو شمعِ تربت کھول دو یا اپنے بالوں کو
کسی کی منتظر آنکھوں میں نیند آئیگی مشکل سے

بنے جاتی ہے آہستہ مجھے راحت طلب ہستی
خدا معلوم کتنا فاصلہ باقی ہے منزل سے

ذرا تم بھی تو دیکھو شانِ آزادی اسیروں کی
نکلی جا رہی ہیں ہڈیاں طوق و سلاسل سے

دلِ بیمار کی حالت پہ آتا ہے مجھے رونا
سمجھتا ہوں کہ یہ بیمار اب سنبھلے گا مشکل سے

نہ پوچھو تم نہ پوچھو اُف میں دیوانہ نہ ہو جاؤں ہوا کرتی ہیں تنہائی میں کیا باتیں مرے دل سے
اسے مرنا تو تھا مرتا مگر یہ کرب مٹ جاتا تمہیں اس وقت میں اُٹھنا نہ تھا بالین بسمل سے
انھیں ہاتھوں سے خنجر جنہیں تھا آپ دل سنبھالے نگاہ یاس میری کہہ دیا کیا تونے قاتل سے
انھیں ٹوٹی ہوئی قبروں میں سامان قیامت ہے کبھی محشر بپا ہوگا اسی خاموش محفل سے
خداوندا زمانے بھر کا جس میں ساز و سامان تھا دھواں تھوڑا سا دم واپسیں نکلا ہے اُس دل سے

یہ کیسی رہگذر تھی عالم ہستی کی آشفتہ
مجھے ہاتھوں ہی ہاتھوں لے لیا منزل نے منزل سے

حضرت خلیق دہلوی

ساقی بھر جام لال شربت کے دیکھ بادل اُٹھے وہ رحمت کے
کچھ پری کے نہ حور جنت کے ہم تو عاشق ہیں آدمیت کے
زر کے طالب ہیں اور نہ صورت کے ہم ہیں بھوکے فقط محبت کے
حشر کا وعدہ کر گئے وہ تو دن گنا کیجیے قیامت کے
ایک دو تو ہمیں دکھا دیجیے چشم بد دور اپنی صورت کے
جنکو بھولا سمجھتے تھے پہلے اب تو پرکالے ہیں وہ آفت کے
دل ناداں کے واسطے یہ بت کیا کھلونے بنے ہیں قدرت کے
دو قدم چل کے دیکھیے گا ہوش اُڑ جائینگے قیامت کے
اپنی صورت پہ وہ بھی عاشق ہیں صدقے اللہ تیری قدرت کے
حضرت دل کا دم غنیمت ہے یہ بھی اچھے ہیں اپنی عادت کے
آب خنجر میں یہ مزا پایا پی لیے گھونٹ جیسے شربت کے
میری تنہائی میں رفیق رہا ہم ہیں ممنون درد فرقت کے
بیکسی ہی مزار عاشق پہ آنسو پونچھے گی شمع تربت کے
خانۂ دل میں آج کل اپنے دور دورے ہیں درد فرقت کے

سب ہیں خُلق خلیق سے واقف
یاد ہیں ڈھنگ اسکو ملت کے

تمدن

فن تاریخ

(۱)

تاریخ کی حقیقت

موجودہ زمانے میں فن تاریخ نے باعتبار اپنے اعلیٰ مقصد اور شاندار نتائج کے جو غیر معمولی منزلت مہذب و متمدن قوموں میں پیدا کر لی ہے اس بنا پر یہ موضوع نہایت طویل بحث کا محتاج ہے لیکن قلت وقت، کثرت مشاغل اور ہجوم افکار مجھے زیادہ شرح و بسط کا موقع نہیں دیتے اسلیے یہ مختصر مضمون اگرچہ تاریخ کی بیشمار خوبیوں اور نہایت دلچسپ مسائل کے ذکر کے لیے ناکافی ہوگا تاہم اسکی اہمیت و عظمت ایک حد تک معلوم ہو سکتی ہے۔

تاریخ کی حقیقت سمجھنے کے لیے پہلے ہم کو یہ معلوم کر لینا چاہیے کہ عالم میں جسقدر واقعات روزانہ پیش آتے ہیں اُنکی نوعیت مختلف ہوتی ہے اور زمانے کے تغیر کے ساتھ ساتھ اُنکی

ہزاروں تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں، آج جو واقعہ ظاہر ہوتا ہے پانچہزار برس پیشتر دوسرے رنگ میں اسکا ظہور ہوا تھا اس لحاظ سے انسان کے تمدّن، معاشرت، عادات اور مذہب کی مختلف قیدوں کے ساتھ اُسکے گذشتہ حالات کی تحقیق کیجائے توچند دَور نکلینگے اور ہر دور کی خصوصیت دوسرے سے ممتاز حیثیت میں نظر آئیگی، مثلاً

انسان کا پہلا دور وہ تھا جب وہ جنگلی پھل قدرتی میوے، دریاؤں کی مچھلیاں، آبشار اور چشموں کے پانی پر گذارا کرتا وحشی جانوروں کی طرح پہاڑ کی کھوہوں میں کے غاروں میں دھوپ کی شدت، جاڑوں کی سردی، برسات کے موسلادھار پانی سے اپنے آپ کو بچایا کرتا، دوسرا دور وہ آیا جسمیں اُس نے جانوروں کو سدھانا اور اُن سے اپنی ضرورتوں میں کام لینا سیکھا اُنکے گوشت کو اپنی غذا اور کھالوں کو اپنا لباس بنایا اور غوں غاں کے بجاے ٹوٹے پھوٹے چند الفاظ اپنے اظہار مطلب کے لیے سیکھے تیسرا دور وہ تھا جب اُس نے گلہ بانی شروع کی، رہنے کے لیے جھونپڑے بنائے، کھانا پکانے کے لیے آگ اور نمک کو تلاش کیا۔ اناج اُگانے کے لیے زراعت شروع کی، اسکے بعد جوں جوں نسل انسانی روے زمین میں پھیلتی گئی توں توں انسانی تمدن میں نئے باب کا اضافہ ہوتا گیا، غرض یہ تمام واقعات اور حالات تاریخ کا سرمایہ ہیں اور ان ہی مختلف رنگوں سے تاریخ کی عمارت میں گلکاریاں کی جاتی ہیں اسلیے اسکی تعریف مختصر لفظوں میں اس طرح کی جا سکتی ہے کہ "تاریخ وہ علم ہے جس سے گذشتہ لوگوں کے مختلف حالات کا پتہ لگایا جاسکے"

تاریخ کی ابتدا

(۲)

اسمیں شک نہیں دنیا میں نسل انسانی کا وجود ہزاروں برس سے ہے مگر ابتدائی زمانہ نہایت تاریک اور دشواریوں سے مملو ہے اور اسپر تاریخی حیثیت سے کچھ بھی

روشنی نہیں ڈالی جا سکتی، اس زمانے کے جو حالات بیان کیے جاتے ہیں اُنکی بنیاد محض ظن اور تخمین پر ہے، البتہ چند ہزار برس پیشتر کے حالات تاریخ کی روشنی میں لائے گئے ہیں انکا ماخذ زیادہ تر تورایت ہے۔ بہرحال اس فن کے ماہرین نے تاریخ کو تین دور میں تقسیم کیا ہے:

(۱) قرون اولی، یعنی ابتدائی چند صدیاں۔ یہ دور سنہ قبل مسیح سے شروع ہوکر سنہ ۵ء میں ختم ہو جاتا ہے۔

(۲) قرون وسطی، درمیانی چند صدیاں۔ یہ دور سنہ ۵ء سے سنہ ۱۵ء کے قریب قریب آخر تک شمار کیا جاتا ہے۔

(۳) قرون اخری، اس دور کی ابتدا سنہ ۱۵ء کے اختتام سے کچھ ہی پیشتر ہو جاتی ہے۔

اب ہم یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ تاریخ کی ابتدا کب اور کیونکر ہوی اور کس قوم نے تاریخ کو مدون کیا لیکن ناظرین کو یہ سنکر نہایت تعجب ہوگا کہ مصری، یونانی، کلدانی رومانی وغیرہ باوجودیکہ نہایت پُر عظمت وجبروت قومیں گذری ہیں اور انھوں نے عقلی علوم وفنون میں ایک حد تک خاصی ترقی حاصل کی تھی اس بنا پر قدرتاً یہ خیال دل میں پیدا ہوتا ہے کہ انکی کوشش اور علمی شغف کے سبب فن تاریخ بھی محروم نہوگا لیکن تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس نایاب گوہر سے بالکل تہیدست تھیں صرف یونانیوں کی بابت اتنا ثابت ہوتا ہے کہ اس قوم میں کچھ کچھ تاریخ کا رواج تھا، ہومر یونان کا نہایت فصیح اور مشہور شاعر گذرا ہے اسنے چند واقعات اپنے اشعار میں قلمبند کیے ہیں اسلیے بعضوں کی رائے ہے کہ تاریخ کی بنیاد اسی کے ہاتھ سے پڑی ہے اسکے بعد سنہ ۵ قبل مسیح میں ہیرودوٹس ایک نامی شخص گذرا اس نے بہت سے تاریخی واقعات جمع کیے اور تاریخ کی ایک کتاب لکھی جسکا ترجمہ مختلف زبانوں میں اب ہوگیا ہے، اس بیان سے معلوم ہوسکتا ہے کہ تاریخ کی ابتدا

یونانیوں کے زمانے میں ہوئی، مگر کوئی مستقل حیثیت اسکی قائم نہیں ہوئی تھی جب اسلام کا قدم دنیا میں آیا اس نے جس طرح اور دیگر علوم و فنون کا نہایت گرمجوشی سے خیر مقدم ادا کیا تاریخ بھی اس عزت سے محروم نہیں رہی اور اسی زمانے میں اسکی تدوین مکمل ہوئی اور اس نے مستقل حیثیت قائم کرلی ؂

(۳)

تاریخی واقعات کے ذرائع

تاریخی واقعات جن جن چیزوں سے معلوم کیے جاسکتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) عینی مشاہدہ اسکا یہ مطلب ہے کہ مورخ انھیں باتوں کو قلمبند کرے جنکو اسنے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو اگرچہ یہ قسم بہ نسبت تمام دوسری قسموں کے زیادہ موجب یقین ہے مگر اسمیں بھی یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ مورخ نے نتائج کے استنباط کرنے میں غلطیاں کی ہیں اور اصل واقع کی تہ تک نہیں پہنچ سکا ہے ؂

(۲) سماعی روایات، اس سے یہ غرض ہے کہ مورخ خود واقع میں موجود نہ تھا بلکہ دوسروں سے زبانی روایتیں سُنکر واقعات جمع کردیے ہیں ؂

(۳) قصائد اور عام اشعار، تاریخی سرمایہ بہم پہنچانے میں اشعار بہت بڑا ذریعہ بنے ہیں جس زمانے کے اشعار ہوں اس زمانے کے لوگوں کا عام مذاق، طبیعت کا رجحان، خیالات اور جذبات کا پورا پورا پتہ ان سے لگایا جاسکتا ہے ؂

(۴) دفاتر سلطانی، یعنی ملکی کاغذات جن سے یہ تحقیق ہوسکتی ہے کہ اس زمانہ میں سلطنت کے احکام کس قسم کے تھے رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے کیا کیا وسائل عمل میں لائے گئے بادشاہ اور حکام وقت کے استبداد اور عدل گستری کا حصہ اسمیں کسقدر شامل تھا۔

(۵) سکّے، منارے، عمارتیں اور دیگر آثار قدیمہ، ان چیزوں سے تاریخی پرانے اسرار معلومات

حاصل کرنے میں بہت زیادہ مدد ملی ہے قدیم منارے اور عمارتوں نے گذشتہ قوموں کی معاشرت، ذہنی قوت اور کارناموں کے معلوم کرنے کے لیے رہبر طریق کا کام دیا ہے، کیونکہ ایک مکان جو انجینیری کے اصول کے مطابق تعمیر کیا گیا ہو اور ایک وہ جو بالکل سادہ اور بغیر انجینیری کے اصول کے بنایا گیا ہو ان دونوں مکانوں میں علمی حیثیت سے جو فرق ہوگا وہی فرق انکے تعمیر کرنے والوں میں صاف نظر آئے گا۔"

(باقی آیندہ)

احمد اللہ

اک اور کرم بانیِ بیداد کیے جا
ٹھوکر سے مری قبر کو برباد کیے جا

سنتا ہوں کہ امید پہ قائم ہے زمانہ
صیاد معین مری میعاد کیے جا

رکنے کے نہیں فصلِ بہاری میں وحشی
تدبیر جو ہو تجھ سے وہ جلاد کیے جا

ہمت کا تقاضا ہے کہ اُف منھ سے نہ نکلے
اور درد یہ کہتا ہے کہ فریاد کیے جا

وہ نقش نہیں ہٹ کے جو اُبھروں میں کبھی پھر
تو کوششِ ناحق کی یہ بیداد کیے جا

پہچان لے پابندِ قفس ذوقِ طبیعت
صیاد کا دل بہلے گا فریاد کیے جا

الفت کی یہ ہے شان کہ دل اور جگر کو
قربانِ نگاہِ ستم ایجاد کیے جا

دم گھٹ گیا للہ قفس رکھدے چمن میں
اتنی سی تو خاطر مری صیاد کیے جا

ہر روز نیا رنگ وفا دیکھنا میرا
ہر روز نئے تو ستم ایجاد کیے جا

مانا کہ اثر دل پہ کسی کے نہیں ہوتا
فریاد مگر اے دلِ ناشاد کیے جا

معلوم ہے جو کچھ مری قسمت میں لکھا ہے
صیاد مگر تو مجھے آزاد کیے جا

دکھلا دے نیا رنگ وہ نالے دلِ غمگیں
وہ بھولتے جائیں تجھے تو یاد کیے جا

للہ الم ناک ہے کس درجہ یہ منظر
میں چپ رہوں اے چرخ تو بیداد کیے جا

مل جائیں گے یہ بت بھی تصدق میں اُسی کے
اے صدر خدا ہی کو تو بس یاد کیے جا

صدر الاسلام صدر

شخصی اور قومی حسیات

جس حالت اور جس کیفیت کا نام ہم زندگی رکھتے ہیں وہ سوائے اسکے اور کچھ نہیں کہ چند حسیات کا ایک محسوسہ اور معمولہ مجموعہ ہے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص زندہ ہے یا اُسکی بھی کوئی ہستی ہے تو اُس کی دلیل یہی ہوتی ہے کہ وہ حسیات رکھتا اور اُن سے اپنے رنگ میں کام لیتا ہے جب انسان مرجاتا ہے تو اُسکی تمام حسیات جو اس جسم یا اس حالت کے تابع یا متعلق ہیں مرجاتی ہیں نہ ناطقہ رہتا ہے نہ لمس اور نہ بصارت اور نہ سماعت وہی انسان جو ابھی ابھی بولتا چالتا اور تمام حسیات کا مالک تھا ایک دم کے نکلنے سے بالکل ایک تختہ یا مٹی بن جاتا ہے اگرچہ یہ سلسلہ حسیات برسوں تک محسوس اور معمول رہتا ہے لیکن ایک دم کے نہ آنے سے اُسکا نشان بھی نہیں ملتا۔

حسیات اور کیفیات حسیات شروع ہی سے انسان کے حصہ میں آجاتی ہیں اگرچہ علے قدر مراتب اُنکی حالت اور کیفیت ہمیشہ جداگانہ ہوتی ہے لیکن یہ سواد ہر ایک انسانی ہستی کو حاصل ہوتا ہے کوئی جزو یا کوئی ذات اس سے خالی نہیں ہوتی ایک بچے سے لے کر ایک بوڑھے تک میں یہ کیفیت پائی جاتی ہے جس طرح ایک بچہ رفتہ رفتہ ترقی پذیر ہو کر نشو و نما پاتا ہے اسی طرح یہ حسیات اور کیفیات حسیات بھی نشو و نما پاتی رہتی ہیں جسم کی بالیدگی موجب ہوتی ہے۔ بالیدگی قوتوں اور حسیات کی عقل و فراست بھی ایک وجدانی اور ذہنی حس ہی ہے اسکی بالیدگی بھی رفتہ رفتہ ہی ہوتی ہے دیکھو ایک بچہ کی عقل و فراست وہ کیفیت نہیں رکھتی جو بعد میں نصیب ہوتی ہے۔

اگرچہ تجربہ مشق۔ مشاہدات اور اجتہادات بعدہٗ عقل و فراست کی پختگی کا باعث ہوتے ہیں لیکن عقل و فراست بھی رفتہ رفتہ ہی مترقی ہوتی ہے ایک تجربہ کار جس خوبی سے رائے لگاتا اور اجتہاد کرسکتا ہے ایک بچہ ویسا نہیں کرسکتا اُسکی نسبت ہر پھیر کر یہی کہا جاتا ہے۔

گاہ باشد کہ کودک ناداں

باوجود حسیات کی موجودگی کے بھی اُسے پوری عقل و فراست رکھنے والا نہیں کہا جائے گا اگرچہ ہر فرد شخصیت کی حسیات جداگانہ اور منفرد ہوتی ہیں لیکن اُن سب افرادی حسیات میں ایک نسبت مشترکہ بھی ہوتی ہے خواہ نوعیت کے اعتبار سے اور خواہ فعلی اور انفعالی اعتبار سے بصارت اور سماعت کا گو مختلف افراد میں وزن اور رنگ جداگانہ ہوگا لیکن بہت بصارت اور سماعت اُن میں ایک نسبت بھی ہوگی اور وہی غرض مشترکہ سے تعبیر پاتی ہے جبکہ ان حسیات کا نام ہی زندگی یا زندگانی ہے تو دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے گا کہ ان حسیات اور کیفیات حسیات کی بدولت ہی ہمیں دولت حیات حاصل ہوتی ہے۔ ایک فردی یا ایک شخصی زندگی جو کچھ اپنے اندر حسیّات رکھتی ہے وہی اُسکی زندگانی کا سرمایہ ہے حسیات کی تعبیر دو طور پر کیجا سکتی ہے

(الف) منفردانہ رنگ میں۔

(ب) اجتماعی رنگ میں۔

ایک فرد یا ایک شخصیت میں جسقدر حسیات پائی جاتی ہیں اُن کے تصرفات اور عملیات کا علم اور ادراک کبھی منفردانہ محسوس ہوتا ہے اور کبھی مجموعی صورت میں یہ حسیات گویا بجائے خود ایک ایک ہستی اور ایک ایک قوت ہیں جب کبھی اُنکا ادراک اجتماعی رنگ میں ہوتا ہے تو اُس وقت یہ سمجھا جاتا ہے کہ۔

درحقیقت ایک ہی قوت اور ایک ہی جذبہ کام کر رہا ہے کام کرتے کرتے یا کام
لیتے لیتے انسان یہ سوچنے لگتا ہے کہ اسمیں درحقیقت ایک ہی طاقت کام کررہی ہے
جب کبھی کسی شخص یا کسی فرد کی حس زائل ہو جاتی ہے تو اس حالت میں
یہ کہا جاتا ہے کہ

(اس کی یا میری حس زائل ہوگئی ہے)

احساسی قوتوں کے کمزور پڑجانے سے انسان کی زندگی ایک دھندے یا ایک
وبال میں پڑجاتی ہے گو ایسا انسان بظاہر چلتا پھرتا ہے لیکن درحقیقت عملی رنگ
میں اسکی زندگی ہو چکی ہوتی ہے بعض لوگوں کے خیال میں زندگی صرف خوردو
نوش چلنے پھرنے اور بات چیت کرنے ہی کا کام ہے یہ ایک غلطی ہے یہ تو زندگی
کے عوارض ہیں۔ زندگی سے مراد درحقیقت ایک عملی حالت یا عملی کیفیت ہے جو اسکے
کاموں اور حسیات سے ظاہر اور منکشف ہوتی ہے۔ ایک پرانا شعر کسی کا ہے۔

زندگی زندہ دلی کا ہے نام
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

زندہ دلی سے مراد ہنسی مخول مذاق اور مسخراپن ہی نہیں بلکہ مراد عملیات کی
کیفیات بھی ہیں زندہ دل بھی وہی رہ سکتا ہے جو عملی رنگ میں زندگی رکھتا ہو
جو شخص کوئی زندگی ہی نہیں رکھتا وہ زندہ دل کس طرح ہو سکتا ہے افرادی
یا شخصی حسیات سے قومی حسیات کی داغ بیل پڑتی ہے۔ قوم کیا ہے وہ مجموعۂ
کثیر افراد یا کثیر شخصی زندگیوں کا جو منفردانہ رنگ میں پایا جاتا ہے اور جو خود کو
ایک ہی سلسلہ یا ایک ہی مرکز سے منسوب کرتا ہے یہ سلسلہ یا یہ مرکز بھی افراد
منتشرہ ہی کی جدوجہد کا حصہ ہوتا ہے جب رفتہ رفتہ چند افراد ایک مرکز مجوزہ
پر ثابت قدم ہو جاتے ہیں تو اسکا نام کبھی ایک فرقہ اور کبھی ایک قوم

پڑ جاتا ہے باوجودیکہ دوسری اقوام کے افراد منتشرہ کی اغراض اور حسیات بھی اُن افراد سے کچھ نہ کچھ نسبت رکھتی ہیں اور اُن میں بھی اُنکا عکس ایک حد تک پایا جاتا ہے

قوموں کی حدبندی کس طرح ہوتی ہے اسکی مختلف صورتیں ہیں۔

(الف) نسلی حدبندی۔

(ب) ملکی حدبندی۔

(ج) مذہبی حدبندی۔

تین صورتیں ہیں جن پر عموماً قوموں کی حدبندی کا بہت کچھ مدار ہے بعض قومیں صرف امتیاز نسلی کی وجہ سے ایک قوم کہلاتی ہیں۔ بعض قوموں کی حدبندی ملکی اغراض اور ملکی رشتوں کے تابع ہوتی ہے بعض کی حدبندی مذاہب کی بدولت ہے میرا اس حدبندی سے منشا اندرونی شاخوں کا نہیں ہے بلکہ ایک مجموعی حصۂ قوم کا۔ مذہبی حدبندی کا اثر عموماً دوسری دو صورتوں پر بھی حاوی ہوتا ہے لیکن بعض اقوام میں اسکا اثر صرف نہیں ہوتا ہے۔

ہندو قوم کی حدبندی اندرونی امتیازات کی وجہ سے بہت ہی پریشان کہی جاسکتی ہے چار برن کی تقسیم نے اس اندرونی تفریق کو ایک بڑے اسکیل پر قائم کر رکھا ہے اور اُسمیں ابتک کسی فرق آنے کی امید نہیں ہے گو کہ شروع شروع میں اسکی بنیاد ایک تمدنی فلسفہ پر بہت سی ضروریات کے ماتحت رکھی گئی تھی۔

ان چار برنوں کے چلانے کا ذریعہ اسوقت صرف ایک ہندو دھرم اور ملک ہندوستان ہی ہے ان مرکزوں یا ان نقاط پر آکر ہندو قوم کو ایک قوم کہا جاتا ہے گویا ہندو قوم اندرونی تفریقات کو قائم رکھکر مذہب اور ملک کی اغراض کے

تابع ہو کر ایک قوم بنتی ہے۔

چینی اور جاپانی قومیں ملکی اور مذہبی نقطۂ خیال سے ایک قوم کہلاتی ہیں چینی ہمیشہ چینی کہلانے کو ترجیح دیتا ہے اور جاپانی جاپانی کہلانے کو لیکن ان ملکوں کے اندر جو افراد دوسرے مذاہب کے مثلاً مسلمان اور عیسائی رہتے ہیں وہ اگر ایک طرف خود کو چینی اور جاپانی کہتے ہیں تو دوسری مذہبی تفریق کی وجہ سے خود کو مسلمان اور عیسائی کہیں گے۔ زردشتی افراد قوم بھی مذہبی اور ملکی نقطۂ خیال سے ایک قوم ہیں۔ عیسائی اقوام کی بڑی بھاری تفریق نسلی اور ملکی اغراض اور شرائط کے تابع ہے اگرچہ انکا مذہب عموماً ایک ہے لیکن ایک انگلستانی کبھی فرانسیسی اور ایک فرانسیسی انگلستانی اور ایک جرمن انگلستانی اور انگلستانی جرمن کہلانا پسند نہیں کرے گا یہ تفریق اور یہ امتیاز یہانتک وسعت پذیر ہے کہ ان مختلف ممالک اور نسلوں کی رسوم میں بھی ایک بڑی حدتک فرق پایا جاتا ہے گو ان میں کرسچین مذہب ہی ایک حد مشترک ہے لیکن جب نسلی اور ملکی بحث بیچ میں آپڑتی ہے تو پھر رشتۂ مذہب کی طاقت ایک بڑی حدتک گھٹ جاتی ہے ایک یونانی ایک سروین کے ساتھ گو اپنا مذہبی رشتہ رکھتا ہے لیکن جب یونانی اور سروین نسلوں کی بحث چھڑ جاتی ہے تو مذہبی اثر بہت کمزور پڑ جاتا ہے یورپ میں مختلف گروہوں اور مختلف اقوام پر مذہب نے ایسا اثر نہیں کیا جو دیگر سب رشتوں سے مضبوط خیال کیا جائے۔

یونانی ایک یونانی ہے اور سروین ایک سروین ہے تا وقتیکہ مسیح علیہ السلام کے نام کی تقدیس نہیں ہوتی۔ بعض دفعہ یہ مذہبی رشتہ بھی بہت کچھ ڈھیلا پڑ جاتا ہے کیونکہ مذہب کی اندرونی تفریقات کی وجہ سے بعض واقعات پیدا ہو کر گڑبڑ ڈال دیتے ہیں مسلمانوں کی بابت یہ بحث اور بھی پیچیدہ ہو جاتی ہے لیکن نتیجہ ضرور

رہے ہے۔

میں بالفعل چند منٹوں کے واسطے مسلمانوں کو ایک قوم سے تعبیر کروں گا اس قوم کی حقیقت اور کیفیت یہ ہے کہ اس میں نہ مختلف اقوام ہی کے بلکہ مختلف ممالک اور مختلف نسلوں اور مختلف ذریات کے افراد بھی ایک کثیر تعداد میں شامل ہیں صرف مختلف ممالک اور مختلف قوموں اور مختلف نسلوں ہی کے بلکہ مختلف مذاہب کے افراد سے بھی یہ قوم ترکیب یافتہ ہے مسلمانوں میں بھی اندرونی قومی فرقہ بندیاں ہیں جنھیں دوسرے الفاظ میں مختلف گروہوں سے تعبیر کرنا زیادہ تر موزوں ہوگا لیکن باوجود اس پریشان رشتہ بندیوں کے بھی مذہب مسلمانوں پر زیادہ غالب ہے اسلام نے تمام قومی درجہ بندیاں توڑ دی ہیں گو اس وقت تک کچھ کچھ درجہ بندیاں پائی جاتی ہیں مگر دراصل انکا خاتمہ ہو چکا ہے۔ جب ایک انگریز اور ایک یونانی و فرینچ سے سوال کیا جائے کہ تم کون ہو تو اس کا پہلا جواب یہ ہوگا کہ

میں انگلش ہوں۔ فرنچ ہوں۔ یونانی ہوں۔

اگر کسی ہندو سے سوال کیا جائے کہ تم کون ہو تو گو وہ خود کو کھتری برہمن جتیا کر ہندو ہی کہے گا مگر حقیقت الامر سے اسکا جواب مبہم اور کسی قدر دور ہوگا کیونکہ دراصل ہندو کسی مذہب کا نام نہیں ہوسکتا بلکہ ہندو کا زیادہ تر قریبی اطلاق ملک ہند سے ہونا موزوں ہے۔ ایک دوسرا لفظ آریہ بھی ہے اسکا اطلاق بھی کچھ بہت صاف نہیں ہے میری رائے میں اس سے ثابت یا ظاہر ہے کہ اس پرانی اور نامور قوم میں ملکی خصوصیت مذہبی خصوصیت پر غالب ہے اور اس کے بعد نسلی خصوصیت کا زور ہے۔

ایک مسلمان سے جب پوچھا جاتا ہے کہ تم کون ہو تو سب سے اول اُسکا یہ جواب ہوگا کہ میں مسلمان ہوں'

اس جواب سے ثابت ہے کہ مذہب اسلام رفتہ رفتہ قوم یا قومیت کے رنگ میں بھی رنگا گیا ہے اور اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ دائرۂ اسلام میں آکر کوئی قوم یا قومیت گزشتہ باقی نہیں رہتی ایک نئی قوم مسلمان کے نام سے مل جاتی ہے اب دوسرے الفاظ میں یہ کہنا چاہیے کہ -

مسلمان ایک مذہب بھی ہے اور ایک قوم بھی - مذہبیت اس قومیت سے وہی نسبت رکھتی ہے جو خود اسلام کو اپنے آپ سے ہے ہمیشہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ ہم مسلمان ہیں تو اسکا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ تمام نسلیں اور قومیں اختیار اسلام سے اپنی قومیت چھوڑ کر ایک ہی مرکز اسلام پہ آچکی ہیں اس شان اور اس رنگ میں کوئی دوسرا مذہب قومیت اور اقوام نسلوں اور ذریات نسلوں پر غالب نہیں ہوا اس رشتہ کو مد نظر رکھ کر یہ کہا گیا ہے

کل مؤمن اخوۃ

اخوت کا درجہ قوم اور قومیت سے بھی بڑھکر ہے گویا مسلمان باوجود مختلف ذریتوں اور نسل ہونے کے ایک اس قوم میں جو آپس میں بھائی بھائی ہیں شامل ہو جاتا ہے اس سلسلے سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ ہر ایک قوم کی اجتماعی حسیات کا رجحان زیادہ تر کس طرف ہو سکتا ہے مختصراً یہ کہ جو قومیں زیادہ تر نسلوں ذریات اور اقوام اور ممالک سے وابستگی رکھتی ہیں انکا رجحان اور جذب حسیات کچھ اور رنگ رکھے گا اور جس گروہ کی قومیں زیادہ تر مذہب سے مربوط ہیں انکی حسیات کا جذبہ مذہبی رنگ میں ہونا چاہیے خواہ کوئی سا رنگ ہو ان حسیات کو قومی حسیات کے نام سے تعبیر کرنا زیادہ تر مناسب ہوگا - اگر ایک شخصیت کی حسیات شخصی رنگ میں ایک ہی فرد کہی جا سکتی ہیں تو مذہبی حسیات بھی باعتبار ایک قوم ہونے کے ایک ہی اجتماعی قوت ہے -

ہم مانتے ہیں کہ حسیات شخصی ہوں یا قومی مر بھی جاتی ہیں جس طرح ایک شخصیت حیات کے مرنے کی صورت میں ایک بوسیدہ ہستی ہے اسی طرح ایک قوم بھی اس حالت میں ایک مردہ قوم ہے۔

اغراض مشترکہ کی بابت ایک ہی دفعہ ساری قوم یا سارے افراد قوم کے دل و دماغ میں خیالات کا متوجہ ہونا اور ان پر ثابت قدم رہنا افراد اور شخصیتوں کا یہ فرض ہے کہ وہ افرادی اور شخصی حسیات کا رشتۂ قوم سے منسلک اور منضبط کریں اور قوم کا یہ فرض ہے کہ وہ افراد اور شخصیات کے حسیات کو اجتماعی رنگ میں قبول کرے اور اُسے عملی پہلو سے قائم بھی رکھے یہی دو طریقے ہیں جن سے دونوں قسم کی حسیات کا قائم رہنا مقصود ہے جن اقوام کی حسیات کمزور پڑجاتی ہیں وہ سب سے پہلے اس کو جہ سے ناواقف ہوتی ہیں کہ۔

اُن کی اغراض مشترکہ کیا ہیں۔

اور اُن کا تحفظ کن وسائل کے تابع ہے۔

جب تک یہ ادراک نہو تب تک کوئی قوم اپنے حسیات سے مستفیض نہیں ہوسکتی۔ شخصی اغراض مجتمع ہوکر یا سمٹ سمٹ کر قومی اغراض اختیار کرتی ہیں یا قومی اغراض کے قالب میں آتی ہیں اگر کسی قوم کی اقتصادی حالت کمزور ہوچکی ہے تو صرف افراد کا ہی یہ فرض نہیں کہ اُس گئی گذری شان کے واپس لانے میں ہمت دکھلائے بلکہ خود قوم کا بھی یہ فرض اولیں ہے کہ قومی رنگ میں اُس کمی کے پورا کرنے میں زور لگائے جبتک قوم کا قومی رنگ میں یہ نصب العین نہو تب تک کامیابی مشکل ہے۔

ہمارا فرض اولیں ہے کہ ہماری شخصیتیں بھی اُس بڑی شان سے ثابت اور قائم رہیں جو شان اُنکے لیے موزوں ہے کیونکہ افراد کی مساعی ہی قومی مساعی کی

جزو اعظم ہیں جب شخصیتوں کی تحقیر کی جاتی ہے اور اُن کا کوئی احترام باقی نہیں رہتا تو قومی حسیات بھی قائم نہیں رہ سکتیں۔

ہمیشہ جزو سے کُل کی بنیاد پڑتی ہے ایک جسم ذرات کا مجموعہ ہوتا ہے لیکن ذرہ جسم کا مجموعہ نہیں کہا جاسکتا ذرات سے اجسام مرکب ہیں نہ کہ اجسام سے ذرات شروع ہمیشہ معمولی حالات سے ہوتا ہے! در خاتمہ ابتدائی وسطی اور انجامی ارکان رکھتا ہے ایک مدرسہ میں جزیات کی تعلیم دیجاتی ہے لیکن کسی وقت اُن سب جزیات کی تعلیم و ادراک قومی یا اجتماعی رنگ میں ایک خاص شکل اور اثر اختیار کرتا ہے۔ شخصی اور قومی عملیات میں ہمیشہ فرق ہوتا ہے گو کہ قومی عمل میں بھی افرادی عناصر ہی غالب ہوتے ہیں لیکن اسکا نام ہمیشہ قومی عمل کے نام ہی سے تعبیر پاتا ہے۔

ہماری شخصی اور قومی حسیات کی ایک منڈی ہے اور ہمارے دوگونہ عملیات اور اجتہادات ایک اشیاء بلیغ۔ اور اکی عمل جو شخصیتوں کی بنیاد اور اقوام کی رشتہ بندیوں کے نام سے موسوم ہو سکتا ہے جو قومیں اور جو افراد قوم ان دونوں قسم کی حسیات سے عملی رنگ میں واقف ہیں اور اُنکی قدر و قیمت کا اُنھیں علم ہے وہ اسپر بہت کچھ کہہ سکتے ہیں اور اُنکے فعلی اور انفعالی اعمال اور حرکات اُن پر روشنی ڈال سکتے ہیں جو افراد قوم اور جو قومیں اس راہ سے ناواقف ہیں وہ نہ صرف اپنی حسیات ہی کا خاتمہ کر چکی ہیں بلکہ اُن کی ضروریات سے بھی اسقدر دور جا پڑی ہیں کہ اُن کے واسطے یہ ذکر ایک غیر مفید ذکر اور یہ خواب ایک بے تعبیر خواب ہے وہ باوجود اسکے خود میں ایک فرضی حس باقی ہیں اور اس فرضی حس سے زیادہ اُن کے نزدیک اور کوئی حس ہو ہی نہیں سکتی گویا ایک بے حس عضو کو ایک حس دار عضو کہا جاتا ہے اور اُسی پر سب کا مونکا خاتمہ کر دیتا ہے اور یہ ایک باطل پرستی ہے۔ فتدبر۔

سلطان احمد

نظارۂ خرابات

جلوہ فلک پہ شامِ غریباں کا جب ہوا
خورشید آرمیدۂ دامانِ شب ہوا
شمعِ حریم غم دل ایذا طلب ہوا
افزوں مریضِ ہجر کو رنج و تعب ہوا

موسیٰ کی طرح طالب دیدارِ یار ہے
اپنے سے بے خبر ہے مگر ہوشیار ہے

ہے آتشِ فراق ستمگر لگی ہوئی
سینے سے ہے امانت دلبر لگی ہوئی
ضبطِ فغاں سے مُہر ہے لب پر لگی ہوئی
ہے چشم انتظار سوئے در لگی ہوئی

سب فرشِ خار بستر کمخواب ہو گئے
انجم نثار دیدۂ کمخواب ہو گئے

اس بیکسی میں کوئی نہیں ہے پیامبر
لیلےٰ کو مرگِ قیس کی پہنچائے جو خبر
بلقیس کا ہو در پہ گدا کے کہاں گذر
ہاں مور کو خدا کہیں بخشے جو بال و پر

پروانہ تا بہ قصر سلیمان ہو ابھی
مشکل جو آ بنی ہے وہ آسان ہو ابھی

بیمار اور کوہِ شبِ تار الحذر
یہ مشت استخواں پہ گرانبار الحذر
پائے وہ دل زمانے سے آزار الحذر
جو ہے ازل سے تیرا پرستار الحذر

دنیا سے کچھ غرض ہے نہ زر چاہیے مجھے
بس تیری کارساز نظر چاہیے مجھے

بیتاب مجھ سا بلبلِ شوریدہ سر کہاں
گل آشنائے داغ دلِ نوحہ گر کہاں

پروانہ محرمِ تفِ محشر اثر کہاں اک شمع ساری رات جلے پھر جگر کہاں
سوزِ فراق و حسرت نظارہ اور ہے
پارہ کچھ اور ہے دلِ صد پارہ اور ہے
رونق نگار خانۂ افلاک پر نہیں تسکین بخش روح جمال قمر نہیں
اُجڑے ہوئے چمن میں صبا کا گذر نہیں شاید یہ رات وہ ہے کہ جسکی سحر نہیں
کب سے ترس رہا ہوں میں آرام کے لیے
سینے میں دل طپاں ہے دل آرام کے لیے
دکھلائے لاکھ چرخ اگر سحر سامری اور مشتری ہو جلوہ نما صورت پری
زہرہ کرے یہ نغمۂ داؤد ہمسری آتا نہیں کسی کو بھی اندازِ دلبری
نیرنگ عالم اور ہمیں دھیان اور ہے
مسکن ہے جس کا دل وہ سلیمان اور ہے
معلوم ہے بساط تری آسماں ہمیں مہرے بدل بدل کے نئے بازیاں ہیں
اُفتاد سے ہوں پست یہ طاقت کہاں ہمیں عنقا سے بھی ملا ہے بلند آشیاں ہمیں
رفعت کبھی کسی کی گوارا یہاں نہیں
جس سرزمیں کے ہم ہیں وہاں آسماں نہیں
بے خانماں ہیں سوختہ ساماں تو کیا ہوا شیرازۂ چمن ہے پریشاں تو کیا ہوا
زیب قفس ہے مرغ خوش الحاں تو کیا ہوا ذوقِ نظر ہے خار بداماں تو کیا ہوا
ابر کرم سے دن جو پھریں خاکسار کے
پھر آئیں گے خزاں میں وہی دن بہار کے
(باقی آئندہ)

آغا غلام حسین ارشد

صغر سنی کی شادی

جہانتک ہندوستان کا تعلق ہے، صغر سنی کی شادی کسی خاص فرقے یا قوم تک محدود نہیں پائی جاتی۔ اسمیں کچھ شبہ نہیں کہ ہندو قوم اس میں زیادہ لتھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور مسلمان کم، مگر ایسی برائی جو کئی قوموں میں مشترکہ ہو اسکا خطرہ زیادہ ہے بہ نسبت اس برائی کے جسکی جوابدہ فقط ایک کمیونٹی ہے۔ باوجود اس امر کے کہ مصلحان قوم و ملک اس مسئلہ پر روشنی ڈال کر ایک حد تک عوام کی آنکھیں کھول چکے ہیں، تاہم پھر بھی یہ برائی بکثرت ہندوستانیوں میں موجود ہے اور اسوقت تک کبھی نیست نابود نہ ہوگی جب تک ہندوستانی والدین اپنے ملکی رواج کا جس نے بدقسمتی سے مذہبی صورت اختیار کر لی ہے سختی کے ساتھ مقابلہ نہ کرینگے اور سن بلوغت کے بعد اپنے بچوں کی شادی کر کے ملک میں شاندار مثالیں نہ پیدا کریں گے۔

صغر سنی کی شادی کے مسئلہ سے مجھے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ اس رسم کے مخالفین کی رائیں بھی مجھے معلوم ہیں اور ایسے لوگوں کے خیالات سننے کا بھی موقع ملا ہے جو اس قبیح رسم کے ابتک موافق ہیں۔ ایسی حالت میں میں اس قابل ہوں کہ موافق مخالف دونوں پہلو ناظرین کو دکھاؤں اور بتاؤں کہ ہمارے ملک کی بھلائی کس میں مضمر ہے۔ ملک کی بھلائی خود ہمارے ہاتھوں میں ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک صغر سنی کی شادی کا رواج ہمارے ملک میں موجود ہے اس وقت تک ہم ہندوستان کو اس شاندار حالت پر نہیں دیکھ سکتے جسے ہم نے اپنا آئیڈیل اور مطمح نظر بنا رکھا ہے۔

صغر سنی کے موافقین کہتے ہیں کہ یہ مفید چیز ہے اس لیے کہ

(۱) میاں بیوی میں عمر بھر محبت رہتی ہے، اور

(۲) لڑکا عیوب سے بچا رہتا ہے۔

اسمیں کچھ شبہ نہیں کہ جس محبت کا بیج بچپن میں بویا جاتا ہے وہ عمر بھر رہتی ہے لیکن ہمیں اب یہ دیکھنا ہے کہ ملک کے موجودہ رسم و رواج کے مطابق کہانتک باہمی میل جول کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ اس بارے میں ہمارا تجربہ یہ ہے کہ دونوں کو ارتباط کرنے کے موقع نہیں ملتے اور اس لیے وہ مطلب فوت ہو جاتا ہے جس غرض سے کہ چھٹپن میں شادی کی گئی ہے۔

دوسری وجہ کے متعلق مجھے یہ کہنا ہے کہ عام طور پر نکاح ہو جانے کے کچھ عرصہ بعد باقاعدہ شادی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ پنجاب میں اس رسم کا نام مکلاوہ ہے اور بعض اوقات نکاح اور مکلاوہ کے درمیان کئی سال کی مدت حائل ہو جاتی ہے اور اس عرصہ میں بیرونی خراب اثرات سے متاثر ہونے کے لیے لڑکے کو کافی موقع و فرصت مل سکتی ہے۔ اس عرصہ میں اگر وہ خراب ہونا چاہے تو ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ کہنا کہ صغرسنی کی شادی لڑکے کو خراب صحبت سے بچانے میں مدد دیتی ہے، کسقدر بے معنی ہے؟

ان دلائل سے قطع نظر ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ شادی کا مقصد کیا ہے اور یہ کہ آیا صغرسنی کی شادی اس مقصد کو پورا کر سکتی ہے یا نہیں؟

قدرت پر جب ہم غور کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے ہر چیز میں نر اور مادہ پیدا کیا ہے۔ جانداروں کے علاوہ یہ تذکیر و تانیث درختوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ اگرچہ درختوں کے نر مادہ ہونے کی بحث چھیڑنے کا یہ وقت نہیں، مگر اتنا جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ بعض درخت نر مادہ دونوں جزو اپنے میں رکھتے ہیں اور بعض میں صرف نر کا جزو ہوتا ہے اور باقیوں میں مادہ کا۔ خاص وقت پر ان کا بیج مختلف قدرتی طریقوں سے ملتا ہے اور اسطرح سے ایک درخت دوسرے پودے کی زندگی پیدا کرنیکا

باعث ہوتا ہے۔ اور درختوں کی نسل کا سلسلہ برقرار رہتا ہے۔ مگر اس سلسلہ پیدائش کی بابت یہ بات خاص طور پر ذہن نشین رکھنے کے قابل ہے کہ یہ سب کچھ وقت پر واقع ہوتا ہے اور وقت سے پیشتر کبھی نہیں ہوتا۔ درختوں کے علاوہ حیوانوں میں ہم یہ بات نمایاں طور پر دیکھتے ہیں کہ وہ سن بلوغت کے پہنچ جانے کے بعد ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں اور اس طرح سے سلسلۂ توالد و تناسل کو برقرار رکھتے ہیں۔ اس بارے میں انسان دیگر حیوانوں سے علیحدہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے بھی ضروری ہے کہ توالد و تناسل کا فرض جو شادی کا مقصد ہے، ایسی عمر میں ادا کرے جبکہ قوی بالطبع اسکے ادا کرنے سے نہ تھک جائیں۔ یہ عمر سن بلوغت کے بعد کی عمر ہے۔ انسان کے لیے دیگر جانداروں کی مثال باعث عبرت ہے۔ مرد اور عورت کا ایسے وقت میں ایک دوسرے کے ساتھ بود و باش اختیار کرنا جبکہ قوی پورے نشو و نما یافتہ نہوں، نظام اعصاب کی تباہی کا باعث ہوگا۔ خدا تعالےٰ کا انسان کو یہ قوت عطا کرنا کہ وہ خاص عمر کو پہنچ کر اپنی نسل خود بڑھا سکے، اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خود چاہتا ہے کہ شادی کا مقصد باحسن وجوہ ادا ہو، اور وہ اچھی طرح سن بلوغت کے بعد ہی ادا ہو سکتا ہے۔ صغرسنی کی شادی سے بعض اوقات توالد و تناسل کا مقصد تو ادا ہو جاتا ہے مگر خوش اسلوبی سے نہیں۔ قدرت اس ذمہ داری کو ہمارے سر پڑ اننا چاہتی ہے جبکہ ہم جسمانی طور پر اسکے ادا کرنے کے قابل ہو جائیں لیکن ہم ازخود یہ بوجھ ایک ایسے وقت میں دوسروں کے کہنے سے اٹھا لیتے ہیں جبکہ ہم بالکل اسکے ناقابل ہوتے ہیں۔ بچے پیدا کرنے کی قابلیت لڑکی میں کم عمری میں بھی موجود ہوتی ہے لیکن اس قابلیت کو پیش از وقت استعمال کیا گیا تو اسکا نتیجہ کمزور اولاد ہوگی اور کشمکش حیات میں پورا اُترنے کے لیے ضرورت ہے کہ اولاد ہر لحاظ سے توانا و طاقتور ہو۔ صغرسنی کی شادی میں توانائی کا سوال بالکل جاتا رہتا ہے اور اس سے پیشتر کہ لڑکا اور لڑکی اپنے تئیں تندرست قائم رکھ سکیں، توالد و تناسل کا بوجھ ان پر ڈالدیا جاتا ہے وہ دونوں

اولاد کے فرائض کو نہیں جانتے اور جیسا کہ اکثر دیکھا گیا ہے گھر کی دوسری عورتوں کو بچے کی پرورش کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں صغرسنی کی شادی وبالِ سر کے مترادف ہے۔

مزید براں بے وقت کی شادی ہماری قوت نمو کو یکقلم رد کر دیتی ہے اسلیے کہ جو قوت پہلے اعضا کے بڑھانے میں صرف ہوتی وہ اب تمام وکمال یا زیادہ تر دوسری سمت میں استعمال کی جاتی ہے۔ اسکے علاوہ ہمارا نظام اعصاب قدرتی طور پر اسطرح سے بنایا گیا ہے کہ اگر اسپر پیش از بالیدگی ذرا زیادہ بوجھ ڈالا گیا تو وہ کمزور ہوجاتا ہے، اور میاں بیوی ساٹھ سال کی عمر میں ایسے ضعیف ہوجاتے ہیں کہ گو یا وہ ۸۰-۹۰ برس کے ہیں۔ یہ پیش از وقت پیرانہ سالی وہ سزا ہے جو قدرت ان لوگوں کو دے رہی ہے جو قدرتی قانون کے خلاف ورزی کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں کے لوگ ۶۰ سال کی عمر میں از کار رفتہ ہوجاتے ہیں اور اپنا وقت خدا کے دھیان میں صرف کرنے کی غرض سے کونے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ حالانکہ اگر فزیالوجی کی رو سے دیکھا جائے تو ۶۰ سال کی عمر میں دماغی حالت اصل عروج پر ہوتی ہے۔ موجودہ جنگ یورپ میں جسقدر مشہور برٹش افسر اور کمانڈر ہیں وہ عمر میں پچاس سے زائد ہیں۔ جرمن افسر ساٹھ سے زیادہ ہیں اور بعض ستر سے متجاوز ہوگئے ہیں اور اس عمر میں زندگی اور موت کی جنگ میں مصروف ہیں۔ اگر وہ ہندوستانی ہوتے تو یقیناً کسی کام کے نہ رہتے اور اپنے ہوش وحواس کو بھی کھو بیٹھتے۔ ہمیں صغرسنی کی شادی کی سزا ملتی ہے اور اُنھیں قدرتی عمر میں شادی کرنے کا انعام۔

اسکے علاوہ آٹھ یا دس برس کی لڑکی کی جب شادی ہوتی ہے اور دوسرے سال جب اُسکے ہاں اولاد ہوتی ہے تو اسوقت اسے ایسی ناقابل بیان تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو صرف اس حالت میں سے گذرے ہوئے لوگوں ہی کو معلوم ہے

اس ضمن میں میں ایک قصہ بیان کروں گا۔ ایک لڑکی کی شادی دس برس کی عمر میں ہوئی اور گیارھویں سال اولاد ہوئی۔ اولاد ہونے سے چار دن قبل اسپر درد کے باعث سکرات کی سی حالت طاری رہی۔ آخر درد کی تکلیف اسقدر بڑھی کہ آس پاس کے لوگ اسے برداشت نہ کرسکے اور یہ تجویز ہوئی کہ اسے کلوروفارم سنگھا دیا جائے۔ دس گھنٹے تک وہ اس دوائی کے زیر اثر بیہوش پڑی رہی اور اسکے بعد جب بچہ پیدا ہوا تو وہ مرا ہوا تھا اور اسکے ساتھ ہی گیارہ برس کی ماں بھی ختم ہوچکی تھی۔ اس ایک واقعہ سے ان تمام تکالیف کا اندازہ ہوسکتا ہے جو قدرتی طور پر گیارہ سے لیکر پندرہ[۱۵] برس کی کم عمر ماؤں پر بچہ پیدا ہونے کے وقت گذرتی ہیں۔ بچے بعض اوقات مردہ پیدا ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ کمزور ہوتے ہیں اور بعض دفعہ ان کے حواس معطل ہوتے ہیں اور باوجود ان تمام خرابیوں کے ملک میں صغر سنی کی شادی کا رواج ہے۔ اور سب سے زیادہ عجیب و غریب بات ایسی شادیوں کے متعلق یہ ہے کہ ان کی انجام دینے والی بڑی بوڑھی عورتیں ہی ہوتی ہیں جو رسم و رواج اور اپنی بیوقوفی کے باعث اپنی اولاد کو ایسی مصیبت کے حوالے کردیتی ہیں جو بالآخر ان کی جان لے کر ختم ہوتی ہے۔ گذشتہ مردم شماری کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ملک میں لاکھوں بیوائیں ایسی موجود ہیں جنکی عمر پانچ[۵] اور پندرہ[۱۵] سال کے درمیان ہے اور اگر دیکھا جائے تو یہ وہ زمانہ ہے جبکہ انھیں مدرسہ میں ہونا چاہیئے تھا۔

مدراس پریزیڈنسی میں پانچ سے کم عمر کی سات سو اڑتیس[۷۳۸] بیوائیں موجود تھیں اور پانچ[۵] سے دس[۱۰] برس کی عمر کی چار ہزار تین سو بتیس[۴۳۳۲] اور دس اور پندرہ[۱۵] برس کی عمر کی چوبیس ہزار چار سو سینتالیس[۲۴۴۴۷]۔ ان اعداد سے ان بدبخت وجودوں کی تعداد معلوم ہوسکتی ہے اور پھر ہمارے ہاں کی رسم و رواج ایسے ہیں کہ بیوہ ہوجانے پر تمام دنیا کی لعن طعن اسی کے حصے میں آنے لگتی ہیں۔ بعض ہندوؤں میں یہانتک ہے

کہ ہر خوشی کے موقع پر بیوہ کو کوٹھری کے اندر بند کر دیا جاتا ہے۔ مبادا اسکا منحوس اثر باقی گھر والوں پر نہ پڑے۔ یہ ہے وہ شرم و ذلت کی زندگی جو اسے بیوہ ہو جانے کے بعد بسر کرنی پڑتی ہے اور بعض اوقات یہ بھی سزا ملتی ہے کہ وہ دوسرا نکاح نہ کرنے پائے گویا اپنے خاوند کی موت کی ضامن وہی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسی رسم جو اپنے میں فائدہ کچھ نہیں رکھتی اور سراسر نقصان ہی سے مملو ہے، کیونکر وجود میں آئی؟ ہندوؤں میں "منو" کے قوانین کو خاص درجہ دیا جاتا ہے اور اگرچہ اسمیں صاف طور پر یہ لکھا ہے کہ مرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ۲۴ برس کی عمر تک برہم چاری رہے اور اسکے بعد گرہستی زندگی بسر کرے مگر بعد میں جو سمرتیاں لکھی گئیں انمیں عورت کی شادی کے قابل عمر آٹھ اور دس سال بتائی گئی ہے مگر ساتھ ہی آٹھ برس کی لڑکی کے لیے چوبیس برس کا مرد لکھا ہے جو بالکل نامعقول ہے۔ ان سمرتیوں کا اثر ہندوؤں میں اسقدر زیادہ ہے کہ اب صغر سنی کی شادی کا بالکل عام رواج ہو گیا ہے۔ غالباً اسمیں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بعد کے لوگوں کی کارستانی معلوم ہوتی ہے اور اس لیے جب کبھی فیصلہ کرنے میں کچھ دقت معلوم ہو تو اس صورت میں ہمیں چاہیے کہ مذہبی قانون کا (جو دراصل غلطی سے مذہبی قرار دے لیا گیا ہے) قانون قدرت سے موازنہ کریں۔ اور موخرالذکر کو اسلیے قبول کرلینا چاہیے کہ وہ بالکل اٹل ہے اور ایسا قانون ہے جسے کسی انسانی ہاتھ نے نہیں وضع کیا اور صرف خدا کا وضع کردہ قانون ہے۔ لیکن اگر ہم ہندوؤں کے قدیم زمانے کی طرف جائیں تو ہمیں صاف معلوم ہو جائیگا کہ اس زمانے میں شادی سن بلوغ میں یا پہنچنے کے بعد ہوتی تھی اور دراصل ہندو قوانین یہی ہیں کہ ایسی عمر میں شادی کی جائے کہ میاں بیوی مضمون اس مقصد کو اچھی طرح سے سمجھ سکیں جسکے لیے قدرت نے انھیں ملایا ہے۔ قدیم ہندوؤں میں اس امر کی بہی مثالیں ملتی ہیں کہ

شادیاں مرد اور عورت دونوں کی باہمی رضامندی سے ہوا کرتی تھیں۔ موجودہ زمانے کی ہندو اسپرٹ کا مقابلہ قدیم اسپرٹ سے کیا جائے تو صاف کہنا پڑے گا کہ

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

مزید براں ہندوؤں کے چار آشرم میں سے ایک آشرم یہ ہے کہ وہ ۲۴ برس کی عمر تک بالکل برہم چاری (مجرد) کی زندگی بسر کرے۔ ایک طرف اس حکم پر یقین کیا جاتا ہے اور دوسری طرف صغر سنی کی شادی پر زور دیا جاتا ہے ایک طرف کہا جاتا ہے کہ برہم چرج رکھو اور دوسری طرف بچپن کی شادی کو بھی ضروری خیال کیا جاتا ہے بچپن کی شادی اور برہم چاری کی زندگی دونوں متضاد چیزیں ہیں، ایک وقت میں صرف ایک رہ سکتی ہے۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ
باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

اکثر ہندوؤں کے دلوں میں یہ خیال ہے کہ بچپن کی شادی کا اس لیے رواج ہوگیا تھا کہ مسلمانوں کے حملوں کی وجہ سے عورتوں کے لیے محافظ مقرر کردینا زیادہ قرین مصلحت سمجھا گیا تھا۔ کیونکہ والد کے بعد عورت کی حفاظت کا بوجھ اسکے خاوند پر ہے مگر اس کا جواب یہ ہے کہ جس عمر میں شادی کردی جاتی تھی وہ ایسی کم ہوتی تھی کہ خاوند بیوی کی حفاظت تو کیا اپنی حفاظت بھی مشکل کرسکنے کے قابل ہوتا تھا۔ یہ وجہ میں ابتک سمجھنے سے قاصر ہوں۔

مسلمانوں میں یہ قبیح رسم اسلئے آئی کہ بہت سے ہندوؤں نے مسلمان ہوجانے پر بھی اپنی قدیم رسوم کو نہیں چھوڑا۔ پرانا رنگ اسقدر غالب تھا کہ وہ نئے رنگ سے کلی طور پر متاثر نہ ہوسکے۔ اب بھی دیہات میں ایسے مسلمانوں کی تعداد بے انتہا ہے جو پوچھنے پر اپنے آپ کو مسلمان بتائینگے مگر نام اور رسم و رواج کے اعتبار سے اگر

دیکھا جائے تو وہ پورے ہندو ہیں۔ چونکہ یہ خود اسی رسم میں مبتلا تھے اسلیے انھوں نے مسلمانوں کو بھی مبتلا کر دیا۔

مگر وجہ خواہ کچھ ہی ہو اس وقت ہندو اور مسلمان دونوں ہمین آلودہ نظر آتے ہین اور اب دونوں فریقوں کے لیڈروں اور ہر خیر خواہِ ملک و قوم کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے ذرائع اختیار کرے جس سے اس رسم کا بتدریج ہمیشہ کے لیے استیصال ہو جائے اور آیندہ جو نسل پیدا ہو وہ موجودہ نسل کی طرح قد میں چھوٹی اور جسم میں کمزور نہ ہو بلکہ وہ پُرانے راجپوتوں کی طرح سے مضبوط و توانا ہو کیونکہ ہندوستان کا مستقبل طاقتور لوگ بنا سکتے ہیں نہ کہ کمزور ٹھٹھرے ہوے نوجوان۔

علم النفس کا ایک اصول یہ ہے کہ ہر کام کے لیے ایک مصمم مرضی اور ارادے کی ضرورت ہے۔ لہذا ان تمام والدین کو جو دل سے اپنے ملک کی ترقی چاہتے ہیں، یہ عزم بالجزم کر لینا چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کی شادی شیرخوارگی اور بچپن میں نہ کرینگے (ہندوستان میں عورت کی شادی کی عمر ۱۶ سال ہے اور مرد کی ۲۵ سال) دوسرے ہر قومی درسگاہ کو تعلیم کے بارے میں تھیوسوفیکل خیالات کی عملی اشاعت کرنی چاہیے۔ ہر تھیوسوفیکل انسٹیٹیوشن کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ کبھی ایسے طالب علم کو اپنے سکول مین داخل نہیں کرتا جسکی شادی ہو چکی ہو۔ برخلاف اسکے لڑکے کے والدین کو سمجھایا جاتا ہے کہ وہ لڑکے کی شادی کا خیال اسوقت دل میں لائینگے جبکہ وہ اسکول کی تعلیم ختم کرے گا، اور اس سے پہلے نہیں۔ تھیوسوفیکل سوسائٹی نے جو یہ تعلیمی آئیڈیل مقرر کیا ہے تو اسکی وجہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک تعلیمی زندگی اور گرہستی زندگی میں نمایاں اختلاف ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے بالکل علحدہ ہیں اور ایسے زمانے میں جبکہ اسکول کی تعلیم اور امتحانات کے سلسلہ کی بدولت لڑکے پر بہت زیادہ بار پڑتا ہے، اگر اسے خاوند بنا دیا جائے گا تو اسکا نتیجہ اسکی جسمانی صحت پر ایک ایسا

بوجھ ہوگا جسے وہ کبھی برداشت نہین کرسکے گا۔ ساتھ ہی جب ہر سال اسکولوں اور کالجوں سے ایسے برہم چاریوں کی تعداد نکلے گی جو جسم اور دماغ میں کافی طور سے مضبوط ہوں گے تو آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ ہندوستان کے کیسے بھلے دن آجاینگے یہ دونوں باتیں جو اوپر بیان کی گئی ہیں، ذرا سی دلیری اور ذرا سے ایثار سے طے پاسکتی ہے اور دونوں صفات کے بغیر آج تک کوئی قوم اصلی قومیت تک نہیں پہنچی۔

ہندوستان کے موجودہ تعلیم یافتہ گروہ میں بہت کم ایسے اشخاص ہیں جو تیس برس کی عمر میں بالکل تندرست ہوں۔ ہزارہا نوجوان اعصاب اور معدہ کی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ سینکڑوں دوران خون کی شکایت کے شاکی ہیں اور ہزاروں ایسے ہیں جنکے اعضاے رئیسہ کمزور ہیں۔ اسی طرح ذیابیطس کے مریضوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ یہ سب لوگ کمزور والدین کی اولاد ہیں اور ان میں سے اکثر ایسے ہوں گے جنھوں نے صغر سنی میں شادی کی ہوگی۔ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانون کی ایسی حالت ہندوستان کے تعلیمی پہلو پر ایک بہت بدنما دھبہ ہے ہمارے نوجوان ۳۰ سال کی عمر میں پچاس کے اور ساٹھ سال کی عمر میں نوے سال کے معلوم ہوتے ہیں درانحالیکہ دوسرے ممالک کے بوڑھے آدمی بڑھاپے میں بھی اپنی قوم کو صلاح و مشورہ دینے کے قابل رہتے ہیں۔ یہی حالت ہم ہندوستان میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس بری رسم کے استیصال میں ہندو مسلمان دونوں کو مل کر کام کرنا چاہیے۔ مختلف لکچروں کے ذریعہ والدین کے دلون میں اس رسم بد کی طرف سے خوف اور وحشت بٹھانی چاہیے اور اگر ہم لڑکیوں کی خاطر نہ سہی، لڑکوں ہی کی خاطر صغر سنی کی شادی کو بند کردینگے تو ہم اس زمانے کو، اس شاندار زمانے کو جسے ہماری آنکھیں عالم خیال میں دیکھ رہی ہیں زیادہ

ترتیب دے آئیں گے اور ہم ہر لحاظ سے ایک ایسی مضبوط قوم بن جائیں گے جو دنیا میں عزت و وقار کے ساتھ رہنے کے قابل ہو سکے گی۔

اگر ہم نے صغرسنی کی شادی کو جلد کم نہ کیا تو بیسویں صدی کے آدمیوں پر یہ الزام عاید ہوگا کہ وہ دختر کشی کرنے اور ستی کرانے میں مدد کرتے ہیں۔ یہ دونوں خوفناک مراسم اصولاً معدوم ہیں مگر صغرسنی کی شادی میں ہم ان ہی رسموں کو گویا ادا کر رہے ہیں۔ بلکہ یہ رسم ان سے بھی زیادہ خوفناک ہے۔

"اے خدا تو ہماری آنکھیں کھول تاکہ ہماری تباہی خود ہمیں نظر آنے لگے اور ساتھ ہی ہمیں اس سے بچنے کی بھی توفیق دے۔"

ضیاالدین برنی

ترکِ محبت

ہیں کہ اب مستغنیِ جذباتِ الفت ہوگیا　　ہستیِ نا آشنائے رنج و راحت ہوگیا
دل سے مطلق مٹ گئی خارِ محبت کی خلش　　اندمالِ درد ریزی جراحت ہوگیا
خواہشاتِ مضطرب احساس ساکن ہوگئیں　　شوق رخصت ہوگیا ارمان رخصت ہوگیا
مل گئی فرطِ تمنا کی کشاکش سے نجات　　سدِّ بابِ تلخیِ انجامِ حسرت ہوگیا
ذوقِ نظارہ رہا باقی نہ امیدِ وصال　　اختتامِ ناگواری ہائے فرقت ہوگیا
عشقِ رسوا کن کی محشر زائیاں جاتی رہیں　　جذبِ ضبطِ نفس میں جوشِ طبیعت ہوگیا
بے نیازی اک نیاز آگینیوں میں مل گئی　　ناشناسِ طرز و اندازِ محبت ہوگیا
اب یہی دل سے دعا ہے میں ہوں ہی دو جہاں　　اور حاصل تجھ سے ہی عہدِ فراغت ہوگیا

درد کی بیدردیاں آخر میں درماں ہوگئیں
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

ارشد تھانوی

شاعر

نرگس و نسریں کیا۔ کیا یاسمن کیا نسترن
لالۂ آتش نوا کیا بلبلوں کی انجمن

موج دریا کا تموج چاند کا پیارا سماں
برق و باران و شفق سب رنگ روئے آسماں

آہ و غم۔ شور و الم۔ عشاق کا سوز و گداز
آمد باد صبا محبوب کے انداز و ناز

دامنِ صحرا۔ نکیلے خار۔ رنگیں کشت زار
بھینی بھینی گل کی خوشبو رونق فصل بہار

بلبل و قمری کے نغمے ہدہد و گل کی نمود
ساغر و مینا کی باتیں انکشاف ہست و بود

آرزوئے شاعر ناکام کا انجام ہیں
صدر بزم لامکاں کی شان کا پیغام ہیں

حسن کیا ہے دیدۂ شاعر کا ہے مہماں نواز
راگ کیا ہے نغمۂ تار رباب سوز و ساز

فلسفی سمجھا تحیر میں فقط ناداں مجھے
زاہد ناداں نے جانا قالب بیجاں مجھے

مجھکو خالق نے محبت کے لیے پیدا کیا
گل کا بلبل کا تخیل کا مجھے شیدا کیا

بے زبانی ہوں کسی کی میں کسی کا راز ہوں
گل سرشتہ اس انجمن میں گوش بر آواز ہوں

ہوں سراپا نور مشعل نور کا جویاں ہوں میں
وادیٔ امکان کا ذرہ ہوں بیٹھا ہوں میں

حرف کُن کی دھن میں چھوٹی سی اک تفسیر ہوں
خوش نظر آتا ہوں لیکن درد کی تصویر ہوں

اپنی ہستی کا نشاں میں آپ پا سکتا نہیں
دل میں رکھتا ہوں بہت کچھ پر بتا سکتا نہیں

ہوں سکوت آموز حیرت۔ مدعائے درد و غم
التجا سے قلب مست ہوں عدم سے ورد و قوم

اک طرف لیلے کو رلواتی ہے خاموشی مری
اک طرف مجنوں کو تڑپاتی ہے بیہوشی مری

اسقدر جلوے عیاں ہیں پیکر خاموش ہیں
اسقدر یوسف نہاں ہیں درد کی آغوش ہیں

شوخئ دنیا کو اک منظر دکھا سکتا ہوں میں
اہل محفل کو ہنسا سکتا رلا سکتا ہوں میں

نذر محمد انور سیالکوٹی

فضل لکھنوی

بعض خوش نصیبوں کو خزانۂ غیب سے بے تلاش وجستجو وہ دولت مل جاتی ہے جو بہتوں کو کوشش وسعی سے بھی میسر نہیں آتی۔ دنیا اس خداداد دولت کو حیرت کی نظر سے دیکھتی اور تعجب کرتی ہے۔ لیکن جن لوگوں کو شاہی درباروں کے حالات سے کچھ دلچسپی ہے ان کے نزدیک یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ ایسے واقعات بکثرت پیش آتے رہتے ہیں، اور مستحق وغیر مستحق سب کے سب انعام پاتے ہیں ؎

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

دولتِ شاعری بھی مبدءِ فیاض سے بعضوں کو اسطرح چھپر پھاڑ کے مل جاتی ہے گویا وہ ماں کے پیٹ ہی سے شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ نہ ان کو عروض سیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے نہ قافیہ کی حاجت، موزوں طبیعت ہی بحر ہے اور مذاق سلیم تقطیع، نہ کسی کے آگے زانوے شاگردی تہ کرنے سے مطلب، نہ کسی سے دوستانہ مشورۃ کی غرض۔ لطف یہ ہے کہ کم استعدادی وکم علمی بھی سدراہ نہیں ہوتی بخلاف اسکے جن لوگوں کو قدرتی طور پر استعداد نہیں وہ علم وفن شعر کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے میں عمریں صرف کر دیتے ہیں تب بھی وہی "ڈھاک کے تین پات"۔

اسلام سے پہلے عرب کے شاعر جن کی شاعری اور فصاحت وبلاغت نے انھیں "عرب العرباء" کا معزز خطاب دلایا، تمام عالم سے اپنا لوہا منوایا قریب قریب سب جاہل تھے، لیکن شعر ایسے کہتے تھے کہ اُن کے اخلاف جنکو "مولدینِ عرب"

کہتے ہیں باوجود علم و فضل کے اُنکے برابر نہ پہنچ سکے اور نہ اُنکی فصاحت و بلاغت کو پا سکے۔ مگر عجم میں ایسی مثالیں بہت کم ہیں کہ جاہل ہو کر اعلےٰ درجہ کے شاعر ہوئے ہوں اہل ادب کے دلوں پر اُنکا سکہ بیٹھا ہو یا کسی نے اُن کا لوہا مانا ہو۔ ہاں اوسط درجے کے کہنے والے مل جائیں گے جنکے کلام میں رطب و یابس دونوں حصے برابر ہونگے مگر وہ بھی بمشکل اور "معدودے چند"

ان ہی معدودے چند میں سے ایک حضرت فضل لکھنوی ہیں۔ جنکی بے علمی پر نظر کرتے ہوے حیرت ہوتی ہے اور بے اختیار زبان پر شعر آجاتا ہے ؎

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
کہ آگ کو لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

حضرت فضل کی ولادت باسعادت لکھنؤ کے مشہور محلہ "قندھاری بازار" میں ہوئی یہیں وہ سن تمیز کو پہنچے اور ۱۸۸۴ء تک یہیں سکونت پذیر رہے۔ پورا نام فضل اللہ اور ان کے والد کا نام محمد خاں ہے۔ آپ ایک اعلےٰ خاندان سے ہیں۔ آپ کے باپ دادا بڑے کامل فاضل لوگ تھے "نافع السالکین" میں اُن حضرات کا مختصر تذکرہ موجود ہے۔ مگر اُن کے خلاف حضرت فضل نے اپنا تمام زمانۂ طفولیت کھیل کود میں ضائع کیا پڑھنے لکھنے میں بالکل دل نہ لگایا بلکہ اسقدر بے تعلق رہے کہ اپنا نام بھی نہیں لکھ سکتے تھے۔ یا للعجب!

عبرت کا مقام ہے کہ فاضلوں کے لڑکے علم و فن سے اس طرح کورے رہیں کہ اپنا نام بھی نہ لکھ سکیں۔ ؎

گہر آری خلیلے ز تبخانہ کنی آشنائی ز بیگانہ
گہے یاچناں گوہر خانہ خیز چو بوطالبے را کنی سنگ ریز

آخیر عمر میں اپنی اس زار حالت پر خود بھی بہت افسوس کرتے تھے۔ مگر

"اب پچتائے کا ہوت ہے، چُگ گئیں چڑیاں سبرا کھیت"

ساٹھ برس کی عمر میں جب مکہ معظمہ سے حج کرکے واپس آئے تو قرآن شریف (اس خیال سے کہ یہی دین و ایمان ہے) پڑھنا شروع کیا۔ چنانچہ تخمیناً دو سال میں ختم ہوا بس آپ کا سارا سرمایۂ علم یہی ہے۔ اور سچ پوچھیے تو یہ بھی بہت کافی ہے اور اس کا علم اصل علم ہے۔

شعر و شاعری کا چسکا روز ازل میں پڑ چکا تھا، ہوش سنبھالتے ہی شعر کی دُھن میں رہنے اور اُلٹے سیدھے الفاظ جوڑ جاڑ کر شعر موزوں کرنے لگے۔ پھر لوگوں کے ساتھ مشاعروں میں جانا شروع کیا۔ پڑھنے کے لیے نہیں صرف سُننے کی غرض سے۔ سُنتے سُنتے اشعار کے معنے مطلب سمجھنے لگے اور (اصل۔) بامعنے کہنے بھی لگے۔ جو کچھ کہتے پہلے اپنے ہمجولیوں کو سُناتے وہ داد دے کر واہ واہ کرکے دل بڑھاتے اسی طرح ان کا حوصلہ روز بروز بڑھتا رہا اور مشق ہو گئی۔ یہانتک کہ زمرۂ شعرا میں داخل ہو گئے۔ اوّل اوّل تو چار چار پانچ پانچ شعر کہتے تھے پھر پوری پوری غزلیں ہونے لگیں۔ خود تو لکھنا آتا نہ تھا اپنا کلام لوگوں سے لکھوا لکھوا کے بڑے شوق سے جمع کرتے رہے جن اشعار کے لکھوانے کی نوبت نہ آتی وہ چند روز میں صفحۂ دل سے اُتر کر بیاض نسیان پر درج ہو جاتے۔ قبل اسکے کہ اس مجموعہ کی (جو اس محنت سے دوسروں سے لکھوا لکھوا کے جمع ہوا تھا) کوئی شہرت ہو یا طبع کی نوبت آتی گردش گیتی نے سنہ ۵۷ء کے فتنہ میں یہ تمام سرمایۂ عمر تلف کر دیا۔ دل پر کیسی چوٹ لگی ہوگی؟ کسقدر صدمہ ہوا ہوگا؟ شاعر کے لیے اس سے زیادہ اور کیا رنج دہ سانحہ ہو سکتا ہے؟ یہی (ان کے لخت جگر اور) یہی پارۂ دل۔ سچ یہ ہے کہ جسقدر صدمہ و رنج ہوا ہو تھوڑا ہے۔ اس ہنگامہ میں نہ صرف یہ مجموعہ ہی ضائع ہوا بلکہ لکھنؤ سے جیسے وطن کو بھی خیرباد کہنا پڑا اور احباب بھی پراگندہ ہوا۔ عزیز و اقارب میں بھی کوئی کہیں جا پڑا کوئی کہیں

لکھنؤ کے بعد خالص پور میں قیام اختیار کیا - یہ گاؤں حضرت تفضل کے بزرگوں کی جاگیر میں ہے اور لکھنؤ سے دس بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے -

یہاں آنے کے بعد نئے افکار اور پیش آنے والے تردداتکی وجہ سے مدت تک شعر و شاعری کا مشغلہ موقوف رہا - اگر کوئی موقع پیش بھی آیا تو غدر کی تباہی سے ایسے متاثر تھے کہ کچھ نہ کہا اور بالکل زبان بند کیے بیٹھے رہے - ایک عرصہ کے بعد جب ذرا اطمینان حاصل ہوا تو دوستوں کے اصرار سے کبھی کبھی ایک آدھ غزل کہہ لیتے اور اپنے صاحبزادے کے سعلموں سے لکھوا کے رکھ لیتے تھے - یہاں تک کہ ایک ایک کرکے ایک اچھا خاصہ مجموعہ تیار ہوگیا - اب جی چاہا کہ یہ چھپ جاے تو بہتر ہے - مگر ساتھ ہی اسکے یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ "مجھ جاہل ناخواندہ کے کلام میں سینکڑوں ہزاروں غلطیاں ہونگی - لوگ اعتراض کرینگے، ہنسیں گے" اب ایک کشمکش میں پڑ گئے اُدھر طبع دیوان کا شوق دامنگیر ادھر یہ خیال عاقبت مآل چھپنے سے مانع - آخر اشتیاق طبع غالب آیا اور بڑے پس و پیش کے بعد یہ خیال کر کے کہ کوتہ نظر جو چاہیں کہیں مگر اہل انصاف میری بے بضاعتی پر نظر کر کے ضرور داد دیں گے" مولوی عبدالعلی صاحب آسی مرحوم مالک مطبع آسی محمود نگر لکھنؤ کے پاس بغرض طبع لیگئے - مولوی صاحب موصوف نے اسے شروع سے آخر تک بنظر تعمق دیکھا اور پوری پوری داد دی کہیں کہیں بعض الفاظ کا رد و بدل بھی کردیا اور قافیوں کی غلطیوں کو بھی بتادیا - پھر خود ہی چھپنے کا انتظام کیا مولوی صاحب کی اس داد دہی بات سے حضرت تفضل نے نیک فال لی اور سمجھ لیا کہ "ہاں اہل نظر ضرور داد دیں گے" چنانچہ سنہ ۱۳۱۷ھ میں یہ دیوان[1] نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے

---

[1] جس حضرات کو ملاحظہ کا شوق ہو آسی پریس محمود نگر لکھنؤ سے طلب فرمالیں - ۸ ر قیمت ہے لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے البتہ کاغذ معمولی ہے - دیکھنے کی چیز ہے -

آسی پریس لکھنؤ میں چھپ کر شائع ہوا۔ یہ دیوان اسوقت ہمارے پیش نظر ہے۔ ۱۸۸ صفحوں پر ختم ہوا ہے۔ شروع میں پانچ چھ صفحے فضل صاحب نے اپنے حالات میں رنگے ہیں جنمیں اپنی جہالت پر بہت کچھ اظہار تاسف بھی کیا ہے۔ اسکے خاتمہ پر یہ شعر درج ہے ؎

غلام ہمت آن شاعران ذی کرم
کہ یک صواب بہ بینند و صد خطا پوشند

اسکے بعد طبع دیوان کی تاریخ میں ایک قطعہ لکھا ہے اور سچ یہ ہے کہ حضرت فضل نے تاریخ بہت خوب نکالی ہے۔ وہو ہذا

مرا یہ نامہ باغ بے خزاں ہو | الٰہی خوش ہوں اس سے جملہ احباب
ہوا تیار جب یہ گلشنِ شوق | کہی تاریخ اسکی "باغ شاداب"

اب غزلوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ردیف الف میں چند غزلیں حمد و نعت اور بزرگان دین کی شان میں ہیں۔ ایک مناجات ہے پھر شاعرانہ کلام ہے۔ اس موقع پر بطور نمونہ کے چند غزلیں بلا انتخاب درج کی جاتی ہیں جو اس ناخواندگی پر بے شک قابل ستایش ہیں۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں۔ میر کی مشہور زمین "شراب کی سی ہے" "حباب کی سی ہے" میں فرماتے ہیں ؎

زیست دنیا کی خواب کی سی ہے | بلکہ دنیا حباب کی سی ہے

میر کے بعد یہ مطلع! فنائے دنیا کا ایسا مرقع ہے!! زبان سے بے اختیار واہ نکلتی ہے۔ سبحان اللہ ایسے ہی اشعار حضرت فضل کی مداحی کرائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان ہی اشعار نے مولوی عبدالعلی صاحب کو ثناخوانی پر مجبور کیا ہوگا۔ اور فرماتے ہیں

رنج ہجراں نہیں ہے دنیا میں | اک نشانی عذاب کی سی ہے
کیا کہوں اور وصف اُس گُل کا | ساری رنگت گلاب کی سی ہے

آتش غم سے دل جلا شاید　　بو تو اس کی کباب کی سی ہے
بہکی بہکی ہے چال یار کی آج　　کیفیت سب شراب کی سی ہے
میرے رونے کو دیکھ کہتے ہیں　　یہ تو بارش سحاب کی سی ہے
فضل کچھ مجھسے بولتے نہیں آپ
یہ نشانی عتاب کی سی ہے

"کفن بگڑا دہن بگڑا" کی طرح میں آتش نے اپنے اُستاد مصحفی سے کہا تھا "اُستاد اس ردیف قافیہ میں کوئی ایک شعر نکال لے تو کلیجا نکل پڑے" حضرت فضل فرماتے ہیں

نہیں مجھ سے اکیلا دوستو وہ گلبدن بگڑا　　اس اپنے عندلیب دل سے ہے سارا چمن بگڑا
سحر کے وقت جب وہ شمع محفل سے جاتا ہے　　نظر آتا ہے دن بھر مجکو رنگ انجمن بگڑا
بگاڑا تو بہت تونے صبا گیسوے جاناں کو　　نہ کچھ بل آیا اُسمیں اور نہ اسکا بانکپن بگڑا
سوال اُس سے کیا جب ڈرتے ڈرتے ایک بوسہ کا　　کہوں کیا کسطرح مجھ سے مرا شیریں دہن بگڑا

"دہن" کے قافیہ پر بھی آتش کو بڑا ناز تھا - ہمارے اَن پڑھ فضل نے جو اپنا نام بھی نہیں لکھ سکتے تھے "دہن" کا قافیہ باندھ دیا - اور "شیریں" کا لفظ اسپر لگاکے پانی کر دیا ماشاء اللہ جس کو آتش سا اُستاد مشکل سمجھے اُسکو حضرت فضل آسان کر کے یوں کہدیں -

"کہوں کیا کسطرح مجھ سے مرا شیریں دہن بگڑا"

تمہارا قد موزوں دیکھکر گلگشت گلشن میں　　دکھائی دیگا قمری کو قد سرو چمن بگڑا
اُڑا کر لیگئی خوشبو صبا جو زلف جاناں کی　　تو اس سے رنگ بوے عنبر و مشک ختن بگڑا
خدا چاہے تو وہ اچھا بنا دے خلق کے آگے
نظر آتا ہے فضل اپنا بھی کچھ طرز سخن بگڑا

تجکو پکارتا پھرا قاتل کہاں کہاں	یہ ڈھونڈھتا ہوا دل بسمل کہاں کہاں

کیا مطلع ہے! کیا روانی ہے!! کیا صفائی ہے!!! سبحان اللہ

فرقت میں ایک لحظہ نہیں دلکو چین ہے — بتلاؤں کیا کہ پھرتا ہوں بیدل کہاں کہاں
اے ہمدمو! تلاش میں اب اُسکی دیکھنا — کرتا ہوا میں جاتا ہوں منزل کہاں کہاں
اُس بیوفا کے عشق میں گھر سے نکال کر — مجھکو پھرائے گا تو اب اے دل کہاں کہاں
دل لے کے تیرا اب وہ نجانے کہاں گیا — پھر ڈھونڈھنے تو جائیگا بیدل کہاں کہاں
صیاد کے خیال سے گلشن کو چھوڑ کر — پھرتے ہیں مارے مارے عنادل کہاں کہاں

اب آستان یار پہ اے فضل جم کے بیٹھ
پھرتا ہے در بدر تو اے غافل کہاں کہاں

ان آنکھوں نے دیکھے جواں کیسے کیسے — ہوے اس جہاں سے رواں کیسے کیسے
لڑکپن سے ابتک ان آنکھوں کے آگے — ہوے انقلاب جہاں کیسے کیسے
نہیں اُس ستمگر کے مژگان وابرو — ہیں دشمن مرے بیگماں کیسے کیسے
ہیں عاشق کے لب خشک ترچشم تن زرد — یہ سب عشق کے ہیں نشاں کیسے کیسے
گل و ماہ و آئینہ و شمع و خورشید — ہیں چہرے پہ انکے گماں کیسے کیسے
شہیدان شمشیر ناز و ادا کو — ملیں گے ارم میں مکاں کیسے کیسے

ہے افسوس افسوس فضل اس جہاں سے
گئے خاک میں گلرخاں کیسے کیسے

تیرا جبدم خیال آتا ہے — دین و دنیا کا غم بھلاتا ہے
اسکو کھٹکا کہاں ہے محشر کا — سر تسلیم جو جھکاتا ہے

دل تڑپتا ہے جان جاتی ہے جب وہ پہلو سے اُٹھ کے جاتا ہے
چاہتا ہے جسے دکھا کے جھلک اپنا دیوانہ وہ بناتا ہے
وہی پاتا ہے شاہد وحدت اپنی ہستی کو جو مٹاتا ہے
دل کی آنکھوں سے ڈھونڈتا جو ہے وہی اے یار تجھکو پاتا ہے

بھول جاتا ہے فضل وہ سب کو
اُس صنم سے جو دل لگاتا ہے

دیوان کی اکثر غزلیں اسی رنگ کی اور بعض اس سے بہتر ہیں۔ بعض بعض بہت مشکل زمینوں میں ہیں۔ بعض بہت بڑی بڑی ہیں چنانچہ ایک غزل میں ۸۴ شعر ہیں ہم نے طوالت کے خیال سے انکو قلم انداز کر کے صرف چار چھوٹی چھوٹی غزلوں پر اکتفا کی۔ اور انتخاب ایک شعر کا بھی نہیں کیا۔ ایک تذکرہ میں عمدہ عمدہ شعروں کا انتخاب ہم اس لیے ناپسند کرتے ہیں کہ اس سے شاعر کی اصلی حالت اور قوت کا اندازہ نہیں ہوتا بلکہ واقعیت سے زیادہ شاندار رخ نظر آنے لگتا ہے۔ اور یہ بات سوانح نگار کے فرائض سے بعید ہے کہ اصل مرقع کو اپنی رنگ آمیزی سے خوشنما کر کے پیش کرے۔

آخر دیوان میں مولوی عبدالعلی صاحب آسی مرحوم نے اور مولوی محمد صاحب[1] مدرس عربی مدرسۂ فرقانیہ لکھنؤ نے قطعات تاریخ لکھ کر حضرت فضل کی بہت کچھ تحسین کی اور حوصلہ بڑھایا ہے۔ لیکن ان حضرات کی تحسین سخن شناسانہ ہے اسمیں ہم بھی اُن کے ہم آہنگ و ہم خیال ہیں۔

محبوب علی لکھنوی

[1] مولوی صاحب موصوف عربی علم ادب میں اعلےٰ درجہ کی مہارت رکھتے ہیں۔ آپ کی عربی نظمیں اور قصائد نہایت فصیح و بلیغ ہوتے ہیں مصر وغیرہ کے ادبی پرچوں میں آپکی نظمیں اشاعت پذیر ہو چکی ہیں۔ آپ مولانا حاجی عین القضاۃ اجلۂ کے تلامذہ میں سے ہیں اور مولوی عبدالعلی صاحب آسی مرحوم کو ہر شخص پہچانتا اور انکی لیاقت و سخن شناسی کو جانتا ہے ۱۲

خیال یار

میں کیونکر عشق کا آزار چھوڑوں / تجھے کس پر دل بیمار چھوڑوں
اُٹھایا ہاتھ جب دونوں جہاں سے / بھلا کیونکر در دلدار چھوڑوں
نہیں قابو میں دل اپنا الٰہی / میں کیونکر گریہ خونبار چھوڑوں
میں چھوڑوں کسطرح فریاد و شیون / میں کیونکر آہ آتشبار چھوڑوں
کوئی آنکھوں میں میری پھر رہا ہے / میں کیونکر حسرت دیدار چھوڑوں
سر شوریدہ ٹکراؤں کہاں پر / اگر میں یاس کی دیوار چھوڑوں
قسم ہے اپنی ہی وحشت کی مجکو / گریباں میں جو کوئی تار چھوڑوں
نہیں ممکن مرے جوش جنوں سے / کہ سیر وادی پرخار چھوڑوں
رہے اُس بت سے لطف ہمکلامی / میں کیونکر لذت گفتار چھوڑوں
ہوئی مدت بتوں کو پوجتا ہوں / میں کیونکر رشتۂ زنار چھوڑوں

نہیں ممکن ہے جیتے جی یہ باسط
کہ دامان خیال یار چھوڑوں

باسط بسوانی

ضروری گذارش

"تمدن" بلا طلب جن حضرات کی خدمت میں نمونتاً یا کسی معزز دوست کی تحریک سے پہنچے براہ کرم فوراً اپنے ارادۂ خریداری سے مطلع فرمائیں ورنہ خاموشی رضامندی سمجھی جائے گی اور دوسرے ماہ میں اُنکا نام درج رجسٹر کر کے تیسرے ماہ کا پرچہ ذریعہ وی پی بھیجا جائیگا جسکا وصول کرنا اُن کا قومی اور اخلاقی فرض ہوگا۔

جو حضرات "تمدن" کی عمر کے پانچویں سال کے اختتام یعنی ۱۷ اپریل تک "تمدن" کو چار مستقل خریدار عنایت فرمائینگے اُن کی خدمت میں ایک سال کے لیے "تمدن" مفت حاضر ہوگا۔ جو صاحب دو مستقل خریدار عنایت فرمائیں گے اُنکے پاس چھ ماہ تک پرچہ مفت حاضر ہوگا۔

ابر مردہ

جسے اسفنج بھی کہتے ہیں۔ اس کی ماہیت کے متعلق اکثر کا خیال ہے کہ یہ سمندر کا جھاگ ہے اسکا رنگ خاکی نما ہوتا ہے دہلی میں ایک سوداگر کی دوکان پر ایک کاغذ کے پاٹن میں قریب ایک درجن کے ٹکے ہوے تھے۔ دور سے اُن کا رنگ کھیے جاتا تھا۔ آگے بڑھا اور سوچا کہ ان میں سے ایک ضرور خریدوں گا۔ ابھی دکاندار سے سلسلۂ کلام شروع بھی نہ کیا تھا کہ لوگ آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک کے سوا سب فروخت ہوگئے۔ میں نے دل میں کہا سچ ہے واقعی دنیا مردہ پسند ہے ایک رہ گیا تھا اسکا سودا میں نے کرلیا اور گھر واپس چلا آیا۔ رات کا وقت مجھے کا ہوتا ہے ضروری مشاغل سے فرصت مل جاتی ہے۔ پس میں ایک عمل پڑھا کرتا ہوں اور جس چیز سے مجھے کلام کرنا ہوتا ہے اُسے سامنے رکھ لیتا ہوں۔ یہانتک کہ وہ چیز خواہ جاندار ہو یا بیجان نباتات میں سے ہو یا جمادات میں سے میرے سوال کا جواب دینے لگتی ہے آج ایک

ننھی سی لاش

ابر مردہ کی میرے سامنے تھی۔ اسکا جسم کسی ظالم نے چھلنی کردیا تھا۔ مجھے تفتیش کی ضرورت ہوی چنانچہ وہ عمل پڑھ کر عالم تخیل میں جا پہنچا۔ اور اس نعش سے مخاطب ہوکر کہا۔ او جنس خاموش۔ آہ تجھے کس بیدرد نے گھائل کیا ہے اُدھر اسرار کہ سچ بتا دے تیرے مرنے کے بعد یہ گرم بازاری کیوں تھی۔ یہ سن کر ابر مردہ مسکرایا اور کہا تمھارے دو سوال ہیں ان کا ایک جواب دوں یا دو۔

میں نے کہا نہیں فرداً فرداً جواب دینا ہوگا۔ کہا پہلے سوال کا تو یہ جواب ہے کہ میں کسی

کی تیر نظر کا

زخمی ہوں

اُس ظالم نے مشق ستم کے لیے میرا سینہ ہی منتخب کیا۔ میرے شفق کیفیت یہ ہے کہ زخم تو کھا یا کیا لیکن ایک لذت بھی پیدا ہوتی رہی ہر اُس تیر کے ساتھ جو جگر میں پیوست ہو جاتا تھا۔ دہن زخم سے مرحبا کی صدا نکلتی تھی آخر مَیں نے کہہ بھی دیا

تیر چن چن کے ترے کیوں نہ جگر میں رکھ لوں
کس مزے سے یہ اُڑاتے ہیں نشانہ دل کا

جب اچھی طرح زخمی ہو گیا تو امانت عشق۔ قطرات محبت کا حامل بن گیا۔ اور تم بھی دیکھو وہ فطرت نے مجھے تفویض کر دیا ہے۔ پس یہ سینے کی غربالی میرے لیے عید ہے نوید ہے آپ افسردہ نہ ہوں۔

رہا دوسرا سوال۔ میری چاہت کیوں ہے اسکا جواب آپ نے خود ہی دیدیا ہے کہ دنیا مردہ پسند ہے مگر میں اسمیں اتنا اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ کہ مردہ میں بشرطیکہ کوئی کمال رہ چکا ہو۔ اہل اللہ کے مزارات پر عوام الناس کی حاضریاں زیادہ تر فیض کی خاطر ہوتی ہیں۔ میاں اُس مرنے والے کو یاد کیا جاتا ہے جس کے اوصاف زندگی میں دوسروں کو فائدہ پہنچا چکے ہوں۔ ہاے

چودھویں صدی

کے لوگوں نے ہنر کو عیب سمجھ رکھا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ ہم جسکے مقلد ہیں وہ باہنر ہے اور ہمارے ہی وطن سے سیکڑوں ہی روپیہ اسی ہنر کی بدولت کھینچ چکا ہے۔ دنیا ہنرمند کی قدردان ہے زندہ اگر بے ہنر ہے تو اسکی پوچھ نہیں پس بے ہنر مردہ کی کیسے پوچھ ہو سکتی ہے۔ یوں کہو دنیا مردہ پسند نہیں مطلب پرست ہے۔ تم نے یہ نہ دیکھا

کہ میری مانگ ہے میری قدر ہے میں ہاتھوں ہاتھ فروخت بھی ہو گیا لیکن یہ بھی کبھی غور کیا

کہ کیوں؟ نادان دوست۔ مجھ میں ایک قوت ہے اور اُسکا نام جذب ہے۔ میری قدر نہیں۔ میرے جذب کی قدر ہے۔ میں آپ کو مشاہدہ کرا سکتا ہوں۔ امتحاناً ایک گلاس پانی کا لائیے اور اُسمیں مجھے ڈالدیجیے پھر تماشا دیکھیے کتنا پانی چوس لیتا ہوں دنیا تو اس بات کی قدر کرتی ہے۔ آہ دل پر اک چوٹ لگی۔ ابر کے ٹکڑے نے

تصوف کے مراحل

طے کر دیے۔ انسان کامل بیشک وہی ہے جسکا جگر تیر عشق سے چھد چکا ہو۔ ایک بیکلی ہو۔ جو کل نہ آنے دیتی ہو ایک خلش ہو جو بار بار کھٹکتی ہو۔ ہرے ہرے زخم ہوں اور میرے سینے کا کھیت ہو۔ لوگ کہیں سرسوں پھولی ہے۔ کیا بسنت کے دن آگئے ہاں وہ بارہ مہینے دیکھیں اور یہاں بسنتی موسم نظر آئے۔ میرا دل ایک پھول ہے اسے وحدت مکھی کہتے ہیں سورج مکھی کا رخ سورج کی طرف رہتا ہے اور اسکا رخ ہمیشہ میری شہ رگ کی جانب۔ میں یہی دعا مانگتا ہوں کہ کسی کے تیر نظر کا صدقہ مجھ میں جذب پیدا ہو جائے۔ جسکو دیکھوں وہ میرا نہیں تیرا ہو جائے روحانی کشش کی خیر جس کے دم سے اسلام کا بول بالا ہوا۔ آئینہ دل کی جے۔ جسکی جِلا نے عالم انسانیت کو متحیر کر دیا۔ چشتی تصوف کے تاجدار حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر لاکھ لاکھ بار رحمت و برکت ہو۔ نقشبندی تصوف کے چمکتے ہوئے گوہر حضرت صدیق اکبرؓ پر انوار الٰہی کا مینہ برسے۔ جنکے سلسلے کی لاکھوں کڑیاں اسلام کے لیے مایۂ ناز ہوئی ہیں۔ اور اس ابر مردہ کی حیات پر جو میرے لیے سبق آموز ہوا۔

مقرب حسین مقرب دبیر حلقہ نجات دہلی

حضرت رسا ہمدانی گیاوی

رباعی

اُس شوخ نے کی نہ قدردانی میری — ضائع ہوئی ہائے جانفشانی میری
ٹھوکر سے مٹا یا نقش تربت میرا — وہ بھی نہ رہی جو تھی نشانی میری

پردہ نسواں

رسالہ "تمدن" میں پردے اور تعلیم کے متعلق ایک مختصر سا مگر نہایت موزوں مضمون والدۂ ممتاز حسین کے قلم کا لکھا ہوا میری نظر سے گذرا۔ میں چاہتی ہوں کہ اُسپر کچھ اپنی ناچیز رائے کا اظہار کروں۔

جہانتک میرا خیال ہے۔ میں کہہ سکتی ہوں کہ مشرقی لوگوں میں بہت کم ایسے آدمی نکلیں گے جو اپنے سے مخالف رائے رکھنے والے کی بات سُننے کے متحمل ہونگے اور جو رائے وہ پیش کرے اُس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے۔ معلوم نہیں کہ انھوں نے مخالفت کو کیوں ایسا ہوا سمجھ رکھا ہے۔ جبکہ سعدی سے زبردست فلاسفر کا قول ہے کہ ؂

گو دشمن شوخ چشم وبیباک تا عیب مرا بمن نماید

درحقیقت مخالفت ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے کسی مسئلہ کا عیب و ثواب عوام پر بخوبی روشن ہو جاتا ہے۔ یہی وہ بھٹی ہے جسمیں پڑکر مسئلہ کا کھرا ہوتا اپنی پوری آب و تاب سے چمک جاتا ہے۔ یہی وہ کسوٹی ہے جسپر کھرا کھوٹا۔ پرکھا جاتا ہے یہی وہ چھلنی ہے جس سے کوڑا کرکٹ گرد و غبار پاک ہو جاتا ہے۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ میری تحریر کو کسی دیگر خیال سے نہ دیکھا جاے گا۔ ہاں جو کچھ میری تحریر کے جواب میں اُس کے خلاف لکھا جائے گا۔ میں نہایت خوشی کے ساتھ دیکھوں گی اور اس کا حتی الامکان موزوں جواب دینے کی کوشش کروں گی۔

پردے کے حامی لوگ پردے کی تائید میں مدت سے بہت کچھ لکھتے آئے ہیں اور پردے کی تائید اور اسکو عمل میں لانے کی نہایت سختی کے ساتھ تاکید کی جاتی ہے لیکن شاید وہ اس سے

ناواقف ہیں کہ عورتوں سے جتنی سختی کے ساتھ پردے کی پابندی کرائی جائے گی اُسی قدر مردوں کے اخلاق کی توہین کھلے الفاظ میں ہوگی اور اس سے زیادہ عورتوں کا اخلاق کمزور ثابت ہوگا چونکہ عرصۂ دراز سے مردوں کے ہاتھ میں قلم رہا ہے اس لیے انھوں عورت ذات پر دل کھول کر الزام لگائے ہیں اور پیٹ بھر کر اس کی توہین کی ہے کہیں اس کو ناقص العقل کہا ہے۔ کہیں اسکے اخلاق پر حملے کیے ہیں۔ کہیں اسکو مردوں کی غلام لکھا ہے اور اسی قسم کے عیب ظاہر کیے ہیں۔ عورتیں بیچاری یہ سب باتیں سُنتی ہیں اور خاموش ہیں۔ مردوں کا مقابلہ کون کرے یہ تعلیم یافتہ صاحب علم وفضل۔ ہم جاہل مطلق۔ ناقص العقل تو آپ ہے آپ ہیں۔ ہمارے جاہل رکھنے میں بھی مردوں کا ہی ایک ناقابل معافی تصور ہے۔ کیونکہ اگر ہم تعلیم یافتہ ہوں گے تو مردوں سے اپنے واجبی برابر کے حقوق مانگیں گے۔ جنکو وہ دینا کسرشان سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہم تو خودمختاری کے ساتھ جو چاہیں کریں۔ مگر عورت ایک کاٹھ کی پُتلی کی طرح یا ربڑ کی گڑیا کی مثال۔ روٹی۔ کپڑا بھی ہم سے نہ مانگے تو بہت ہی اچھا ہے ہم دنیا کی تروتازہ ہوا کھائیں۔ ہر جگہ جائز ناجائز مجمع میں بیٹھکر دل بہلائیں۔ مگر عورت گھر کی چار دیواری میں پردے کے اندر قید رہے نامحرم عورت بھی اندر نہ جاسکے کیا خوب۔ گویا ہم طوطے مینا کی طرح پنجرے میں بند رہ کر اُنکو میٹھی میٹھی بولیاں سُناتے رہیں اور مرد ہم کو ایک خاص وقت پر خاص قاعدے سے دانا پانی دیں۔ اور اگر ممکن ہو سکے تو اس سے بھی چشم پوشی کر جائیں۔ سبحان اللہ کیا انصاف ہے۔ کیا ایمانداری ہے۔

خالقِ دنیا نے پردہ آنکھوں کو اور پاکیزگی دل کو عطا فرمائی ہے۔ اور شرم و حیا کا مسکن نگاہ میں بنا دیا ہے۔ عورت کے پردے کی حد بس یہیں ختم ہو جاتی ہے۔

اگر دل پاکیزہ نہیں شرم وحیا آنکھوں سے دور ہے تو ہزار پردے اور وہ بھی موٹے موٹے ٹاٹ کے بے فائدہ ہیں۔ کیا ایسے موٹے موٹے پردوں میں سوراخ کرنے والیاں موجود نہیں ہیں۔ اور اگر دل پاک ہے۔ نگاہ میں شرم وحیا ہے تو یہ سارے پردے بیکار ہیں۔ اخلاق عورت کو بیشک پاکدامنی سکھاتا ہے۔ نہ کہ موٹا کپڑا پردے کی جگہ لٹک کر عصمت یابی تپائے گا۔ یہ ظاہری پردہ بالکل ناچیز ہے جبکہ باطن درست ہے۔ چونکہ عورتیں بہت دنوں سے پردے کی قید میں رہتی چلی آئی ہیں۔ اسلیے وہ بھی ملک چین کے پچاس سالہ قید کی طرح۔ اس قید کو ہی بہتر سمجھنے لگی ہیں جس نے اُن کے اخلاق پر کمزوری کا الزام لگا یا صحت جسمانی کو اتنا بگاڑ دیا کہ میل بھر تک چل نہیں سکتیں۔ دنیا کی تازہ ہوا۔ سیر و تفریح سے علیحدہ محروم کر دیا۔ الہی خیر۔ پردہ انہوا۔ وبال جان ہوگیا۔ یہ عورتوں کے اخلاق کی بردست توہین ہے

درحقیقت یہ پردے کا شدید طوفان مردوں کی اخلاقی کمزوری کا نتیجہ ہے۔ مردوں کو پردے کی حمایت کرتے ہوئے بے انتہا شرم آنی چاہیئے۔ کہ ہم ڈھٹائی سے پردے کی تاکید نہیں کرتے ہیں بلکہ اپنی اخلاقی کمزوری کا اظہار کرتے ہیں کیونکہ مردونکی طبیعت شکیہ زیادہ واقع ہوی ہے۔ اور اسیطرح وہ اپنے خیال کے بموجب عورتوں پر بھی قیاس دوڑاتے ہیں یہ مثل مشہور ہے آپ بھلا تو جگ بھلا۔ میرا خیال ہے کہ عورتوں میں فیصدی پچھتر ایسی نکلیں گی جنھوں نے اپنے خاوند کے علاوہ غیر مرد کا خیال۔ خواب میں بھی کبھی نہ کیا ہوگا۔ مگر مرد ذرا اپنے سینہ پر ہاتھ رکھکر ایمان سے کہدیں کہ اُن میں فیصدی کتنے ایسے نکلیں گے جنھوں نے اپنی زوجہ مشفقہ کے علاوہ کسی غیر عورت کو بری نگاہ سے نہ دیکھا ہو۔ پس عورتوں کی پاکیزہ خیالی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا ایسے پاکیزہ دل اور خیال والے لطیف عنصر کو پردے کی قید میں رکھکر اسکی ساری خوبیوں کا ضائع کردینا۔ مردوں کی ضرورت سے زیادہ عقلمندی کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

ورنہ عورتیں اصلیت میں پردے سے راضی نہیں۔ یوں مُنھ دیکھی بات۔ کسی خاص مرد کے دباؤ سے کہدیں تو کہدیں۔ میں نے اکثر موقع پر عورتوں کو بارکش گاڑیوں۔ پالکی گاڑیوں وغیرہ میں شہر سے باہر جاتے ہوئے دیکھا ہے اور آبادی سے دور جاکر وہ گاڑیوں سے اُتر جاتی ہیں اور پیدل چلتی ہیں۔ جس کی وہ مدت سے شائق تھیں۔ لیکن کمزوری کے باعث تھوڑی دور چل کر ہانپ جاتی ہیں۔ گو جی گاڑی میں بیٹھنے اور اس کے پردوں میں قید ہونے کو نہیں چاہتا مگر مجبور بیچاریاں کیا کریں۔

علاوہ مسلمانوں کے ہندوستان سے بڑے ملک میں اور قومیں بھی آباد ہیں لیکن ان کے ہاں پردے کا یہ زور شور نہیں ہے اور خوبصورتی بدصورتی سب قوموں میں پائی جاتی ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اُن کی عورتیں زیور عصمت و عفت سے عاری ہیں۔ علاوہ نیچ قوم کے۔ ہندوؤں۔ پارسیوں میں عموماً پردے کا نام و نشان نہیں۔ لیکن عصمت و عفت میں کہیں فرق نہیں آتا۔ مسلمانوں کے ہاں کی عورتیں کچھ عنقا صفت نہیں۔ نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا سے زیادہ خوبصورتی انکے ہی حصے میں آئی ہے۔ پھر خوبصورتی کوئی عیب نہیں۔ اخلاق درست ہونے چاہئیں۔ نگاہ پاک بین ہو۔

مردوں کو لازم ہے کہ پہلے اپنے اخلاق درست کریں یہ اُس سے بہتر ہے کہ عورتوں کو پردے کی تاکید کریں۔

اُم یوسف

ریویو

ایک ناول بنام "دغا" ہمارے پاس ریویو کے لیے آیا ہے جسکو جناب قاضی محمد محمود صاحب حسینی انصاری وڈنبری گریجویٹ نے تصنیف کیا ہے۔ ناول کا طرز بیان عام ناولوں سے بہت کچھ جداگانہ اور دلچسپ ہے۔ اسمیں بازاری عورتوں کی مکاریوں، بعض تقدس نما لوگوں کی ریاکاریوں کا پلاٹ پیش کیا گیا ہے۔ یہ ناول نمبر ۱۲۷۔ امین آباد پارک لکھنؤ کے پتہ پر مصنف سے طلب کیا جاسکتا ہے۔ قیمت ۶ر تقطیع ۱۸-۲۲ صفحہ ۷۵)

حُسنِ سعادت

(۱)

جمیلہ نہایت سنجیدہ دوراندیش اور سمجھدار لڑکی تھی صورت شکل کے لحاظ سے خاندان میں امتیازی درجہ حاصل تھا اُس نے انھیں امورخانگی کی تربیت پائی تھی جو وضیع و شریف گھرانے کی رسم ہے سینے پرونے کھانے پکانے کے علاوہ انتظام تقریبات میں کامل دخل رکھتی تھی بُردباری اور سنجیدگی کا یہ حال تھا کہ کمسنی ہی سے پڑوس کی عورتیں اور ہم عمر ہمجولیاں پورا پورا ادب کرتی تھیں۔

گو ابھی ایوان ہستی کی سولھویں منزل سے شباب کے لہلہاتے ہوے باغ کی ولولہ انگیز و مسرت بخش ہوا کھا رہی تھی لیکن اُس نے اس موقع پر بھی اپنی متانت کا کافی ثبوت دیدیا تھا اور جس طرح اس سن میں فطرتاً شوخی شرارت پیدا ہوجایا کرتی ہے اُسمیں نام کو نہ تھی والدین نے چھوٹے سے سن میں اُسکی شادی قرابت داری میں کردی تھی جہاں طفلی کا زمانہ پابندی سے بسر کرنا پڑا۔

جمیلہ دوسری لڑکیوں کی طرح دوڑ دھوپ کے کھیلوں سے الگ رہی اپنی سہلیوں کو کھیلتے کودتے اور آپسمیں چہلیں کرتے دیکھتی تھی مگر خود شرکت نہ کرسکتی تھی کیونکہ اسکی خوشدامن کا مزاج بہت سخت واقع ہوا تھا۔

اگرچہ جمیلہ کو آئے دن تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ اپنی ساس کی ممنون احسان تھی کیونکہ اسکی ناگوار روک ٹوک نے جمیلہ میں صبر و تحمل کا مادہ پیدا کردیا اور وہ ان سختیوں کو نہایت آسانی اور سکون سے برداشت کرنے کے قابل ہوگئی جمیلہ جوں جوں بڑھتی تھی اسکی ذات میں خوبیاں جمع ہوتی جاتی تھیں جوانی کے

پُرکیف وپُرفضا میدان میں قدم رکھکر اس نے تین باتوں کو اپنا فرض منصبی قرار دیا "عبادت خدا" "اطاعت شوہر" "بزرگوں کی رضاجوئی"۔

یہ جوہر ایسے تھے جنھوں نے ہر اپنے پرائے دل میں گھر کر لیا تھا خاندان کی چھوٹی بڑی عورتیں اسکی عزت وحرمت کرتیں اور اسکی خوشدامن کی بدمزاجیوں پر دل ہی دل میں نفرین کرتیں لیکن اس بات نے سب کو استعجاب میں ڈال رکھا تھا کہ باوجود بعض ہمسن لڑکیوں سے بے انتہا خلط ملط کے بھی جمیلہ نے اپنی غصہ ور ساس کی شکایت نہ کی۔

(۲)

قیصر غیور شجاع اور خلیق لڑکا تھا اس نے زمانہ طفلی اور لڑکوں کے مانند کھیل کود کر بسر نہ کیا تھا بلکہ گرانبہا وقت تحصیل علم اور اچھی باتوں کے سیکھنے میں صرف کیا تھا اسمیں اُن باتوں کی کافی صلاحیت موجود تھی جنکے سیکھنے سے انسان معراج ترقی کے حدود تک پہنچ جاتا ہے یہی وجہ تھی کہ چودہ برس کی عمر میں عربی فارسی سے فارغ التحصیل ہو کر علوم مغربی حاصل کرنے میں مشغول ہوا۔

قیصر کے والدین خدا کی دی ہوئی نعمت (قیصر) پر فخر ومباہات کرتے تھے جو درست وبجا تھی انھوں نے اپنے ہونہار صاحبزادہ کا [illegible] جمیلہ کے ساتھ کردیا لیکن علوم مغربی کی جانب قیصر کی [illegible] میں نام لکھوا دیا جہاں تین چار برس پڑھنے کے بعد اس [illegible] قصد ظاہر کیا۔

قیصر کا قاعدہ تھا جب اسکول سے واپس آتا تو ہاتھ منھ دھوکر دو ڈھائی میل پیدل چل کر تفریح کرتا اور چراغ جلے گھر واپس آکر کھانا کھاتا پھر کمرے میں بیٹھکر اپنی نیک نہاد مطیع بیوی سے خوش مزاجی کی گفتگو کرتا اسے جمیلہ کی بھولی

بھائی باتوں سے دلی مسرت حاصل ہوتی اکثر بارہ بارہ بجے رات تک اُسکی سادہ او
شیریں باتوں سے دل بہلایا کرتا۔

جمیلہ کی نیک اطواری نے قیصر کے دل پر پورا پورا قبضہ کرلیا تھا جسکی وجہ سے قیصر اسکی خوشی کا جویا رہتا تھا اُس نے اکثر والدہ کو اشاروں کنایوں میں سمجھایا کہ وہ بدمزاجیاں چھوڑدیں لیکن خلقی عادت نہ چھوٹنا تھا نہ چھوٹی اور قیصر تنگ ہوکر خاموش ہوگیا۔

قیصر کی عمر بیس برس کی ہوچکی تھی اسے صرف بی۔اے کا امتحان دینا باقی تھا جسکی ہوس دل کو بیچین رکھتی تھی لیکن ساتھ ہی یہ بھی خواہش تھی کہ علیگڈھ جاکر امتحان دیا جائے اس نے کہہ سُنکر منت سماجت سے والدین کی اجازت حاصل کرلی تھی مگر علیگڈھ جانے کی کوئی تاریخ نہ مقرر کی تھی تاہم ہفتہ عشرہ میں ارادہ سفر تھا۔

تاریخ معین نہونے کا قوی سبب یہ تھا کہ قیصر جمیلہ کو ناخوش کرنا چاہتا تھا اسے جو کام کرنا منظور ہوتا موقع محل دیکھکر جمیلہ سے صلاح ومشورہ کرتا اور بہ لطائف الحیل راضی کرلیتا اس بارۂ خاص میں جمیلہ سے گفتگو کرنے کا موقع نہ پاکر تاریخ روانگی کی ن

(۳)

ں ہے شام کا دلفریب منظر دیکھتا ہوا قیصر گھر آیا حسب معمول بی امورخانہ داری میں مصروف پاکر کمرے میں چلا گیا۔

یہاں کا فرش فروش اور سامان آرایش ایشیائی طرز کا تھا کمرے کی سجاوٹ میں بڑے اہتمام اور تکلف سے کام لیا تھا لیکن سادگی وضعداری کو فراموش نہ کیا تھا تختوں کے چوکے پر مکلف سفید چاندنی اور صدر میں اونی غالیچہ مع گاؤ تکیہ کے موجود تھا

ایک ولایتی بڑا لیمپ مسند کے برابر روشن تھا۔

قیصر نے شیروانی اُتار کر کھونٹی پر ٹانگی اور الماری سے ایک اخلاقی کتاب نکال کر مطالعہ کرنے لگا اُسے ایک وحید روزگار حکیم کا یہ قول نہایت بھلا معلوم ہوا۔ علم وفن اگر فوائد عام کے لیے حاصل کیا جائے تو اصلی مسرتوں کا موجب ہے اُس نے بار بار اس عبارت کو پڑھا اور لوح دل پر کندہ کرلیا اخبارات میں اکثر لمبے چوڑے مفید عام مضامین لکھے دیکھے تھے لیکن تحقیق کرنے سے ثابت ہوگیا کہ اسکے لکھنے والوں میں بہت ایسے بھی ہیں جنکی مثال دورخی تصویر ہے کہ دوسروں کے واسطے ناصح مشفق ہیں مگر اپنے افعال شنیعہ کی خبر نہیں۔

جمیلہ کاموں سے فراغت پاکر کمرے میں داخل ہوئی اور قیصر سے مخاطب ہوکر بولی

جمیلہ۔ آج خلاف قاعدہ دیر تک کہاں رہے۔

قیصر۔ میں تو ٹھیک وقت پر آگیا لیکن تمھیں ضرورت سے زیادہ کاموں میں مشغول رہنا پڑا شاید کوئی نیا گُل کھلا۔

جمیلہ۔ تم ان باتوں کا خیال نہ کیا کرو امّی جان ہماری سرتاج ہیں جو جاہے کہیں اُنکا کچھ فرمانا ہماری عین عزت کا باعث ہے رنج صرف [illegible] کہ غصہ کرنے سے انھیں تکلیف پہنچتی ہے جو ضعیفی میں [illegible]

قیصر۔ شاباش تمھاری ہمت اور فرمانبرداری پر [illegible] ناراض ہونا ناگوار گذرتا ہے ہر مرتبہ جواب دینے کا قصد کرتا ہوں [illegible] حقوق زبان بند کردیتے ہیں

جمیلہ۔ دانتوں میں اُنگلی دبا کر افسوس کوئی خورد بزرگوں کی نسبت ایسا ناروا قصد کرتا ہے تمھارے اس خلاف تہذیب خیال نے مجھے نہایت صدمہ پہنچایا آئندہ احتیاط رکھنا

قیصر۔ ندامت سے واقعی میری زبان سے ایسا فقرہ نکلگیا جو نافرمانی کا پہلو لیے تھا لیکن انسان بھول چوک سے خالی نہیں خطائیں ہو جایا کرتی ہیں مگر ارباب اخلاق ازراہ مروت معاف کرتے ہیں۔

جمیلہ قیصر کو شرمندہ دیکھکر خاموش ہو رہی کسی طرح گوارا نہوا کہ قیصر کو بار بار غلطی یاد دلا کر افسردہ کرے اسلیے تھوڑے سکوت کے بعد گفتگو کا رخ بدل کر کہا۔

جمیلہ۔ آج ابھی تک تمہیں بھوک نہیں معلوم ہوی نو بجا چاہتے ہیں پھر سبق کب یاد ہوگا۔

قیصر۔ تمہاری باتوں میں نہ کہہ سکا حالانکہ آج سویرے سے اشتہا تھی۔

جمیلہ نے ماما کو پکار کر کھانا لانے کا حکم دیا تھوڑی دیر بعد دسترخوان چنا گیا دونوں میاں بیوی نے ساتھ نوش جان کیا کھانے سے فراغت کرکے ہاتھ منھ دھوئے پھر دونوں کتابیں لے کر روشنی کے پاس بیٹھے گیارہ بجے رات تک مطالعہ جاری رہا ادھر گھڑی نے گیارہ بجائے اُدھر دونوں اپنے اپنے پلنگ پر دراز ہوئے حسن اتفاق سے آج دونوں کی آنکھوں سے نیند اُڑ گئی لاکھ لاکھ کوشش کی بن کے لیٹے کروٹیں بدلیں مگر خواب کا کالے کوسوں پتا نہ تھا بارہ بج گئے [illegible] کی بھیانک صدائیں (جاگتے رہو کھنکھارتے رہو) [illegible] لگیں مگر ان دونوں کو نیند نہ آئی قیصر آنکھیں کھولکر [illegible] غور کرنے لگا اسے یاد آگیا کہ آج بھی جمیلہ سے علیگڑھ جانے [illegible] کرنا بھول گیا اتنے میں جمیلہ نے کروٹ بدلی۔

قیصر۔ آہستہ سے۔ کیا سو رہی ہو۔

جمیلہ۔ آج نیند اُچٹ گئی جب سے پڑی کروٹیں بدل رہی ہوں تم تو سو گئے تھے۔

قیصر۔ عجب اتفاق ہے میرا بھی بالکل یہی حال ہے نیند کے خیال میں آنکھیں

بند کیے لیٹا رہا مگر غنودگی تک نہ آئی آخر چپ پڑے پڑے دل گھبرانے لگا۔
جمیلہ۔ اکثر رات کو خاموشی میں اُلجھن ہونے لگتی ہے باتیں کرو طبیعت بہل جائیگی
قیصر۔ تم سے ایک بارہٗ خاص میں رائے لینا ہے کئی روز سے قصد تھا لیکن کہہ نہ سکا۔
جمیلہ۔ کہو جو میری سمجھ میں آئے گا ظاہر کردوں گی۔
قیصر۔ میرا قصد ہے وکالت پڑھوں۔
جمیلہ۔ نہایت پاکیزہ خیال ہے۔
قیصر۔ لیکن پہلے بی۔اے کی ڈگری حاصل کرنا ہوگی۔
جمیلہ۔ پھر مانع کون ہے۔
قیصر۔ تمھاری جدائی۔
جمیلہ۔ کیا باہر جانا ہوگا۔
قیصر۔ ہاں قصد ہے علیگڈھ جاکر امتحان دوں۔
جمیلہ۔ اگرچہ تمھارے جانے سے بیحد ملال ہوگا طبیعت پریشان رہے گی لیکن میں ان جملہ مشکلوں میں صبر سے کام لوں گی تم شوق سے جاؤ ہاں ہر تیسرے روز اپنی خیریت سے اطلاع دیتے رہنا۔
قیصر۔ مجھے بھی مفارقت شاق ہے مگر دنیا میں رہ کر کچھ بن نہیں پڑتا ابا جان اور اماں جان سے تو پہلے ہی اجازت حاصل کر چکا صرف تم سے دریافت کرنا باقی تھا اب انشاءاللہ اسی ہفتہ میں تیاری کر کے چلا جاؤں گا البتہ وہاں کے قیام میں دھڑکا لگا رہے گا۔ اماں جان یوں ہی تم سے لڑا جھگڑا کرتی ہیں میرے جانے کے بعد تو خدا جانے کیا کچھ نہ کریں
جمیلہ۔ تمھیں ان باتوں سے کیا سروکار جیسا ہوگا سمجھ لوں گی تم سدھارو۔

(باقی آیندہ)

مرزا فدا علی خنجر لکھنوی

اعراب جاہلیت کا سالانہ مشاعرہ

(بسلسلہ اشاعت سابق)

جس طرح امرءالقیس نے سب سے پہلا نمبر ان مشاعروں میں لیا ہے اور سب سے پہلے کامیابی کا سہرا امرءالقیس کے سر رہا اسی طرح امرءالقیس کے بعد طبقۂ اولے کے مشاہیر شعرا سے عمرو یا ابوعمرو (باختلاف آراے مورخین) ابن عبد ابن سفیان ابن حرملہ الملقب بطرفہ ہے امرءالقیس کے بعد جسکی فصاحت و بلاغت کو تمام فصحاے عرب نے تسلیم کیا وہ یہی ہے اسی کا کلیجہ تھا ورنہ امرءالقیس کے قصیدہ کے مقابل میں خانۂ کعبہ پر شعراء عرب سے کسی کی مجال نہ تھی جو اپنا قصیدہ لٹکا سکتا۔

عمرو ابن عبد بن سفیان بن حرملہ قبیلۂ بکر بن وائل سے تھا اور جریر بن عبدالمسیح الملقب بمتلمس کی بہن کا بیٹا تھا اور بعض مورخین نے اسکی تشریح نسب یوں کی ہے طرفہ بن عبد بن سُفیان بن سعد بن مالک بن ضبیعہ بن قیس بن ثعلبہ بن عکابہ بن صعب بن علی بن بکر بن وائل بن قاسط بن ہنب بن اقصی بن دعمی بن جدیلہ بن اسد بن ربیعہ بن نزار بن معد بن عدنان - مورخ آمدی لکھتا ہے اس نام کے یعنی طرفہ کے چار شخص شعراء عرب سے گذرے ہیں چنانچہ پہلا یہ شخص ہے جسکا ذکر ہم کر رہے ہیں اور دوسرا طرفہ بن اللاؤ بن نضلہ بن منذر بن سلمی بن جندل بن نہشل بن دارم ہے اور تیسرا طرفۃ الخزمی ہے قبیلہ جذیمہ عبسی سے اور چوتھا طرفۃ اخو قبیلہ بن عامر بن ربیعہ سے - میرا خیال ہے کہ اسی نام کے مشارکت کی وجہ سے بعض شارحین دھوکا کھا گئے -

طرفہ کی عمر بعض مورخین ۲۶ - اور بعض بیس سال کی لکھتے ہیں لیکن

البستانی کے نزدیک صحیح روایت ۲۶ کی ہے یہی مورخ لکھتا ہے کہ اتنی سی عمر میں طرفہ نے کمالات شاعری اسقدر حاصل کیے تھے جسکو لوگ طولانی مدتوں میں (عمر کی) بھی نہیں حاصل کر سکتے تھے مورخین کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہجو لکھنے میں اپنی قوم اور دوسری قوموں کی بہت جری اور نڈر تھا اور نہایت تعجب میں ڈالنے والی طبیعت رکھتا تھا۔ ۲۰ یا ۲۶ برس کی عمر میں یہ قتل کیا گیا اور اسکا واقعہ قتل یہ ہے جسکو زوزنی نے مفضل بن محمد بن یعلی الضبی سے معلوم کیا ہے وہ کہتا ہے کہ طرفہ بہت بڑے خانوادہ کا شخص تھا اور بہت بزرگ نسب تھا اور اسکی بہن کا عقد عبد عمرو ابن بشر بن عمرو ابن مرثد بن سعد ابن مالک بن ضبیعہ بن قیس سے ہوا تھا یہ شخص سردار اہل زمانہ سے تھا اور علی بن ہند ملک حیرہ اسکی بہت عزت و بزرگی کرتا تھا ایک دن ہمشیرہ طرفہ نے اپنے شوہر کی شکایت طرفہ سے کی طرفہ نے اپنی بہن کی شکایت پر عبد عمرو کی ہجو کہڈالی اتفاق سے یہ ہجو عمرو بن ہند الملک کے پاس بھی پہنچ گئی ایک روز اتفاقیہ عمرو بن ہند الملک شکار کے قصد سے نکلا اور اسکے ساتھ عبد عمرو تھا ایک چوپایے پر عمرو بن ہند الملک نے ایک تیر مارا اور وہ گرا ملک نے عبد عمرو سے کہا کہ اپنی سواری سے اتر کر اسکو ذبح کر عبد عمرو اترا لیکن ذبح کرنے میں رکا یہ دیکھکر ملک ہنسا اور کہنے لگا کہ کچھ تجھکو خبر بھی ہے گویا تجھکو طرفہ دیکھ دیکھکر تیری ہجو پڑھ رہا ہے جو اس نے تیرے متعلق کہی ہے اسی کے ساتھ ملک نے اسکی ہجو میں وہ شعر بھی ملادیے جو طرفہ نے خود ملک کی ہجو میں کہے تھے جب وہ تمام اشعار پڑھ چکا تو عبد عمرو کی طرف متوجہ ہوا اور کہا کہ کچھ سنا تو نے کہ طرفہ تیرے متعلق کیا کہہ رہا ہے یہ سن کے عبد عمرو نے کہا کہ واہ واہ آپ نے اپنی ہجو بھی میری ہجو میں ملادی کیا آپ انکار کرتے ہیں اس ہجو سے جو طرفہ نے آپ کے متعلق لکھی ہے حالانکہ وہ میری

سلہ یہ مولف دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) ہے۔

ہجو سے زیادہ سخت ہے کچھ ان باتوں کا خاص اثر ایسا ملک پر پڑا کہ اس نے ایک نامہ گورنر بحرین کے نام لکھا جسکا نام معلّٰے اور قبیلہ بنی قیس سے تھا کہ تو طرفہ کو قتل کرڈال لیکن ملک کو اہل دربار نے مشورہ دیا کہ ایسا غضب نہ کرنا کہ تنہا طرفہ کو قتل کرڈالنا ورنہ متلمس اُسکا ماموں ایک تجربہ کار اور مسّن شاعر ہے غضب ہی کی ہجو لکھے گا اور اسکے علاوہ وہ بڑے قبیلہ کا شخص یعنی قبیلہ بنی ضبیعہ سے ہے یہ مشورہ ملک کے بھی سمجھ میں آگیا اور اُس نے عنوان قتل بدلا ایک شخص کو طرفہ اور متلمس کے لینے کو بھیجا جب یہ دونوں آگئے تو اس نے دو خط گورنر بحرین کے نام لکھکر دیے اور اُسمیں لکھا تھا کہ جبتک دونوں تمھارے پاس آئیں تو انھیں قتل کرنا چلتے وقت کچھ ہدایا دیے کہ یہ ہماری طرف سے گورنر بحرین کو دیدینا اور طرفہ اور متلمس کو نہایت اطمینان دلایا کہ جب تم لوگ وہاں جاؤگے تو وہ تمھارا بہت اعزاز و احترام کرے گا اور باکرام و عطایا پیش آئے گا حسب الحکم یہ لوگ روانہ ہوے اور ارض خیرہ پر پہنچ گئے متلمس نے طرفہ سے کہا کہ ملک نے جو ہم کو تم کو خط دیے ہیں گورنر بحرین کے نام اسکے مضمون سے ہم تم واقف نہیں بھئی میں تو مشکوک ہوں اور بڑی غلطی ہے بغیر دیکھے اور سمجھے ہوے گورنر کے پاس جانا طرفہ چونکہ ناتجربہ کار اور کمسن تھا اس لیے اس نے جواب دیا کہ یہ تمھاری بدگمانی ہے جو کچھ ہم سے ملک نے کہا ہے گورنر بحرین وہی ہمارے ساتھ برتاو کرے گا اور اگر اسکے خلاف کریگا تو پلٹ چلیں گے لیکن متلمس کا دل اس بات پر راضی نہیں ہوا اور اس نے اپنے خط کی مُہر توڑ ڈالی تھوڑی دور بڑھکر ایک لڑکا اہل بحرین سے ملا اُس سے متلمس نے پوچھا کہ تم کچھ پڑھنا جانتے ہو اُس نے کہا کہ ہاں متلمس نے کہا کہ اچھا اس خط کو تو پڑھو کہ اسمیں کیا لکھا ہے اس لڑکے نے جسکا نام نجاہ تھا اُس خط کو دیکھکر پوچھا کہ کیا تیرا ہی نام متلمس ہے اس نے جواب دیا کہ ہاں اس لڑکے نے کہا کہ تیرے قتل کا حکم عمرو ابن

ہندالملک کی جانب سے گورنر بحرین کے نام لکھا ہوا ہے یہ سُن کے متلمس نے وہ خط لے کے دریا میں پھینکدیا اور ہجو ملک میں شعر پڑھنے لگا اور طرفہ سے کہا کہ قسم خدا کی یہی حکم تیرے خط میں بھی ہے لیکن طرفہ نے کہا کہ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا یہ حکم صرف تیرے ہی لیے تھا متلمس تو چلا گیا اور طرفہ گورنر بحرین کے پاس پہنچ گیا اور وہ خط گورنر بحرین کو دے ہی دیا گورنر بحرین نے اُس خط کو لے کر طرفہ سے کہا کہ تو ایک بزرگ حسب و خاندان کا شخص ہے اور میرے تیرے درمیان مدتوں سے سلسلہ برادرانہ و قرابت ہے اس خط میں تیرے قتل کا حکم ہے تو چلا جا جلد سے جلد جب تو چلا جائے گا تو میں اس خط کو پڑھوں گا اُسوقت مجھپر تیرے نہ قتل کرنے کا کوئی الزام بھی نہیں عاید ہوگا اور تیری جان بھی بچ جائے گی لیکن جب اسکو پڑھ لوں گا تو مجبور ہوں گا مگر طرفہ نے اسے منظور نہیں کیا یہانتک کہ ایک شخص کے ہاتھوں سے جو بنی قیس سے تھا شراب پلا کر قتل کیا گیا - اور عتبی نے اس کے قتل کی دوسری وجہ لکھی ہے وہ لکھتا ہے ایک دن صحبت شراب گرم تھی عمرو بن ہندالملک کے یہاں اور طرفہ بھی موجود تھا کہ عمرو بن ہندالملک کی بہن اتفاقیہ اسکے پس پشت آگئی اُسکے چہرے کا عکس طرفہ کے جام میں جو پڑا تو طرفہ نے عشق میں ڈوبا ہوا ایک شعر پڑھا جو سوء ادب کی پہلو لیے ہوے تھا اور اسی سبب سے عمرو بن ہندالملک نے اسکو قتل کراڈالا بصورت قتل میں بھی اختلاف ہے جسکو مورخین لکھتے ہیں چنانچہ ایک روایت یہ ہے کہ گورنر بحرین کو جب اس نے ہندالملک کا نامہ دیا ہے تو اُس نے اُس سے دریافت کیا کہ تو جس صورت کو پسند کرے اُسی طرح تجھے قتل کروں طرفہ نے کہا کہ مجھکو شراب پلادے اور جب مخمور ہو جاؤں تو میری ہفت اندام کی فصد کھلوا دے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور بحرین میں دفن کردیا گیا۔

اور البستانی صاحب دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) اسکا سبب قتل یوں لکھتے ہیں کہ ایک روز صحبت ملک میں طرفہ شراب پی کر اسکے سامنے سے اکڑتا ہوا چلا ملک چونکہ بالکل ایک خشک آدمی تھا اور بہت ہیبت و جبروت کا شخص تھا نہ کبھی ہنستا تھا اور نہ مسکراتا تھا اس نے یہ حرکت طرفہ کی بہت بری نظر سے دیکھی اور قریب تھا کہ نکلوا دے نکلوایا تو نہیں لیکن اس بدتہذیبی کا اثر ضرور لیا - اور بعض نے لکھا ہے کہ نہیں اس وجہ سے اسکو غصہ آگیا کہ ملک کی بہن طرفہ کے پس پشت تھی اُسکو دیکھکر طرفہ نے خلاف شان شعر پڑھا اور یہی موجب قتل ہوا اور البستانی لکھتا ہے کہ ملک نے گورنر بحرین و عمان کو لکھا کہ جسوقت یہ خط تم کو ملے اور یہ لوگ پہنچیں تو ان کے دست و پا قطع کر کے زندہ دفن کر دینا تو متلمس تو راستے ہی سے چلا گیا لیکن طرفہ اسی طرح سے قتل کیا گیا کہ دست و پا قطع کر کے زندہ دفن کر دیا گیا -

اور بعضوں نے لکھا ہے کہ گورنر بحرین و عمان اُس زمانے میں ربیعہ ابن الحرث تھا اور چونکہ طرفہ اُسکی بھانجی کا رشتہ میں لڑکا ہوتا تھا اس وجہ سے اُس نے اسکے قتل سے انکار کر دیا تو عمرو بن ہند الملک نے ایک شخص کو تغلب سے بھیجا کہ وہ جا کر طرفہ اور گورنر بحرین دونوں کو قتل کرے چنانچہ ایسا ہی ہوا -

افسوس ہے طرفہ کے قتل ہونے پر اسمیں شک نہیں کہ طرفہ اپنے عہد کے اکمل افراد سے تھا زمانہ ایسے فردوں کو مٹا کے ہر چند کہ ان کی نظیریں پیدا نہیں کر سکتا لیکن پھر کچھ نہیں محسوس کرتا - میرے خیال میں جمال الدین عرفی اور طرفہ یہ دونوں شاعر دنیا میں ایسے گذرے ہیں کہ جن کے اس کمسنی میں کمالات اس پایہ پر پہنچ گئے تھے کہ دنیا اور دنیا والے اُن وصفوں کے حاصل کرنے میں تھک تھک کر رہ گئے انکے کمالات بلکہ خرق عادات شاعری جریدۂ عالم پر ابدالآباد تک زبردست حرفوں سے کندہ رہے گی اور آنے والی دنیا ہمیشہ ایک نیا عبرت کا سبق حاصل کرتی رہے گی عرفی

ستائیس برس کی عمر میں شاہزادہ سلیم کی غلط فہمیوں سے قتل کیا گیا لیکن زندگی میں بھی خدائے سخن تھا اور مرکے بھی خدائے سخن رہا زمین فارس کا کلیجہ ابھی تک عرفی کے غم میں شق ہے اور رہے گا۔ اور طرفہ کو ملک نے چھبیس برس کی عمر میں یا بیس برس کی عمر میں قتل کرا یا لیکن باوجود اس کمسنی کے اسوقت تک اہل لغت اُسکے دیوان سے استشہاد وسندیں پیش کرتے ہیں۔ چونکہ مضمون طولانی ہوگیا ہے اسوجہ سے میں اسکے قصیدے کی تنقید کو افسوس کے ساتھ ترک کرتا ہوں صرف اسکے قصیدے کا ایک مطلع ناظرین "تمدن" کی دلچسپی کے لیے پیش کرتا ہوں یہ قصیدہ بحر طویل میں ہے قافیہ متدارک ہے ایکسو چھ یا ایکسوسات شعر کا قصیدہ ہے اور اسکی تشبیب عشق ہرہ اور خولہ اور ہند اور سلمی میں ہے اور کبھی خولہ کو حنظلہ سے بھی خطاب کیا ہے قبیلہ کی طرف منسوب کر کے۔ اس قصیدے میں طرفہ نے اپنے گذرے ہوئے افسانوں پر بھی روشنی ڈالی ہے اور شرابخواری اور حسن پرستی اور مغنیہ عورتوں کے ساتھ عشق ومحبت پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔

لخولة اطلال ببرقة ثهمد تلوح کباقی الوشم فی ظاهر الید

یعنی خولہ کے نشان مکان اُس زمین پر ہیں جہاں کی خاک سنگریزوں اور پتھر سے مخلوط ہے اور وہ جگہ موضع ثہمد میں واقع ہے اور وہ نشان مثل اُس باقی ماندہ گودنے کے ہیں جو پشت دست پر محبوبوں کے چمکتا ہے اس ایک تشبیہ کی نزاکت یہ پتہ دیگی سخن سنج ارباب نظر کو کہ ہم کس بیچین دل ودماغ کی ندرت تخیل کا ثمر ہیں طرفہ کی اس تخیل سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ گدنا گدوانا عرب کی عورتوں کا پرانا وصف اور قدیم رواج ہے لیکن ہمارے ہندوستان میں یہ رسم طبقہ اہل ہنود سے مخصوص سمجھی جاتی ہے۔ (باقی آئندہ)

آشفتہ لکھنوی

مسلمانوں کے پہلی صدی کے طبی کارنامے

(بسلسلۂ اشاعت سابق)

خالد کے مسند نشین نہونے کے متعلق مشہور ہے اور قرین قیاس بھی ہے کہ اسی علمی انہماک کی وجہ سے معاویہ بن یزید خلیفہ قرار پایا اور خالد بن یزید مسند خلافت سے محروم[1] رہا۔

خالد کے لیے یزید ہی کے عہد حکومت میں دوسری اقوام کے علوم عربی میں نقل ہونے شروع ہو گئے چنانچہ رومی زبان سے طبی اور کیمیاوی کتابیں عربی میں نقل کرنے کے لیے حکیم اسیفانوس کو ملازم رکھا گیا مگر افسوس اسکی ترجمہ کتابیں آج پردۂ عالم میں ہیں ع دیدی کہ چہ کردست بما چرخ جفاجو

مروان بھی علم دوستی کا دامن اپنے ہاتھ سے نچھوڑ سکا اگرچہ اسکے عہد میں ایک طرف خون کا دریا بہتا تھا تو دوسری طرف علم کا بھی اسکے پائے تخت سے نکل کر دنیا میں بہا۔ تیاذوق مروان ہی کے زمانے کا طبیب ہے جسکے بہت سے شاگرد بنی عباس کے وقت میں آسمان طب کے چاند اور سورج بن کر چمکے۔ فرات بن شحنا تا طبیب عیسٰے بن موسیٰ اسی کے شاگرد تھے۔ تیاذوق حجاج بن یوسف ثقفی کے خاص اطبا میں سے تھا حکیم ماسرجیس (یا ماسرجویہ) اسرائیلی بھی مروانی اطبا میں سے تھا حکیم ماسرجویہ محض ایک طبیب یا حکیم نہ تھا بلکہ ایک کامل ادیب اور اچھا مؤرخ بھی تھا۔ یہ حکیم اسلامی اطبا سے پہلا طبیب ہے جس نے فن طب میں چند کتابیں بھی تالیف کیں اسکی ایک کتاب قوی الاطعمہ و منافعہا و مضارہا ہے اس کتاب میں انسان کی روزانہ خوراک اور اسکے تاثیرات سے بحث کی ہے دوسری کتاب قوی العقاقیر و منافعہا و مضارہا ہے۔ مگر افسوس کہ یہ دونوں کتابیں معدوم

[1] جورجی زیدان اڈیٹر الہلال مصر نے اپنی کتاب آداب اللغۃ العربیہ میں یہاں ایک عجب غلط بیانی سے کام لیا ہے لکھتا ہے کہ جب خالد نے تمام کوششوں کے بعد یہ دیکھا کہ اب میں کسی مسند خلافت نہیں پاسکتا تو علوم کی طرف متوجہ ہو گیا۔ یہ ہیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔

ہو چکی ہیں، تیسری کتاب کا نام کناش (مخزن الادویہ) ہے سنہ ۹۹ھ میں یہ کتاب کسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو ملی، چالیس روز تک اپنے مصلے کے تلے رہنے دیا، جب ان کو معلوم ہو گیا کہ یہ کتاب حقیقتاً مفید ہے تو منظر عام پر لاکر اسے شائع کر دیا۔ بعض مورخین کو دھوکا ہوا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ یہ حکیم خود خلیفہ خامس یعنی حضرت عمر بن عبدالعزیز کے وقت کا تھا۔[1]

فرات بن سخیا تا یہودی بھی مروانی طبیب تھا، حجاج بن یوسف ثقفی کے خاص اطباء سے تھا آخری عمر میں طبیب عیسےٰ بن موسیٰ کی ملازمت کرلی جو بنی عباس کا ایک مشہور طبیب تھا اور اُسکا اُستاد بھائی۔

جب عبدالملک بن مروان کا زمانہ آتا ہے تو ایک طرف مروانی اطباء کی صورت نظر آتی ہے اور دوسری طرف ہم دوا اور طبیبوں کو عزت و احترام کی مسند پر ان کے دوش بدوش بیٹھا پاتے ہیں تو ذوکس اور تو ذون عبدالملک ابن مروان کے خاص اطبا تھے۔

اگرچہ ولید بن عبدالملک کے دربار میں کسی مشہور طبیب کا داخلہ ہوا مگر پھر بھی ہم اسے سب کی خدمت سے کنارہ کش نہیں پاتے۔ ولید مسلمانوں کا پہلا بادشاہ ہے جس نے ایک عظیم الشان شفاخانہ بنوایا جس میں مریضوں کے ہر قسم کے آرام کا خیال رکھا گیا تھا۔

پہلی صدی کے آخری بادشاہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے باوجودیکہ آپ نے

---

[1] عمر بن عبدالعزیز نے چالیس روز تک اپنے مصلے کے تلے رکھا تاکہ دیکھ بھال لیں کہ کہیں کسی اناڑی کی تالیف تو نہیں ہے اسکو جرجی زیدان یوں بیان کرتا ہے کہ بہتوں نے اس کتاب کے شائع ہونے پر زور دیا مگر پھر بھی وہ چالیس روز تک استخارہ دیکھتے رہے آخر کار (مجبوراً) شائع کرنا پڑی۔ تعجب ہے کہ معزز مؤرخ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ مدت استخارہ صرف تین دن ہے۔

صرف دو برس پانچ مہینہ خلافت کی اور تمام عمر علوم دینیہ کی تحصیل اور مدون کرانے میں گذری مگر پھر بھی خدمت طب سے دست کش نہو سکے کناش تیا ذوق کے آپ نے کئی نسخے نقل کرائے اور مسلمانوں میں تقسیم کرا دیے۔ اس طرح سے وہ کتاب مدت تک محفوظ رہی اب لا پتہ ہے۔

اگرچہ آپ کے دربار میں کسی طبیب کا داخلہ نہوا مگر خلافت سے پہلے آپ ایک بہترین کام انجام دیچکے تھے یعنی جس زمانے میں آپ اپنے والد کے ساتھ اسکندریہ میں تھے آپ نے حکیم عبد الملک بن ابحر کنانی کو جو دار العلوم اسکندریہ میں علوم عقلیہ کا پروفیسر تھا مسلمان کر کے حکماے اسلام کے رشتہ میں منسلک کر دیا۔

حکیم یحییٰ نحوی۔ حکیم اویطرادس۔ حکیم ار بیاسوس وغیرہ اسی پہلی صدی کے جواہر ہیں مگر ہم نے انکا ذکر اس لیے چھوڑ دیا کہ ان میں کوئی نہ مسلمان تھا نہ سلطنت اسلامیہ سے تعلق رکھتا تھا۔ حضرت عمرو بن عاص فاتح مصر یحییٰ نحوی سے غالباً اسی لیے بہت ملتے جلتے تھے کہ وہ ایک فن کا استاد تھا۔

یہ دیکھنے کے بعد کہ حضرت رسول صلعم کے بعد سے سنہ لینی پہلی صدی کے آخری بادشاہ خلیفہ عمر بن عبد العزیز کے عہد تک کوئی زمانہ ایسا نہ گذرا جسمیں مسلمانوں نے علم کی خدمت انجام نہ دی ہو اسی سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کا دامن علوم و فنون کے جواہرات سے ہمیشہ بھرا ہوا رہا۔ مگر رونا اب یہ ہے کہ ہم نے غیر اقوام کے علوم سے فائدہ اٹھانا شرک عظیم سمجھ لیا ہے ؎

ہماری خانہ بربادی کا باعث ایک یہ بھی ہے
کہ ہم نے پھول کے پتے ہوا میں سب اڑا دیے

جلال ندوی

ابوالفیض فیضی

(بسلسلۂ اشاعت سابق)

فیضی جب اکبر کے دربار میں باریاب ہوا۔ تو اُسوقت ایک قصیدہ پڑھا جس سے اسکے فضل وکمال اور اسکے شاعرانہ تفوق کا پورا پتہ چلتا ہے۔ کمال شاعری کے ساتھ اس میں فلسفہ وحکمت کی نشانیاں بھی موجود ہیں۔ تقریباً دوسو شعر کا قصیدہ ہے۔ شاہی دربار میں جاتے ہوے رستے ہی میں کہتا گیا تھا۔ پے بہ پے آنے والے مصائب کے اثر سے وہ بھرا تھا۔ اسلیے اسمیں اپنی تمام مصیبتوں اور تکلیفوں کا اظہار بھی کیا ہے۔ بادشاہی سواروں کے آنے پر گھر میں جو پریشانی اور گھبراہٹ پیدا ہوی، اور خود اسکی طبیعت کو جو اضطراب ہوا تھا قصیدہ میں یہ تمام باتیں نہایت لطف بیان اور حسن ادا سے بیان کی ہیں الفاظ کی پاکیزگی، بندش کی چستی، خیالات کی بلند پروازی، طرز ادا کی جدت، زبان کی سلاست یہی چیزیں ایوان قصیدہ کے نقش و نگار ہیں۔ ارباب ذوق خود اسکا فیصلہ کرسکتے ہیں کہ فیضی ان باتوں میں کہانتک کامیاب ہوا ہے، اتنے بڑے قصیدے میں ترکیب اور محاورات اہل زبان کے تتبع سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹا۔ میں یہاں اس قصیدے کے جستہ جستہ مقامات سے اشعار نقل کردیتا ہوں۔

مطلع

سحر نوید رسان قاصد سلیمانی — رسید ہمچو سعادت کشادہ پیشانی
مبشران سعادت نداکنان کہ بخوان — نجات نامۂ خود اے حزین زندانی
مرا نظارہ اش از دور بیقراری داد — چہ بے قراری باصد قرار ارزانی
شدم سوار شبک گام توسنے چالاک — کہ کردے از سر دانش سپہر جولانی

خبر بہ بارگہ شہریار شد کا ینک | رسید بر در فردوس مرغ بستانی
فروغ بخش شبستان ہند اکبر شاہ | چراغ بارگہ دولت تمر خانی
خطاب شد کہ تلطف کناں رسانندش | بہ آسمانِ سعادت زتیہ ظلمانی
نخست بوسہ زدم خاک آستان یعنے | بہ چشمہ سار رساندم شفاہ عطشانی

ایک جگہ پر اپنی پریشانی اور مصیبت کا اظہار کرتا ہے' موقع موقع سے اپنے دشمنوں اور حاسدوں کے خرمن رشک وحسد میں آگ بھی لگاتا جاتا ہے۔

ازاں زماں چہ نویسم کہ بود بے آرام | سفینۂ کرم از موج خیز طوفانی
گہے چو وہم سراسیمہ کز کدام دلیل | برم ظنون وشکوک از علوم ایقانی
چرا بود متخالف رسوم اسلامی | چرا بود متشابہ بہ حروف فرقانی
زباں کشیدہ بدار القضائے عجب وریا | شہود کذب زدعوئے گران ایمانی
اگر حقیقتِ اسلام در جہاں اینست | ہزار خندۂ کفرست بر مسلمانی

تھوڑے ہی دنوں میں فیضی نے اپنی ظرافت طبع، شگفتہ مزاجی اور خوش بیانی کے باعث اکبر کے دل میں گھر کر لیا۔ یہاں تک کہ سفر اور حضر کسی حال میں بھی اکبر کو اسکی علیحدگی گوارا نہ تھی۔ کچھ دن گذرے کہ شیخ ابو الفضل بھی دربار میں بلائے گئے۔ ان دونوں بھائیوں نے اپنا رسوخ اتنا بڑھا لیا کہ امور سلطنت میں سے کوئی کام انکے مشورے بغیر انجام نہ پاتا تھا۔ رفتہ رفتہ ابو الفضل کو جو رتبہ دربار اکبری میں ملا وہ سب کو معلوم ہے۔ فیضی نے کوئی ملکی ومالی خدمت اگرچہ اپنے ذمہ نہ لی۔ کشور معانی کی تاجداری کو ان ظاہری جاہ ومناصب پر ترجیح دی۔ مگر پھر بھی یہ حالت تھی کہ مہمات سلطنت کے جزوی جزوی مسئلے اسکی رائے پر موقوف رہا کرتے تھے

(باقی آیندہ)

تیمور خان

سب

ابو الحسنات ندوی اشرفپوری

غزلیات

حضرت محشر لکھنوی

سکوں ہوتا تھا فرقت میں جو تیرا نام آتا تھا
نہ ہنسنا کام آتا تھا نہ رونا کام آتا تھا

ہمیں اس چھیڑ نے چارہ گری کی اور بھی مارا
کہ تشخیص مرض کے وقت تیرا نام آتا تھا

ٹپا ٹپ اشک یوں گرتے تھے تار سبحہ ٹوٹے
کسی بیمار غم کو جب خیال شام آتا تھا

شب فرقت کی باتیں جو ملیں کہنا ہی مناسب ہے
نہ پوچھو کون سے پہلو ہمیں آرام آتا تھا

دل عشاق کی قدر انکو کیا جو دل نہ رکھتے ہوں
وہ ناکارہ سہی پھر بھی ہمارے کام آتا تھا

کسی ہمدرد سے رمز وفا کہیے تو کیا کہیے
زبان پر پیشتر سب کے تمہارا نام آتا تھا

جفائے دوست کی ایذا یہ خاموشی ہی بہتر تھی
مری فریاد سے میرے ہی سر الزام آتا تھا

نثار اس شوق کے چھا جائے جس سے مردنی منہ پر
ہو جب سوکھ لیتا تھا تو مجھ تک جام آتا تھا

در و دیوار پر تاثیر سے بن جاتی تھیں شکلیں
فغاں کرتا جدھر سے آپ کا بدنام آتا تھا

کھڑے ہیں دم بخود یہ پوچھنے کو حشر میں محشر
وہ گھڑیاں کتنی تھیں جب عشق میں آرام آتا تھا

حضرت صفی لکھنوی

ستم کش آپ کے اس ڈر سے زہر کھا نہ سکے
یہی کہے گا زمانہ کہ ناز اُٹھا نہ سکے

کھلا دام کے جوہر نہ جاں نثاروں کے
وہ تیغ فرط نزاکت سے آزما نہ سکے

خموش بیٹھ جہاں بیٹھ مثل نقش قدم
کہ تجھکو تیری جگہ سے کوئی اُٹھا نہ سکے

فرو ہوئی نہ حرارت جگر کی رونے سے
لگی ہے آگ کچھ ایسی کہ ہم بجھا نہ سکے

نکل ہی جائے گا خاطر سے رفتہ رفتہ ملال
ترا نشیاں نہیں ہے جو دل سے جا نہ سکے

گناہگار جلیں آتش جہنم میں — اگرچہ دامن رحمت پر آنچ آ نہ سکے
یہ خفتگان لحد کس بلا کی نیندیں ہیں — تمھیں پکار کے ہم تھک گئے جگا نہ سکے
یقین ہے ترے کشتوں کی بیقراری سے — زمین بھی تہِ دامن اُنھیں چھپا نہ سکے
ہنسی میں بات اُڑا دینگے سب یہ سوچ کے ہم — فسانۂ گل و بلبل اُنھیں سُنا نہ سکے
ستم کشان حوادث کا دل دُکھائیے کیوں — ستائیں آپ اگر آسماں ستا نہ سکے
اگرچہ میرا مٹانا ہی تم کو ہے منظور — تو یوں مٹاؤ کہ پھر آسماں مٹا نہ سکے
اُبل پڑے مری آنکھوں سے بنکے گرم آنسو — وہ آبلے جو دل تنگ میں سما نہ سکے

صفی وہ اب تو خوشامد سے بھی بگڑتے ہیں
غرض یہ ہے کہ جو روٹھیں کوئی منا نہ سکے

حضرت مرزا ثاقب قزلباش لکھنوی

دل کو تاکید وفا ہے کہ فنا ہو جانا — درد کو حکم قضا ہے کہ دوا ہو جانا
تہنیت موت کو دیتا ہے مرے دل کا مرض — عید ہے ماتم حسرت کا بپا ہو جانا
جب تہِ خاک بھی ڈھونڈھے نہ ملا میں تو کہا — مرنے والے اسے کہتے ہیں فنا ہو جانا
عادت شانہ کشی زلف گرہ گیر میں ہے — فرض ہے روز اسیروں پہ جفا ہو جانا
طشت از بام ہوا راز وفا غم یہ ہے — ورنہ کچھ شاق نہ تھا سر کا جدا ہو جانا
حیلۂ صبر ہے آسان جو تمھیں یاد رہے — ہم کو دم توڑتے دیکھو تو خفا ہو جانا
شمع ساں منتظر صبح نہ رہنا اے دل — شب فرقت کو دعا دے کے فنا ہو جانا
کیا قفس میں کوئی در ہے یہ بتا اے صبا — کس سے پوچھوں کسے کہتے ہیں رہا ہو جانا
پھول کو توڑ کے دیکھو اثر وصل و فراق — موت ہے چاہنے والوں سے جدا ہو جانا
خاک بھی اس دل سوزاں کی ملیگی نہ کہیں — مجھے معلوم ہے شعلے کا ہوا ہو جانا
آؤ نظارۂ عبرت کو یہاں کچھ نہ سہی — کیا برا ہوگا مزاروں کا بھلا ہو جانا

کس دورا ہے میں کھڑا ہوں متحیر کی طرح
کہ بقا ہے مجھے ممکن نہ فنا ہو جانا

آئے ہو گور غریباں پہ تو باتیں نہ کرو
ذرّے کچھ کہتے ہیں خاموش ذرا ہو جانا

کچھ نہ کچھ ہو ہی گیا عشق میں اے موت مگر
میں نے چاہا تھا کچھ اس سے بھی سوا ہو جانا

جیتے جی آئے قیامت تو مزا ہے ثاقب
دیکھ لیں وعدۂ فردا کا وفا ہو جانا

جناب چندی پرشاد صاحب شیدا دہلوی

دکھائے انداز گر نرالے کرشمہ اس چشم سرمگیں کا
بنا ہے خورشید روز محشر فلک پہ نافہ غزال چیں کا

نشانِ سجدہ ہے نقشِ ہستی ورق بنا چرخ ہفتمیں کا
بلندیوں پر ہے خاکساری بنا فلک ہے مری زمیں کا

دکھا وہ اعجاز تیغ قاتل شفق میں ہو چاند چودھویں کا
گرے ہمارے لہو کی چادر بنے دوپٹہ کسی حسیں کا

جنوں نے بے عیب کر دیا ہی چھٹے ہیں قید لباس سے ہم
نہ کچھ گریباں کا ہے ٹھکانا پتہ نہ کوسوں ہے آستیں کا

عتاب کی دلربا ادائیں لباس سے جلوہ گر ہوئی ہیں
جبیں سے مانگے کی چین لیکر دماغ بہکا ہے آستیں کا

مجھے یہ ڈر ہے کہ ہو نہ ظاہر یہ خونِ ناحق بروز محشر
اڑا لیا ہے شفق نے کچھ رنگ آج قاتل کی آستیں کا

اشارہ ترچھی نظر کا پا کر کھنچے ہیں خنجر چڑھے ہیں تیور
مزاج بگڑا ہے کچھ جبیں کا دماغ بہکا ہے آستیں کا

کہیں ہے فانوس شمع روشن نیام تیغ قضا کہیں ہے
کھلے گا محشر کے دن ہمہ عجیب ہے راز آستیں کا

بنی ہے دشمن یہ خاکساری کہ ہو رہے ہیں رقیب پیدا
بنا رہا ہے کسی کے در کو نشان سجدہ مری جبیں کا

یہ رنگ لائی ہے خاکساری فلک بنی عاجزی ہماری
جھکی ہے تسلیم کو جو گردن بلند رتبہ ہوا جبیں کا

ہوے ہیں دو چاند عید قرباں چلے گی گردن پہ تیغ دہری
لگے ہیں دو دو ہلال جس میں عجیب فلک ہے تری جبیں کا

ہزار کو ایک کر دکھانا یہی ہے کثرت سے عین وحدت
کہ رشتۂ حق ہے گردنوں میں بنا ہے زنار الف جبیں کا

نگاہ صیاد کے ہیں عاشق خبر وطن کی نہ ہوش اپنا
بنا لیا آشیاں ہے ہم نے شجر کہیں کا چمن کہیں کا

خیال جانان جو دل میں آیا گماں کا شاہیں فلک پہ پہنچا
وہ بار الفت گراں بہا ہے جھکا ہے پلہ مرے یقیں کا

یہ کسکے عارض ہیں نور افشاں بنے ہوے ہیں چکور ارماں
چمک رہا ہے وہ داغ ہجراں کہ ماند ہے چاند چودھویں کا

سنے صفا حور و غلماں ہر اک جگہ خوبرونکا ساماں
بنا دیا جسکو باغ رضواں ہے ایک اجڑا چمن یہیں کا

مزا دکھاتی ہے ہر طرح کا مے مصفائے نظم شیدا
کہیں کہیں ہے شراب رنگیں کہیں کہیں جام انگبیں کا

حضرت باسط بسوانی

کچھ غرض کعبہ سے ہمکو ہے نہ بتخانے سے کام
وہ کہیں مل جائے ہم کو اسکے مل جانے سے کام

خوبرویوں کو ہے مطلب شمع بزم افروز سے
دل جلوں کو رات بھر رہتا ہے پروانے سے کام

اے جنوں تیری بدولت خوب ہوتی ہے بسر
دل کو ویرانے کی خواہش مجھکو ویرانے سے کام

جاکے کہدے کوئی صیاد اجل سے اتنی بات
منتظر وہ ہیں ترے جنکو ہے مرجانے سے کام

سُنکے ناصح کی نصیحت میں نے یوں ہنسکر کہا
تمکو سودائی سے مطلب تمکو دیوانے سے کام

مجھکو اُنکے جھوٹے وعدے مان لینے سے غرض
پھر وہ آئیں یا نہ آئیں دل کے بہلانے سے کام

چشم میگوں دیکھکر ساقی کی باسط نے کہا
اب غرض ساغر سے باقی ہے نہ پیمانے سے کام

کچھ اپنے متعلق

بعض صاحبان "تمدن" کو ہرماہ کی ابتدائی تاریخوں میں دیکھنے کے شائق تھے چنانچہ ہم نے اسوجہ سے "تمدن" کو بجائے ۱۰ تاریخ کو شائع کرنے کے ہرماہ کی یکم کو شائع کرنے کا انتظام کرلیا ہے چنانچہ مارچ کا پرچہ یکم مارچ کو شائع ہو رہا ہے ہم نے ناظرین "تمدن" کی ہر خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ گذشتہ چھ ماہ کی سخت کوشش کے بعد ہم یہ کہنے کے قابل ہو گئے ہیں کہ اب "تمدن" نے ملک کے دو تین گنے چنے بہترین پرچوں کی فہرست میں ایک ممتاز جگہ حاصل کرلی ہے۔ "تمدن" کے ناظرین کی تمام خواہشات میں سے غالباً صرف ایک باقی رہ گئی ہے (یعنی تصویریں شائع کرنے کی خواہش) جسکو ہم اسوقت تک پورا نہیں کرسکتے جبتک ناظرین "تمدن" "تمدن" کی توسیع اشاعت میں کوشش نہ فرمائیں اور "تمدن" کا ہر ناظر کم از کم ایک خریدار ہم نہ پہنچا ئے۔

بعض حضرات دو دو تین تین ماہ بعد پرچہ نہ پہنچنے کی شکایت کرتے ہیں۔ یہ ہم خوب جانتے ہیں کہ اسمیں ہمارا ذاتی قصور کہانتک ہے۔ بہرحال اگر ڈاکخانہ کے قصور کی سزا ہمیں کو ملنی چاہیے تو ہم اسکی تلافی صرف اس صورت میں کرسکتے ہیں کہ پرچہ شائع ہونے کے دس یوم بعد تک یعنی ہرماہ کی دس تاریخ تک ہم کو پرچہ نہ پہنچنے کی اطلاع مل جائے ورنہ ہم دوبارہ پرچہ روانہ کرنے سے معذور ہیں۔

عصمت ایجنسی کی کتابیں

ن - پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب ایم - اے مصنف خواب ہستی کا یہ لاجواب و نتیجہ خیز ناول اور تمدن
کی پہلی کتاب جس کا عرصہ سے ملک کو انتظار تھا تیار ہو گئی ہے - یہ کتاب جو حقیقت حسن و محبت کی
تصویر ہے قابل مصنف نے خصوصیت سے نوجوان طلباء کے واسطے لکھی ہے اور مختلف مضامین پر اس
سے بحث کی ہے کہ بیاختہ داد دینی پڑتی ہے یاسمین جو اس تمام قصہ کی جان ہے اور ایک
مشہور عورت ہے اوسکی زندگی کا ہر ورق فلسفۂ حیات کے پیچیدہ مسئلہ کو نہایت خوبی سے حل کرتا
ابل مصنف کا اسم گرامی کتاب کے لاجواب ہونے کی کافی ضمانت ہے قیمت ایک روپیہ (عہ)

ت زمانی - مولوی سید احمد صاحب کی یہ بیش بہا تصنیف جو علاوہ دلچسپ ہونے کے
بت سود مند کتاب ہے مصنف نے از سر نو ترمیم کے بعد نہایت محنت سے تیار کی گئی ہے بیگماتی
قلعہ معلی کے محاورے قصہ کی دلچسپی مختصر یہ کہ کتاب بغیر ختم کئے چھوڑنے کو جی نہیں
قیمت - ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصول ڈاک -

سز بیگم یہ وہ کتاب ہے جو ڈھونڈے سے نہیں ملتی تھی اور اسے عصمت ایجنسی نے نہایت
محنت و صرف سے تیار کی ہے - قصہ کی دلآویزی زبان کی سلاست
سے تعلق رکھتی ہے قابل مصنف مولوی سید احمد صاحب کا نام ہی اسکی خوبیوں کی کافی
ت ہے قیمت فی جلد ۸ علاوہ محصول ڈاک وغیرہ -

سہ کتب - عصمت و تمدن ایجنسی دہلی سے طلب کریں

مہریں اور مہرکنی کا مشہور و معروف کارخانہ

اس کارخانہ میں بڑی کی مہریں اور ہر قسم کی
مہریں نہایت عمدہ اور خوبصورت تیار کی جاتی

ہندوستان کی ہر زبان میں اس کارخانہ کو مشاقی حاصل ہے مونوگرام اور دستخط بالکل اصلی صورت پر
خوبی یہ ہے کہ مہر کی عبارت نہایت عمدہ اور مضبوطی میں بے نظیر علاوہ بڑی کی مہر کے سونا چاندی پیتل لوہا پتھر وغیرہ
ہر قسم کی چیزیں تیار کی جاتی ہیں ہر قسم کے بلاک طغری - دستخط حسب خواہش بازاری نرخ سے کم قیمت پر تیار کئے جاتے
وہ اسکے کارخانہ میں چھوٹے حروفوں کے بکس بھی مل سکتے ہیں اور ملز فیکٹری اور سرکاری دفاتر کی صد سندیں اس کارخانہ
ہیں نوٹ: عقیق کی مہر کی قیمت ایک نام کی معہ چاندی کی انگوٹھی کے اعلیٰ درجہ کی ۲ روپے معمولی عہ

احمد بیگ مہرکن و ربڑ اسٹامپ میکر چاندنی چوک دہلی